ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور

قیمت سالانہ چھ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

رسائل و مسائل

از

سید ابو الاعلیٰ مودودی

یہ کتاب مولانا مودودی کے ان مضامین پر مشتمل ہے جو ترجمان القرآن میں اسی عنوان کے تحت وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ چونکہ اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے اور اس میں انسانی زندگی کے تمام شعبوں کے مسائل کا حل موجود ہے اس وجہ سے ان مضامین پر مولانا نے ہر طرح کے سوالات قرآن و حدیث کی روشنی میں نہایت مدلل اور مفصل طریق پر دیئے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ کتاب مسلمانوں کے تمام مکاتیب خیال کے لوگوں کے لئے جاذبیت کی حامل ہوگی۔

جلد شائع ہو رہی ہے

موضوعات مندرجہ ذیل ہیں

تفسیر آیات و تاویل احادیث	(۱٦)	مسائل کے جوابات
فقہی مسائل	(۴۴)	,,
خلافیات	(۱۵)	,,
عام مسائل	(۷)	,,
معاشی مسائل	(۱۵)	,,
سیاسی مسائل	(۱۰)	,,

ملنے کا پتہ

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان

اچھرہ۔ لاہور

فہرست مضامین

جلد نمبر ۲۶	ربیع الاول، ربیع الثانی، جمادی الاول، جمادی الثانی ۱۳۶۴ھ مطابق مارچ، اپریل، مئی، جون ۱۹۴۵ء	عدد ۳،۴،۵،۶

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر وپبلشر نے مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ ترجمان القرآن پٹھانکوٹ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

ادھر ایک عرصہ سے، یکے بعد دیگرے، ایسی باتیں سامنے آتی رہی ہیں جن سے یہ اندازہ کرنے کا موقع ملا کہ تقویٰ کا لفظ اپنے جن متعلقات و لوازم کے ساتھ آج بولا جاتا ہے یہ متعلقات و لوازم اس کے اصلی اور ابتدائی یعنی قرآنی نہیں ہیں لیکن اب عام ذہنوں پر ان مفہوموں کا ایسا غلبہ ہے کہ ان سے مجرد کر کے اس لفظ کو اس کے اصلی مفہوم میں استعمال کرنا آسان کام نہیں رہا۔ بظاہر تو یہ صرف ایک لفظ سے متعلق غلط فہمی کا معاملہ ہے جو چنداں قابل اہتمام نہیں معلوم ہوتا لیکن حقیقت کے اعتبار سے یہ مسئلہ نہایت اہم ہے۔ تقویٰ تمام شریعت کی غایت، وحی و تنزیل کا مقصود، اور حضرات انبیائے کرام کی ساری دعوت و تلقین کا محور و مرکز ہے۔ اس وجہ سے اس کے متعلق کوئی معمولی غلط فہمی بھی بہت سی غلط فہمیوں کا دروازہ کھول سکتی ہے۔ اس کے متعلق ہمارے تصور کے غلط ہونے کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ سارے دین کے متعلق ہمارا زاویۂ نگاہ اور ہمارے سارے اعمال دینی کا نشانہ ہی غلط ہو جائے۔ اس وجہ سے نہایت سخت ضرورت ہے کہ کتاب و سنت میں یہ لفظ جس مفہوم کے لیے استعمال ہوا ہے اس کو واضح کیا جائے اور جو مفاہیم اس کے ساتھ، مختلف جماعتوں نے اپنے ماحول کی روایات سے اخذ کر کے لگا دیے ہیں، ان کو دور کیا جائے۔ اس کوشش کا ایک بڑا فائدہ تو یہ ہوگا کہ جو چیز تمام دینداری کے اندر بمنزلۂ روح ہے وہ ہمارے سامنے آجائے گی اور ہر طالب حق اس کے لیے بغیر کسی اشتباہ اور تردد کے جد و جہد کر سکے گا۔ دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ تقویٰ کی ناپ تول کے جو پیمانے آج رائج ہیں اور جن کے اختلاف کی وجہ سے خود تقویٰ کی ہئیتیں اور صورتیں مختلف ہو گئی ہیں کالعدم ہو جائیں گے اور کتاب و سنت کا وہ پیمانہ ہمارے سامنے آجائے گا جو ہر چیز کے ناپنے اور تولنے کا اصلی پیمانہ ہے۔

آج جن مواقع پر تقویٰ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے اور جن لوگوں کو متقی سمجھا جاتا ہے اگر تجزیہ کر کے ان کا قدر مشترک نکالا جائے تو تقویٰ کے متعلق چند چیزیں لازماً سامنے آتی ہیں مثلاً یہ کہ یہ ایک ایسا درجہ ہے جس کے لیے اتباع شریعت اور حفاظت حدود الٰہی کی عام جد و جہد کے سوا کچھ اور مطلوب ہے۔ اور یہ "کچھ اور" اس قدر اہمیت رکھتا ہے کہ اس کے آگے خود شریعت کے فرائض و حدود اور ان کے قیام و حفاظت کی ذمہ داریاں بہت ہلکی ہو گئی ہیں۔ چنانچہ آپ کو بہت سے ایسے لوگ بھی ملیں گے جن کی ساری ذہنی و عملی قوتیں ایسے کاموں پر صرف ہو رہی ہیں جو نہ صرف یہ کہ اللہ اور اس کے رسول کی شریعت کی نظر میں کوئی قیمت نہیں رکھتے بلکہ ان کاموں کی کامیابی اور ترقی اللہ اور اس کے رسول کے دین کی پستی اور بربادی کے ہم معنی ہے لیکن اس کے باوجود ان کے تقویٰ میں کوئی فرق نہیں آتا اور وہ اپنے "کچھ اور" کی بدولت بدستور نہ صرف متقی بنے ہوئے ہیں بلکہ برابر تقویٰ کے مدارج و مقامات میں ترقی کر رہے ہیں۔

اسی طرح تقویٰ کے لوازم میں سے یہ بات بھی سمجھی جاتی ہے کہ اس کا حصول کسی صاحب نسبت بزرگ سے بیعت و ارادت کے بغیر ممکن نہیں۔ اور یہ چیز اس قدر ضروری خیال کی جاتی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی خانقاہ کی سند حاصل کیے بغیر لوگوں کو اللہ اور اس کے رسول کی بتائی ہوئی باتیں سکھانا اور بتانا شروع کر دے تو لوگوں کی نظر میں یہ بات اسی طرح کھٹکنے لگتی ہے جس طرح کوئی شخص

بغیر سند حاصل کیے کسی شہر میں مریضوں کا علاج شروع کر دے۔ بلکہ ایک عطائی، اگر اس کے علاج سے لوگوں کو فائدہ پہنچ رہا ہو، آہستہ آہستہ گوارا کر لیا جاتا ہے لیکن اصلاح نفوس و تزکیہ اخلاق اور تعلیم دین ارباب خانقاہ کا ایسا اجارہ ہے کہ بغیر ان کی سند کے کوئی شخص اس کام کا اہل ہو ہی نہیں سکتا، اگرچہ اس کی تعلیم و دعوت سے دلوں میں کتنا ہی بڑا انقلاب برپا ہو جائے۔

اسی طرح یہ بات بھی تقویٰ کے لوازم میں سے سمجھی جاتی ہے کہ آدمی نہ صرف منہیات و محظورات کا تارک ہو بلکہ بہت سے مباحات کا بھی تارک ہو اور ستم ظریفی یہ ہے کہ منہیات میں اصلی اہتمام ان چیزوں کا کیا جاتا ہے جن کی حیثیت اصل دین میں محض ضمنی ہے۔ لیکن ان پر اس شد و مد سے وعظ کیے جاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ اصل دین یہی چیزیں ہیں اور بہت سی ایسی چیزیں جو صریحاً خدا اور اس کے رسول سے بغاوت کے حکم میں داخل ہیں نہ صرف یہ کہ ان پر طبائع میں کوئی خلش تک نہیں پیدا ہوتی بلکہ ان چیزوں کو خود اسلام کی ترقی کے اجزا میں سے گنا جاتا ہے اور بسا اوقات ان کے حصول کے لیے ہماری خانقاہوں میں دعائیں کی جاتی ہیں۔ مثلاً ہم نے دیکھا ہے کہ جب لوگوں کو پائنچوں کے ٹخنوں کے نیچے ہونے، اور ڈاڑھی اور لب کے مسائل میں بڑا انہماک و غلو ہے وہ رات دن طاغوت کے تقرب کی طلب اور اس کے لیے دعائیں اور سفارشیں کرتے ہیں۔ ذرہ برابر بھی قباحت نہیں محسوس کرتے لیکن معاً جب وہ ایک ایسے شخص کو دیکھتے ہیں جو نہ صرف مشہور عام محظورات ہی کا بلکہ شریعت کے اصلی محرمات کا بھی تارک ہے اور کوئی بات اس کی زندگی میں ایسی نہیں دکھائی جا سکتی جو خدا اور اس کے رسول کی شریعت سے بغاوت و انحراف ہو تو بسا اوقات اس کے محاسن کے اعتراف سے اس لیے بخل کرتے ہیں کہ اس میں تقویٰ کی کمی ہے اور اس قلت تقویٰ کی دلیل عموماً اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی کہ وہ مباحات سے فائدہ اٹھانے میں ان کی طرح بے قرینہ یا زاہد خشک نہیں ہے۔

علیٰ ہذا القیاس تقویٰ کے شرائط معلومہ میں سے یہ بات بھی ہے کہ یہ تجرد و خلوت گزینی سے مناسبت رکھتا ہے اور خلوت کے گوشوں اور تنہائی کے حجروں ہی میں پرورش پاتا ہے۔ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ آدمی زندگی کی عملی سرگرمیوں سے الگ تھلگ اور خلائق سے منقطع ہو کر یادِ الٰہی میں مشغول رہے۔ اس خیال کے غلبہ کا اثر یہاں تک ہے کہ اگر ایک شخص کی زندگی دین کی حجت واضح کرنے اور اس کی اقامت کے لیے کشمکش میں بسر ہو رہی ہو تو ہمارے تقویٰ کی موجودہ سائنس کے ماہرین کے نزدیک یہ طریقہ نہ صرف حصول تقویٰ کے لیے نتیجہ بخش نہیں ہے بلکہ اس میں سخت فتنے پوشیدہ ہیں اور اس سے کچھ فائدہ حاصل ہوتا تو الگ رہا بہت زیادہ اندیشہ اس بات کا ہے کہ اس کشمکش میں اس کی رہی سہی خوبیاں بھی برباد ہو جائیں۔ اصولی طور پر یہ حضرات اس بات کے قائل ہیں کہ آدمی پوری زندگی ریاضت و مراقبہ میں گذار دے ورنہ کم از کم ایک طویل مدت تو اس شغل تنہائی میں بسر کیے بغیر آدمی کے لیے عملی میدان میں اترنا بہر صورت خطرہ سے خالی نہیں۔ یہ حضرات اس بات کے منکر ہیں کہ بچہ کی ترقی کے لیے اس کی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ماں کی گود سے زمین میں اترے، رینگے، کھڑے ہونے کی کوشش کرے، کھڑا ہو، لڑکھڑائے گرے اور پھر دوڑنے لگے۔ وہ اس کے برعکس اس بات کے قائل ہیں کہ بچہ ولادت سے لے کر سن رشد تک ماں باپ کے کندھوں پر لدا لدا پھرے اور جب چالیس برس کی اس پختہ استعداد مادی و عقلی کو پہنچ جائے جس کو قرآن حکیم نے فلما بلغ اشدہ و بلغ اربعین سنۃ سے تعبیر کیا ہے تو اس کو دفعۃً کارزارِ حیات میں جھونک دیا جائے کہ اب تو جا اس کے نشیب و فراز اور سرد و گرم سے خود عہدہ برا ہو کیونکہ پورے چالیس سال مادر شفقہ کی محفوظ آغوش میں اس کارزار میں اترنے کے لیے تربیت حاصل کر چکا ہے۔

اسی طرح اہل تقویٰ کی خاص پہچان یہ بتائی جاتی ہے کہ وہ نہ صرف صاحب تاثیر بلکہ صاحب تسخیر ہوتے ہیں۔ ان کی ایک نگاہ دلوں کو

بدل دیتی ہے۔ ان کے ایک اشارے سے وہ کام ہو جاتے ہیں جو دوسروں کی برسوں کی جانکاہیوں سے بھی نہیں ہوتے۔ شقی سے شقی انسان ان کی صحبت میں آتے ہی مومن کامل ہو جاتا ہے۔ وہ جدھر سے گذر جاتے ہیں ادھر کی دنیا نورِ ایمان سے جگمگا اٹھتی ہے۔ وہ نہ زبان سے بولتے، نہ پاؤں سے چلتے، نہ ہاتھوں سے اشارے کرتے تاہم ان کے فیض باطنی کا یہ اثر ہوتا ہے کہ ان کے سایہ کے پرتو سے کفر و باطل بھاگتا ہے۔ اس طرح کے خیالات کا جن لوگوں کے دماغوں پر تسلط ہے ان کی نظر میں وہ لوگ بالکل نہیں جچتے جو باطنی تصرفات کے بجائے اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے عام قانون کے مطابق کام کرتے ہیں اور اس کی راہ میں انہی ہتھیاروں سے لڑتے ہیں جو اس نے کوشش اور جد و جہد کے لیے عنایت فرمائے ہیں بلکہ خود حضرات انبیائے کرام اور صحابۂ عظام کی بھی ان کی نظروں میں کوئی وقعت نہیں ہو سکتی کیونکہ ان حضرات کو بھی یہ درجہ نصیب نہ ہو سکا کہ اپنی ایک نگاہ سے دلوں کی کایا پلٹ دیتے بلکہ برسوں کی محنتوں، دعوتوں، مزاحمتوں، مخالفتوں، ناکامیوں اور پامالیوں کے بعد جب یہ حال ہوا کہ رسول اور اس کے تمام ساتھی پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی تب اللہ تعالیٰ نے ان کی صدا میں تاثیر اور ان کی دعوت میں قوت عطا فرمائی۔

جو لوگ آج تقویٰ کا لفظ بولتے ہیں ان کے ذہنوں میں یہ سارے مفاہیم یا ان کا بڑا حصہ مضمر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سارے متعلقات نہ تو بالکل غلط ہیں نہ کل کے کل صحیح ہیں۔ بلکہ یہ صحیح و سقیم دونوں کا مجموعہ ہے لہٰذا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کی روشنی میں اس لفظ کی حقیقت سمجھنے کی کوشش کی جائے اور اپنے ذاتی رجحانات کی طرفداری کے بغیر معلوم کیا جائے کہ تقویٰ کی حقیقت اور اس کے قیود و شرائط اور احوال و خصائص کیا ہیں

عربی زبان میں وقی یقی کے معنی ہیں کسی شے کے ضرر سے اپنے تئیں بچانا۔ اسی سے اتقاء ہے جو قرآن مجید میں کئی معنوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔

(۱) جس چیز سے نقصان پہنچے کا اندیشہ ہو اس سے محفوظ رہنا مثلاً الا ان تتقوا منهم تقاة (مگر یہ کہ تم ان سے بچو جیسا کہ بچنا چاہیے)

(۲) کسی شر سے ڈرنا مثلاً واتقوا فتنة لا تصيبن الذين ظلموا منكم خاصة (اس فتنہ سے ڈرتے رہو جو تم میں سے خاص طور پر انہی لوگوں کو نہیں پکڑے گا جنھوں نے ظلم کیا ہوگا)

(۳) خدائے پاک و منعم کے حضور اظہار خشیت جو اپنے شکر گذار اور وفادار بندوں پر رحم فرماتا ہے۔ کفر و ناسپاسی کو ناپسند کرتا ہے اور تمام ڈھکے چھپے سے واقف ہے۔ مثلاً ان تتقوا الله يجعل لكم فرقانا ويكفر عنكم سياتكم (اگر تم اللہ سے ڈروگے تو اللہ تم کو حق و باطل کا امتیاز بخشے گا اور تمہارے گناہوں کو دور کرے گا)

(۴) چوتھا مفہوم ان تینوں مفہوموں کا جامع ہے یعنی اللہ کے حدود کو توڑنے، اس کی امانتوں میں خیانت کرنے اور اس کے عہد کی بے حرمتی کرنے سے اس کے برے نتائج اور خدا کے غضب کے اندیشہ کی بنا پر بچنا اور جہاں کہیں مفعول کے بغیر یہ لفظ آتا ہے بالعموم یہی جامع معنی مراد ہوتے ہیں اور اسی کی دوسری تعبیر تقویٰ ہے۔ اس مفہوم پر آگے چل کر ہم مفصل بحث کریں گے۔ یہاں صرف اس قدر یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ اس معنی کے لحاظ سے متقی وہ شخص ہے جس کے دل میں خدا کی تعظیم، اس کے غضب کا اندیشہ ہو اور وہ خدا کے قائم کیے ہوئے حدود کو توڑنے، اس کے عہد و میثاق کی خلاف ورزی کرنے اور اس کی امانتوں میں خیانت کرنے سے ڈرتا ہو۔

اس کائنات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنی چیزیں بنائی ہیں ان میں دو طرح کی صلاحیتیں ودیعت فرمائی ہیں۔ ایک اپنی مخفی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی قوت، دوسری اپنی حفاظت کی صلاحیت۔ پہلی قوت کا تقاضا اقدام اور عمل ہے اور اس کا نتیجہ ہر شے

کا اپنی اس غایت تک پہنچنا ہے جس کے لیے وہ خلق ہوئی ہے اور دوسری قوت کا تقاضا احکام و احتراز ہے اور اس کا ثمرہ ہر شے کا ان خطرات سے محفوظ رہنا ہے جو اس کو اس کی منزل تک پہنچنے سے پہلے برباد کر سکتے ہیں۔ پہلی قوت ہر شے کو پروان چڑھاتی ہے اور اس کی تمام مخفی صلاحیتوں کو ابھارتی ہے اور دوسری قوت اسکی حفاظت کرتی ہے۔ اس کی مثال ایک اچھے موٹر کی ہے جس کے اندر ایک سچا بریک لگا ہوا ہے۔ کچھ پرزے ہوتے ہیں جن کے باہمی تفاعل سے وہ قوت پیدا ہوتی ہے جو گاڑی کو ہوا کی رفتار سے چلاتی ہے اور یہ قوت ہی گاڑی کا اصلی جوہر ہے لیکن اگر تنہا یہی قوت کارفرما ہو تو نہیں معلوم گاڑی کس کھڈ میں گر کر اور کس درخت سے ٹکرا کر چکنا چور ہو جائے، اس وجہ سے اس کے ساتھ ایک بریک لگایا جاتا ہے جو اس قوت کو اپنے ضبط و نظم میں رکھتا ہے اور گاڑی کو اپنی حفاظت میں لیکر اسکی منزلِ مقصود تک پہنچاتا ہے۔ یہ بریک اس کائنات کی ہر قوت اور ہر حرکت کے ساتھ لگا ہوا ہے اور اسی سے اس دنیا کی زندگی اور حفاظت ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو یہ دنیا اور اس دنیا کی ساری چیزیں آن کی آن میں پاش پاش ہو کر فنا ہو جائیں۔

اس قوت و صلاحیت کو اس کے مختلف گوشوں میں ہم مختلف ناموں سے تعبیر کرتے ہیں۔ کہیں یہ حفاظت ذات کے نام سے موسوم ہے کہیں تقویٰ کے نام سے لیکن تعبیر کے اختلاف سے نفس حقیقت میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا۔ ایک ہی حقیقت ہے جس کا مسمّی تھوڑے سے فرق کے ساتھ اس کائنات کی ہر چیز میں، اس زمین کے ہر جاندار میں، اس دنیا کے ہر انسان میں پایا جاتا ہے اور ہر جگہ اس کے افعال و اثرات تقریباً ایک ہی سے ہیں اس وجہ سے تقویٰ کی اصلی اہمیت، اسکا اصلی موقع و محل اور اس کے واقعی افعال و اثرات کی وضاحت کے لیے بہتر ہوگا کہ اس کائنات کے مختلف گوشوں میں اس کی مختلف شکلوں کا مشاہدہ کر لیا جائے یعنی یہ دیکھ لیا جائے کہ آفاق میں جو تقویٰ پایا جاتا ہے اس کی شکل و صورت کیا ہے، حیوانات کے اندر اس کی نوعیت کیا ہے، انسانوں کی فطرت میں اس کی حقیقت کیا ہے۔ اس طرح اگر ہم آفاقی جبلی اور فطری تقویٰ کی مختلف صورتوں اور ان کے افعال و اثرات سے اچھی طرح آشنا ہو جائیں گے تو ہم کو یہ سمجھنے میں کچھ زیادہ دقت نہیں ہوگی کہ شریعت ہم سے جس تقویٰ کا مطالبہ کرتی ہے اسکی شکل و صورت اور اس کے افعال و اثرات کیا ہونے چاہئیں اور پھر جو کچھ ہونا چاہیے اگر اس کی تصدیق اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسول کی زندگی اور اس کے ساتھیوں کے حالات سے بھی ہو جائے تو یقین کر لینا چاہیے کہ یہی حق ہے اور اس کے سوا اس کے جو لوازم و تضمنات بیان کیے جاتے ہیں ان کی اصل نہ تو عقل و فطرت کے اندر ہے، نہ اللہ کی کتاب میں ہے اور نہ رسول کی سنت میں۔ اب ہم بالترتیب تقویٰ کی ان مختلف قسموں کی وضاحت کرتے ہیں۔

سب سے پہلے ہمیں اس تقویٰ کا مشاہدہ کرنا چاہیے جس کی جلوہ گری اس کائنات کے ان گوشوں میں بھی موجود ہے جہاں ہم کسی ارادہ اور زندگی کا شعور نہیں پاتے بلکہ قدرت کا ایک بندھا ٹکا نظام ہے جس کے ماتحت ہر چیز اپنی پوری قوت کے ساتھ اپنا عمل کر رہی ہے۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں تک کسی شے کے طبعی وظیفہ کا تعلق ہے اس کی تکمیل کی راہ میں کوئی مزاحمت نہیں ہے۔ بلکہ قدرت اس کو اس بات کی پوری اجازت دیتی ہے کہ جہاں تک وہ بڑھ سکتی ہے وہاں تک بڑھے اور جس منزل تک پہنچ سکتی ہے وہاں تک پہنچے لیکن ساتھ ہی ایک مخفی ہاتھ اسکی باگیں بھی تھامے ہوئے ہے اور پوری ہوشیاری کے ساتھ اس امر کی نگرانی کر رہا ہے کہ یہ اپنی راہ سے بے راہ نہ ہو جائے اور اپنے حدود کو چھوڑ کر اور دوسروں کے حدود میں دراندازی کر کے نہ اپنا کام خراب کرلے نہ دوسروں کے کام میں خلل ڈالے۔ یہ آفاقی تقویٰ ہے اور اسی کی طرف قرآن مجید کی ان آیات میں اشارہ ہے:۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ۝ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنَاهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ ۝ لَا الشَّمْسُ يَنۢبَغِي لَهَا أَن تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ

اور سورج اپنے خاص مدار پر حرکت کرتا ہے۔ یہ عزیز و علیم کا ٹھیرا ہوا اندازہ ہے۔ اور چاند کیلیے ہم نے منزلیں ٹھیرا دی ہیں یہاں تک کہ وہ کھجور کی پرانی شاخ کے مانند رہ جاتا ہے۔ نہ سورج کو یہ حق ہے کہ چاند کو جا لے اور نہ رات ہی دن سے پہلے نمودار ہو سکتی، ہر ایک ایک خاص مدار میں تیر رہا ہے۔

یہی طبعی تقویٰ ہے جو کھاری اور میٹھے سمندروں کو اپنے اپنے حدود کی پاسداری پر مجبور کرتا ہے اور ان کو ایک دوسرے کے حدود میں مداخلت سے روک کر ان کے ان فوائد کی حفاظت کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر ودیعت فرمائے ہیں۔

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ ۝ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ (۲۰-۹ رحمٰن)

اس نے چھوڑے ہیں دونوں سمندر کہ ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں اور ان کے درمیان ایک پردہ ہے جس سے تجاوز نہیں کرتے

کائنات کی یہ اشیاء، اللہ کی قائم کی ہوئی حدوں کی نگرانی کرتی ہیں اور ان کے توڑنے کی جرأت نہیں کرتیں اور یہی ان کا تقویٰ ہے اور یہ اپنی عملی نمونہ سے انسان کو درس دیتی ہیں کہ وہ اپنے ارادہ و اختیار کی دنیا میں انہی کی طرح خدا کے قائم کیے ہوئے حدود کا پابند ہو اور ان سے تجاوز کر کے اپنے آپ کو برباد نہ کرے۔

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ سورج اور چاند ایک حساب کے ساتھ گردش کرتے ہیں، ستارے اور درخت سجدہ کرتے ہیں، اور

وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ (رحمٰن) آسمان کو بلند کیا اور اسمیں ایک میزان رکھی (یہ زبان حال سے تعلیم دیتے ہیں کہ) تم میزان میں عدل

بعینہٖ اسی طرح تقویٰ کی نمود ہم اس عالم میں پاتے ہیں جہاں زندگی تو موجود ہے لیکن انسانی اختیار و ارادہ موجود نہیں ہے یعنی حیوانات کے اندر ان کی زندگی کی حفاظت اور ترقی بھی تقویٰ ہی کی بدولت ہے اگرچہ اختیار و ارادہ سے محروم ہونے کی وجہ سے ان کا تقویٰ جبلی تقویٰ ہے۔ قدرت نے ہر حیوان کی جبلت کے اندر وہ ساری قابلیتیں ودیعت کر دی ہیں جو اس کی نوعی صفات کے درجۂ کمال تک ترقی کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ یہ ترقی جس طرح کی حرکت اور جدوجہد کی طالب ہے وہ بھی ان کے اندر ودیعت ہے اور جس قسم کے سکون کا مطالبہ کرتی ہے وہ بھی ان کو تعلیم کر دیا گیا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس جن چیزوں سے ان کو ڈرنا اور بچنا چاہیے ان سے بھی وہ جبلی طور پر ڈرتے اور بچتے ہیں اور ان کا یہی جبلی تقویٰ ہے جو ان کا اصلی پاسبان ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو حیوانات کی کوئی نوع بھی وجود میں آ کر اپنے آپ کو باقی نہ رکھ سکے۔ ایک مرغی کا ننھا سا بچہ پہلے روز سے جانتا ہے کہ اسے کس طرح اپنی ذات کو نشو و نما دینے کے لیے اپنی ماں کے ساتھ ساتھ پھرنا اور اسی کے اشاروں پر دوڑ کر زمین سے غذا کے ذرہ کو چگنا چاہیے اور پھر کس طرح کوے، چیل، شکرے، اور بلی کی آہٹ پاتے ہی اس کے پروں کے نیچے چھپ جانا چاہیے۔ گدہا ایک نہایت غبی جانور ہے لیکن اس غباوت کے باوجود وہ بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ زمین کی بے شمار نباتات میں سے کونسی گھانسیں ہیں جو اس کے لیے غذائے صالح کا حکم رکھتی ہیں اور کونسی گھانسیں ہیں جو اس کے لیے مضر اور سم قاتل ہیں۔ اور ایک گدہا بھوکا ہو کر بھی اپنے جبلی تقویٰ میں ایسا کامل ہوتا ہے کہ بھوکا مرجاتا ہے لیکن یہ گوارا نہیں کرتا کہ جبلت نے اس کے لیے جو قاعدے ٹھہرا دیے ہیں اور جو حدود قائم کر دیے ہیں ان کو توڑ کر کوئی ایسی چیز کھالے جو اس کی جبلت کی شریعت میں حرام ہو۔ منافع کو اختیار کرنے اور نقصانات سے بچنے کی یہی وہ ہدایت ہے جو ہر جاندار کے اندر اللہ تعالیٰ نے ودیعت فرمائی ہے اور جس کی طرف قرآن حکیم کی یہ آیت اشارہ کر رہی ہے۔

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى اپنے پروردگار برتر کی تسبیح کر جس نے خلق کیا پھر اس کا تسویہ کیا اور جس نے اندازہ ٹھیرایا پھر اس کی طرف رہنمائی فرمائی۔

آفاقی اور جبلی تقویٰ کے یہی مخفی اشارات ہیں جو انسان کے اندر آ کر پوری طرح اجاگر ہو جاتے ہیں۔ چیز وہی ہے لیکن انسان کی حیثیت چونکہ مقہور و مسخر اجرام سماوی اور بے اختیار و امتیاز حیوانات سے بالکل مختلف ہے اس وجہ سے اس کے تقویٰ کی نوعیت اور قدر و قیمت بدل جاتی ہے۔ بلکہ تقویٰ کا نام ہی یہ چیز اس وقت پاتی ہے جب انسان کے اندر پائی جاتی ہے۔ یہ ذی ارادہ اور ذی اختیار مخلوق ہے اس وجہ سے وہ شمس و قمر کی طرح اپنے تقویٰ کے ساتھ جکڑ کے باندھا نہیں گیا ہے کہ جس ڈگر پر ہانک دیا گیا ہے اس سے منحرف ہی نہ ہو سکے بلکہ اس کی فطرت کے اندر نافع و ضار کے پہچاننے کا ذوق دے کر اس کو آزاد چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اپنے .... ذوق اور اپنی عقل کی رہنمائی سے اپنے لیے نافع کو اختیار کرے اور مضر سے احتراز کرے۔ نیز وہ صرف ایک مادی ہستی ہی نہیں رکھتا ہے بلکہ ایک اخلاقی ہستی بھی رکھتا ہے اس وجہ سے اس کے اندر صرف مادی مضرتوں ہی سے بچنے کا ذوق نہیں ودیعت کیا گیا ہے بلکہ اخلاقی و روحانی مضرتوں اور مفاسد سے بھی احتراز کرنے کا ذوق بخشا گیا ہے۔ چنانچہ ایک طرف تو اس کو اس کا ذوق دیا گیا کہ خوبصورت کو پیار کرے اور بدصورت سے گریز کرے، خوشبو سے محبت اور بدبو سے نفرت کرے، طیب کو حلال اور خبیث کو حرام سمجھے اور دوسری طرف اس کو اس بات کا ذوق بخشا گیا ہے کہ وہ جھوٹ سے نفرت اور سچ سے محبت کرے، ظلم کو برا سمجھے اور عدل کی قدر کرے۔ یہ انسان کا فطری تقویٰ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کی فطرت کے اندر ودیعت فرمایا ہے اور قرآن مجید

کی متعدد آیات میں اس کی طرف اشارہ ہے۔ مثلاً [هديناه السبيل اما شاكرا واما كفورا] [وهديناه النجدين] [فالهمها فجورها وتقواها] یہی تقویٰ ہے جو انسان کی مادی اور روحانی زندگی کا ضامن ہے۔ اگر انسان اپنی مادی زندگی میں مضرتوں سے احتراز نہ کرے بلکہ گندم کی جگہ کنکریاں پھانکنا شروع کر دے تو اس کا لازمی نتیجہ اس کی مادی زندگی کا خاتمہ ہے اور اگر وہ اپنی اخلاقی زندگی میں مہلکات سے نہ بچے اور شکر کی جگہ ناشکری کی راہ چل پڑے تو اس کی روحانی زندگی کی ہلاکت یقینی ہے اگرچہ اس ہلاکت سے اسے اس زندگی کے خاتمہ ہی سے دوچار ہونا پڑے۔

اس تفصیل سے چند باتیں معلوم ہوئیں۔

(۱) پہلی یہ کہ تقویٰ ہی ہر شے کی زندگی اور اس کی ترقی کا محافظ ہے۔

(۲) دوسری یہ کہ یہ زندگی کی شاہراہ سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ ہر مرحلہ میں زندگی کے ہم رکاب ہے اور اس کی حیثیت بدرقہ کی ہے جو انسان کو غلط روی اور خطرات راہ سے بچا کر منزل مقصود تک پہنچاتا ہے۔ چنانچہ قرآن نے اس کو خیر الزاد بہترین زاد راہ سے تعبیر کیا ہے۔

(۳) تیسری یہ کہ کسی مرحلہ میں بھی یہ زندگی کی جدوجہد اور اس کے ارتقائے مادی و اخلاقی میں مزاحم نہیں ہے بلکہ ان مزاحمتوں سے یہ زندگی کی حفاظت کرتا ہے جو اس کی مادی یا روحانی ترقی کو درہم برہم کر سکتی ہیں۔

(۴) چوتھی یہ کہ اس کی کوئی خاص ہیئت و صورت نہیں ہے بجز اس کے کہ جبلت اور فطرت کے اندر جو حدود بڑھنے اور رکنے کیلیے قائم کر دیے گئے ہیں ان کی پوری پاسداری کی جائے۔

اب آئیے شرعی تقویٰ کی حقیقت پر غور کیجیے۔ ظاہر ہے کہ شریعت فطرت کے برخلاف نہیں بلکہ عین فطرت ہے۔ فطرة الله التي فطر الناس عليها۔ اس وجہ سے شریعت کی نسبت یہ گمان کرنا تو کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی ایسے تقویٰ کا مطالبہ کرے گی جو انسان کی زندگی میں کسی طرح کا تعطل پیدا کرے، یا اس کی جائز رغبتوں کی نفی کرے، خواہ ان کا تعلق ابتدائی ضروریات سے ہو یا کمالیات سے، یا اس کا حصول زندگی کی شاہراہ سے الگ ہو کر کسی ایسے بعید گوشے اور دور دراز جزیرہ ہی میں ممکن ہو جہاں حرکت کے بجائے صرف سکون اور زندگی کی جگہ صرف موت ہو۔ یا اس کی شناخت کے لیے وہ کوئی ایسی علامت ٹھہرائے جو رد و قبول، ترک و اختیار اور ہدایت و ضلالت کے اس قانون ہی کو یکسر باطل کر دے جو اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں جاری فرمایا ہے اور جو انسان کی فطرت اور خدا کی حکمت کا عین مقتضیٰ ہے ان باتوں میں سے کوئی بات بھی اگر تسلیم کر لی جائے تو اس سے لازم آتا ہے کہ شریعت اور فطرت میں کامل توافق کی جگہ ایک مستقل نزاع اور جنگ کی حالت قائم ہو حالانکہ ایسا سمجھنا خود شریعت کی تکذیب ہے شریعت کا اعلان تو یہ ہے کہ اس نے فطرت پر نہ سر مو اضافہ کیا ہے نہ اس میں کوئی کمی کی ہے بلکہ انسان کی فطرت جو کچھ مطالبہ کرتی ہے اس کو اس نے بالکل مبرہن اور آشکارا کر دیا ہے۔ فطرت کے جو اشارات مخفی تھے ان کو شریعت نے بالکل روز روشن کی طرح نمایاں کر دیا تاکہ ان کے خفا کی وجہ سے انسان کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہے۔ فطرت کے صحیح مقتضیات کے تعین میں، انسان کی بعض کمزوریوں کی وجہ سے اختلاف پیدا ہو سکتا تھا شریعت نے مقتضیات کو معین کر کے اس اختلاف کا خدشہ دور کر دیا۔ اس سے زیادہ شریعت کسی بات کی مدعی نہیں ہے۔ اس وجہ سے جبلی اور فطری تقویٰ اور شرعی تقویٰ میں جو کچھ فرق ہو سکتا ہے وہ نفس تقویٰ کی حقیقت اور اس کے مقصد میں نہیں ہو سکتا البتہ اس کے محرک میں ہو سکتا ہے۔ جبلت میں صرف ذات کی حفاظت کا جذبہ مخفی ہوتا ہے، فطرت میں حفاظت نفس کے ساتھ مذاق سلیم اور انجام بینی کا پہلو بھی نمایاں ہو جاتا ہے اور شریعت میں، اگر صاف صاف، ایک خدائے منعم و دیان کا خوف اور حساب اور عدل الٰہی کا ڈر ہے جو انسان کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ اس کی زندگی کے لیے جو سیدھی راہ متعین کر دی گئی ہے اس پر چلے اور بے راہ روی اور گمراہی سے اس کو بچائے جو حدود شریعت نے قائم کر دیے ہیں ان سے تجاوز کرنے کی جسارت نہ کرے۔ پس شرعی تقویٰ کی حقیقت یہ ہونی چاہیے کہ آدمی اپنی زندگی کو خدا کے مقرر کیے ہوئے حدود کے اندر رکھے اور دل کی گہرائیوں کے اندر اس بات کا ڈر رہے کہ جہاں اس نے خدا کی قائم کی ہوئی کسی حد کو توڑا تو اس کو خدا کی سزا سے بچانے والا خدا کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔

یہاں تک ہم نے یہ بات معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ شرعی تقویٰ کی حقیقت کیا ہونی چاہیے۔ اب ہم قرآن مجید کی روشنی میں یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ درحقیقت تقویٰ ہے بھی یہی۔ سب سے پہلے لفظ تقویٰ کو لیجیے کہ قرآن نے اس لفظ کو کس مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ فرمایا ہے:۔

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى (۱۹۷ بقرہ)

حج کے چند متعین مہینے ہیں سو جو شخص ان مہینوں میں اپنے اوپر حج لازم کر لے تو حج میں نہ عورت سے تعلق جائز ہے، نہ گالی گلوچ، نہ جھگڑا (بلکہ اس کو بھلائیاں کرنی چاہئیں) اور جو بھلائی کا کام تم کرو گے تو اللہ اس کو علم میں رکھے گا اور تقویٰ کا زادِ راہ لے کر حج کے لیے نکلو کیونکہ بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر عبادت کے لیے قیود و شرائط ہیں اور اس کا مثمر ہونا اس بات پر منحصر ہے کہ ان قیود و شرائط کے ساتھ اس کو پورا کیا جائے۔ مثلاً حج کے سفر کے لیے جو لوگ نکلیں ان کے لیے ضروری ہے کہ اپنے نفس کو شہوات سے، زبان کو گالی گلوچ اور بدگوئی سے نیز بات بات پر جنگ و جدل سے محفوظ رکھیں اور بھلائیاں کریں۔ پھر ان تمام باتوں سے محفوظ رہنے کو تقویٰ قرار دیا اور اس تقویٰ کو بہترین زادِ راہ سے تعبیر فرمایا جس کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح وہ شخص جو بغیر زادِ راہ کے سفر کے لیے چل کھڑا ہوا ہے ہر قدم پر اس کی زندگی خطرات سے دوچار ہے، نہیں معلوم کس مرحلہ میں بھوک اور پیاس اور بے سامانی اس کا خاتمہ کر دے۔ اسی طرح جو شخص تقویٰ کے زادِ راہ اور حدودِ الٰہی کی پاسداری کے عزم کے بغیر حج کے لیے چل پڑا ہے نہیں معلوم کس جگہ اس کے نفس کی شہوت اور اس کی زبان کی بے قیدیاں اس کے سارے حج کو غارت کر دیں۔

دوسری جگہ فرمایا:۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (۸۔ مائدہ)

کسی قوم کا بغض تمہیں اس بات پر نہ اکسائے کہ تم اس کے باب میں عدل سے ہٹ جاؤ، بلکہ عدل پر قائم رہو۔ یہی بات تقویٰ سے اوفق ہے۔

اس آیت میں مخالفین اور اعداء کے بارہ میں حدودِ الٰہی پر قائم رہنے کو تقویٰ سے اوفق قرار دیا۔

ایک اور مقام میں ہے:۔

تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (۲۔ مائدہ)

ادائے حق اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون کرو اور حق تلفی اور تعدی کے کاموں میں تعاون نہ کرو۔

اس آیت میں بِر و اثم اور تقویٰ اور عدوان کا تقابل ہے اور کسی لفظ کا مقابل لفظ اپنے مقابل کے صحیح مفہوم کی تعیین میں سب سے زیادہ مدد کرتا ہے۔ عدوان کے معنی تجاوز عن الحد یعنی اپنی متعینہ حد سے آگے بڑھ جانے کے ہیں اس وجہ سے تقویٰ کے معنی اللہ کے حدود کی حفاظت کے ہوں گے یعنی اللہ تعالیٰ نے جو حقوق واجب کر دیے ہیں، جو حدود متعین کر دیے ہیں، جو حلال و حرام ٹھہرا دیے ہیں پورے خوفِ خدا کے ساتھ ان کی نگہداشت کی جائے۔

سورہ توبہ میں ہے:۔

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ

جس مسجد کی بنا روزِ اول سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے وہ اس بات کی زیادہ حقدار ہے کہ تم اس میں نماز پڑھو۔

اس آیت سے اوپر والی آیت میں مسجد ضرار کا ذکر ہے جس کا مقصد ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ بیان کیا گیا ہے یعنی مسلمانوں کو نقصان پہنچانا، خدا کی ناشکری کرنا، مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا اور اللہ اور رسول کے محاربین کے لیے ایک اڈا مہیا کرنا۔ اس کے بعد اس مسجد کا ذکر کیا گیا جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو باتیں ان باتوں کی ضد ہیں یعنی مسلمانوں کی خیر خواہی، اللہ کی شکر گزاری، مسلمانوں میں اتحاد و تالیفِ قلب پیدا کرنے کی کوشش اور اللہ اور اس کے رسول کے مخالفین سے بیزاری، یہ سب تقویٰ کی باتیں ہیں۔

ایک اور مقام میں فرمایا ہے:۔

إِذْ جَعَلَ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَأَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَىٰ وَكَانُوا أَحَقَّ بِهَا وَأَهْلَهَا (۲۶ - الفتح)

یاد کرو جبکہ کافروں نے اپنے دلوں میں حمیت پیدا کرلی، جاہلیت کی حمیت، تو اللہ نے اپنی طرف سے اپنے رسول اور اہل ایمان پر تسکین اتاری اور ان کو کلمہ تقویٰ کا پابند رکھا اور وہ اس کے حقدار اور اہل تھے۔

کفار مکہ نے حدیبیہ کے دن حمیت جاہلیت کے جنون میں مسلمانوں کو بیت اللہ میں داخل ہونے سے روک دیا اور باوجودیکہ مسلمان ایک طاقتور جمعیت کے ساتھ وہاں موجود تھے اور ان کے جذبات کفار کے اہانت انگیز سلوک کی وجہ سے نہایت مشتعل تھے لیکن وہ اللہ اور رسول کے فیصلہ پر راضی رہے اور جذبات کے ہیجان میں اس حد سے متجاوز نہیں ہوئے جس پر اللہ کے رسول نے ان کو روک دیا۔ اللہ اور رسول کے فیصلے پر اسی طمانیت کو جو انھوں نے رضیت باللہ ربا و بالاسلام دینا و بمحمد رسولا کے الفاظ سے ظاہر کی آیت مذکورہ بالا میں کلمہ تقویٰ سے تعبیر کیا گیا ہے اور مسلمانوں کی نہایت تعریف کی گئی ہے کہ انتہائی صبر آزما حالات میں بھی وہ اس کلمہ کے اہل قرار پائے۔

ایک سرسری نظر ان کاموں پر بھی ڈالیے جن کو قرآن نے اتقاء کے لفظ سے تعبیر کیا ہے مثلاً فرمایا ہے:۔

وَلَوْ أَنَّهُمْ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَمَثُوبَةٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ خَيْرٌ

اگر وہ ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو اللہ کے پاس سے ان کے لیے بہتر اجر تھا۔

یہاں وَاتَّقَوْا کا لفظ بالکل وعملوا الصالحات کی جگہ پر ہے اور سیاق کلام کو پیش نظر رکھ کر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود اللہ کی کتاب کو چھوڑ کر جن علوم سفلیہ میں مبتلا ہو گئے تھے ان سے بچنے کے لیے یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

دوسری جگہ فرمایا ہے:۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ

اور تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے اے اہل عقل تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو۔

یعنی اگر قصاص لینے میں کوتاہی کی گئی تو کسی کی جان بھی دوسروں کی تعدی سے محفوظ نہ رہے گی پس حدود پر قائم رہنے اور قائم رکھنے کیلیے قصاص لینا ضروری ہے۔

روزہ کے متعلق ارشاد ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ

اے ایمان والو تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے جس طرح ان لوگوں پر فرض کیا گیا تھا جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو۔

روزہ کا مقصد یہ ہے کہ آدمی کو اپنے جذبات و شہوات پر قابو حاصل ہو جائے تاکہ وہ زندگی کے مختلف مرحلوں میں اللہ کے حدود کی حفاظت کر سکے۔ اسی مفہوم کو یہاں لعلکم تتقون کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔

ایک جگہ ہے:۔

فَمَنِ اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ

پس جو تم پر زیادتی کرے تو اس پر اتنی ہی زیادتی کرو جتنی اس نے تم پر کی ہے اور اللہ سے ڈرو اور جان رکھو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔

یہاں واتقوا اللہ سے مطلب یہ ہے کہ بدلہ لینے میں اپنے حق سے تجاوز نہ کرو، بلکہ اللہ تعالیٰ کے قائم کیے ہوئے حدود کے پابند رہو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحَرِّمُوا طَيِّبَاتِ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ وَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ

اے ایمان والو اللہ نے جو چیزیں تمہارے لیے حلال ٹھہرائی ہیں نہ ان کی پاکیزہ چیزوں کو حرام قرار دو اور نہ حد سے آگے بڑھو، اللہ حد سے بڑھنے والوں کو دوست نہیں رکھتا اور

اللّٰہ حلالاً طیباً واتقوا اللّٰہ الذی انتم بہ مؤمنون — اللہ نے تم کو جو حلال و طیب چیزیں بخشی ہیں ان کو کھاؤ اور اس اللہ سے ڈرو جس پر تم ایمان لائے ہو۔

یہاں "واتقوا اللّٰہ" (اللہ سے ڈرو) سے مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حرام و حلال کے جو حدود ٹھہرا دیے ہیں ان کی پوری پابندی کرو۔ نہ اس کی حلال کی ہوئی چیز کو حرام ٹھہراؤ نہ حرام کی ہوئی چیز کو جائز قرار دو۔ جو شخص ایسا کرتا ہے وہ اللہ کی نظروں میں مبغوض ہے اور اس کے لیے سخت پاداش ہے۔

الذین عاھدت منھم ثم ینقضون عھدھم فی کل مرۃ وھم لا یتقون — وہ لوگ جن سے تم نے معاہدہ کیا ہے پھر وہ اپنا عہد ہر بار توڑ دیتے ہیں اور وہ نہیں بچتے۔

اس آیت میں "لا یتقون" سے مراد عہد شکنی اور خیانت ہے۔

واولات الاحمال اجلھن ان یضعن حملھن ومن یتق اللّٰہ یجعل لہ من امرہ یسرا — اور حاملہ عورتوں کی مدت وضع حمل ہے اور جو اللہ سے ڈرے گا اللہ اس کے معاملہ میں آسانی پیدا کر دے گا۔

اس آیت میں اس بات کو تقویٰ کا کام قرار دیا گیا ہے کہ حاملہ عورت کو اگر طلاق دی جائے تو وضع حمل سے پہلے اس کو گھر سے نہ نکالا جائے اور اس دوران میں اس کے نان نفقہ کی ذمہ داری اٹھائی جائے اور ہر طرح کے حسن سلوک کا حقدار سمجھا جائے۔

واحصوا العدۃ واتقوا اللّٰہ ربکم لا تخرجوھن من بیوتھن ومن یتق اللّٰہ یجعل لہ مخرجا ویرزقہ من حیث لا یحتسب — اور عدت کو شمار کرو اور اللہ سے ڈرو جو تمہارا رب ہے۔ ان کو نہ نکالو ان کے گھروں سے اور جو اللہ سے ڈرے گا اللہ اس کے لیے راہ پیدا کرے گا اور اس کو وہاں سے روزی دے گا جہاں سے اس کو گمان بھی نہ ہوگا۔

اب ہمیں ایک سرسری نظر ان آیات پر بھی ڈالنی چاہیے جن میں متقین کی خصوصیات و صفات بیان کی گئی ہیں تاکہ اچھی طرح واضح ہو جائے کہ قرآن کی اصطلاح میں متقی کون لوگ ہیں۔ فرمایا:-

لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ولکن البر من اٰمن باللّٰہ والیوم الاٰخر والملٰئکۃ والکتٰب والنبیین واٰتی المال علیٰ حبہ ذوی القربیٰ والیتٰمیٰ والمسٰکین وابن السبیل والسائلین وفی الرقاب واقام الصلوٰۃ واٰتی الزکوٰۃ والموفون بعھدھم اذا عاھدوا والصٰبرین فی الباساء والضراء وحین الباس اولٰئک الذین صدقوا واولٰئک ھم المتقون (۱۷۷ - بقرہ)

یہ وفاداری نہیں ہے کہ تم اپنا منہ مشرق اور مغرب کی طرف کرو بلکہ وفاداری تو ان کی وفاداری ہے جو اللہ پر، روز آخرت پر، فرشتوں پر، کتاب پر اور نبیوں پر ایمان لائے اور اس کی محبت میں رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سائلوں کو مال دیں اور گردنوں کو آزاد کرائیں، نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں، اور اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے ہوں جبکہ عہد کریں اور خاص کر ثابت قدم رہنے والے مصیبت اور تکلیف میں اور لڑائی کے وقت، یہی لوگ ہیں جو سچے ہیں اور یہی لوگ ہیں جو متقی ہیں۔

یہ آیت کسی شرح کی محتاج نہیں۔ دینداری اور تقویٰ کے اصلی مقتضیات اس میں پورے بیان ہو گئے ہیں اور ساتھ ہی اس میں ان لوگوں کی پوری تردید بھی ہے جو دین کے مطالبات میں سے کچھ رسوم یا بعض احکام کی پابندی میں مبالغہ کر کے یہ چاہتے ہیں کہ اس زیادتی سے اس کمی کی تلافی کر دیں جو وہ دین کے اصلی مطالبات پوری کرنے میں کر رہے ہیں۔ قرآن نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ یہ وفاداری اور تقویٰ نہیں ہے، تقویٰ کے کاموں میں فلاں فلاں کام اصل و اساس کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان میں خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر کام یہ ہے کہ مصائب و شدائد اور جنگوں میں حق کیلئے استقامت و عزیمت کا جوہر نمایاں ہو۔

دوسری جگہ فرمایا:-

بلیٰ من اوفیٰ بعھدہ واتقیٰ فان اللّٰہ یحب المتقین — ہاں جو اپنے عہد کو پورا کریں اور ڈریں تو اللہ تعالیٰ ڈرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

اس آیت میں ان لوگوں کو جو اللہ تعالیٰ کے عہد پر قائم رہیں اور بدعہدی سے بچیں متقی اور محبوب خدا قرار دیا گیا ہے۔

يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَأُولَٰئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَن يُكْفَرُوهُ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ (۱۱۴-۱۱۵ آل عمران)

اللہ اور روز آخرت پر ایمان لاتے ہیں، منکر سے روکتے ہیں، بھلائی کے کاموں میں سبقت کرتے ہیں اور یہی لوگ نیکوکاروں میں سے ہیں اور جو بھلائی کے کام کریں گے اس کا انکار نہیں کیا جائے گا اور اللہ متقیوں سے باخبر ہے

اس آیت میں ایمان باللہ، ایمان بالآخرت، نہی عن المنکر، مسابقت فی الخیرات کو متقین اور صالحین کی صفات میں گنایا گیا ہے۔

وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ الَّذِينَ يُنفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ

اور سبقت کرو اپنے رب کی مغفرت کی طرف اور اس جنت کی طرف جس کا عرض آسمانوں اور زمین کے عرض کی طرح ہے، اور ان متقیوں کے لیے تیار کی گئی ہے جو فراخی اور تنگی ہر حال میں راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں غصہ کو پی جانے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں اور اللہ محسنوں کو دوست رکھتا ہے

اس آیت میں متقیوں کی خاص صفات یہ بیان کی گئی ہیں کہ وہ یسر و عسر ہر حال میں لوگوں کے حقوق ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور دشمنوں کے لیے بھی ان کے اندر رحم و شفقت اور عفو و درگزر ہے۔

إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدتُّم مِّنَ الْمُشْرِكِينَ ثُمَّ لَمْ يَنقُصُوكُمْ شَيْئًا وَلَمْ يُظَاهِرُوا عَلَيْكُمْ أَحَدًا فَأَتِمُّوا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَىٰ مُدَّتِهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ (۴- توبہ)

مگر وہ لوگ جن سے تم نے معاہدہ کیا ہے مشرکین میں سے پھر انھوں نے کوئی کمی نہیں کی اور تمہارے خلاف کسی کی مدد نہیں کی تو ان کے عہد کو ان کی مدت تک پورا کرو اللہ متقیوں کو دوست رکھتا ہے۔

اس آیت میں عہد کی پابندی کرنے والوں کو متقی اور محبوب خدا کہا گیا ہے۔

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ (۸۳- قصص)

یہ دار آخرت ہم ان لوگوں کے لیے خاص کریں گے جو زمین میں تکبر نہیں کرتے اور فساد نہیں مچاتے اور انجام کار کی کامیابی متقیوں کے لیے ہے۔

اس آیت میں ان لوگوں کو متقی کہا گیا ہے جو خدا کی زمین میں خدا کے قانون کی پیروی کرتے ہیں اور اس میں فساد نہیں مچاتے یعنی خدا کے قانون کو درہم برہم نہیں کرتے

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ آخِذِينَ مَا آتَاهُمْ رَبُّهُمْ إِنَّهُمْ كَانُوا قَبْلَ ذَٰلِكَ مُحْسِنِينَ كَانُوا قَلِيلًا مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ وَبِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ

متقی لوگ باغوں اور چشموں کے بیچ میں ہوں گے سرفراز ان نعمتوں سے جو ان کے رب نے بخشی ہوں گی۔ بے شک وہ لوگ اس سے پہلے محسن تھے، راتوں میں کم سوتے تھے اور صبح کو استغفار کرتے تھے اور ان کے مالوں میں سائل اور محروم کا حق تھا۔

اس آیت میں متقیوں کی صفات یہ گنائی گئی ہیں کہ تہجد پڑھتے ہیں صبح کو استغفار کرتے ہیں اپنے مالوں میں سے سائلوں اور محروموں کا حق نکالتے ہیں۔

تقویٰ، اتقا، متقی کی جو حقیقت قرآن مجید نے بیان کی ہے وہ ایک گونہ ترتیب کے ساتھ ہم نے پیش کر دی ہے اس پر ایک نظر ڈال کر ہر شخص باسانی اندازہ کر سکتا ہے کہ تقویٰ کے جو لوازم آج سمجھ لیے گئے ہیں ان کو اس تقویٰ سے کوئی نسبت نہیں ہے جس کا مطالبہ قرآن مجید نے کیا ہے۔ قرآنی تقویٰ کو رہبانیت، جوگ، برہمچریہ، تقشف، ترک لذات، اور ترک دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے کام وہی ہیں جو شریعت میں بتائے گئے ہیں اس کے حصول کا طریقہ صرف یہ ہے کہ آدمی پوری خداترسی اور خوف آخرت کے ساتھ زندگی کے ہر شعبہ میں حدود اللہ کی نگرانی کرے، راتوں کو جاگ کر خدا سے حق پر قائم رہنے کی توفیق طلب کرے، اور صبح کو اپنی کوتاہیوں پر استغفار کرے۔ اس کے لیے نہ کسی نسبت کی ضرورت ہے، نہ کسی مافوق ریاضت کی نہ شریعت کے احکام کے سوا کسی اور فن کی تحصیل کی نہ خدا کی توفیق کے سوا کسی کی نظر کیمیا اثر کی۔ خدا کا جو بندہ اپنی زندگی کے تمام شعبوں میں خدا کے احکام کی پابندی کی کوشش کرتا ہے وہ متقی ہے اگرچہ اس کے اندر ان علامتوں اور خصائص میں سے کوئی ایک بات بھی موجود نہ ہو جو اس زمانہ کے ارباب تقویٰ نے متقی بننے کے لیے ضروری قرار دی ہیں۔ اور جن کو اس قدر اہمیت دیدی گئی ہے کہ ان کے آگے خود شریعت کے احکام و مطالبات بالکل دب کے رہ گئے ہیں۔

جماعتِ اسلامی کے پہلے کل ہند اجتماع کی روداد

اخبار کوثر لاہور کے ذریعہ سے اعلان کیا گیا تھا کہ دارالاسلام (پٹھان کوٹ، پنجاب) میں ۶، ۷، ۸ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۴ھ (مطابق ۱۹، ۲۰، ۲۱ اپریل ۱۹۴۵ء) کو بروز جمعرات، جمعہ، ہفتہ کل ہندوستان کے ارکان جماعت اسلامی کا اجتماع منعقد ہوگا جس میں تمام ارکانِ جماعت کو شریک ہونا چاہیے الا یہ کہ کسی کو کوئی عذر شرعی مانع ہو۔ نیز یہ کہ اگر ہمدردان جماعت میں سے بھی کوئی حضرات ہمارے کام کا قریبی مطالعہ کرنا چاہیں تو تشریف لا سکتے ہیں۔ چنانچہ ۱۸ اپریل ۱۹۴۵ء کی رات تک بیشتر ارکان اور ہمدرد تشریف لے آئے اور باقی ۱۹ اپریل کی صبح کی گاڑی اور بسوں سے پہنچ گئے۔ شرکاء اجتماع کی جملہ تعداد آٹھ سو سے زیادہ تھی۔ ٹھہرنے کا انتظام مقامی مسجد، دفاتر، دوسری عمارات اور کچھ کیمپوں اور سائبانوں میں تھا۔ مجمع کی کثرت کے پیش نظر لاؤڈ سپیکر اور عارضی طور پر بجلی کی روشنی کا بھی انتظام کر دیا گیا تھا۔

اجلاس اول

۶ جمادی الاول ۱۳۶۴ھ مطابق ۱۹ اپریل ۱۹۴۵ء بروز جمعرات بعد نماز ظہر

حسب پروگرام امیر جماعت کی طرف سے قیم جماعت نے حاضرین سے درخواست کی کہ وہ مسجد دارالاسلام میں جمع ہو جائیں تاکہ پروگرام کے مطابق اجتماع کی کارروائی شروع ہو۔ چند ہی منٹ بعد سب لوگ مجمع کے وسط میں منبر پر بیٹھے ہوئے امیر جماعت کے قبول پر نظر جمائے ہمہ تن گوش بنے بیٹھے تھے اور اس ایک ہزار کے مجمع میں چاروں طرف بالکل سناٹا تھا۔

امیر جماعت اٹھے اور خطبہ مسنونہ کے بعد اپنی افتتاحی تقریر سے اجتماع کا آغاز فرمایا۔

امیر جماعت کی افتتاحی تقریر

حمد و ثنا کے بعد: دوستو اور رفیقو! آپ کو غالباً یاد ہوگا کہ جس اجتماع میں جماعت کی تشکیل کی گئی تھی اس میں یہ اعلان بھی کیا گیا تھا کہ جماعت کا اجتماع عام ہر سال کیا جاتا رہے گا، لیکن محض اس وجہ سے کہ جنگی حالات نے مجبور کر دیا تھا گذشتہ پونے چار سال سے ہم کوئی اجتماع عام نہ کر سکے۔ اگرچہ اس دوران میں حلقہ وار اجتماعات کیے جاتے رہے اور ان کی رپورٹیں بھی شائع ہوتی رہیں جن سے ایک بڑی حد تک جماعت کو زندگی کی وہ حرکت اور عمل کے لیے وہ روشنی ملتی رہی جس کے لیے اجتماع عام کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اجتماع عام بہرحال ضروری تھا اور حلقہ وار اجتماعات اس کی جگہ نہیں لے سکتے تھے۔ اسی وجہ سے مجھے آخر کار یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ جنگی مشکلات خواہ کتنی ہی ہوں اور لوگوں کو دور دراز سے آنے میں خواہ کتنی ہی زحمتیں برداشت کرنی پڑیں اب یہ اجتماع ضرور منعقد ہو جانا چاہیے۔ میں آپ حضرات کا بہت شکر گذار ہوں کہ آپ میری طرف سے دعوت کی ایک ہی صدا سن کر ہندوستان کے مختلف گوشوں سے موجودہ زمانے کے پرصعوبت سفر کی تکلیفیں برداشت کرتے ہوئے یہاں جمع ہو گئے۔ اس طرح میری آواز پر لبیک کہہ کر آپ نے میری

طاقت میں بھی اضافہ کیا اور اپنی طاقت میں بھی۔ ایسا نہ کرتے تو میں اپنی جگہ کمزور ہو جاتا اور آپ اپنی ۔ اور نتیجہ یہ ہوتا کہ ہماری یہ تحریک جو ایک بہت بڑے عزم کا اظہار ہے، خود بخود ٹھٹھر کر رہ جاتی۔ آپ جب کسی شخص کو کسی مقصد عظیم کے لیے خود اپنا امیر بناتے ہیں تو اس کی اطاعت کر کے در اصل اپنی ہی طاقت کو مضبوط کرتے ہیں۔ جس قدر زیادہ آپ کے اندر انانیت و خود پسندی ہوگی اور جتنی کم اطاعت کا اظہار آپ سے ہوگا اتنا ہی آپ کا اپنا بنایا ہوا امیر کمزور ہوگا اور اسی قدر اس کی کمزوری کی وجہ سے آپ کی جماعتی طاقت ضعیف ہوگی، اور اس کے برعکس جس قدر زیادہ آپ کے قلب و دماغ پر اپنے مقصد کا عشق حاوی ہوگا اور اس عشق میں جتنا زیادہ آپ اپنی خودی کو فنا کریں گے اور جتنی زیادہ اپنے مقصد کی خاطر اطاعت امر کا صدور آپ سے ہوگا اسی قدر زیادہ آپ کا مرکز قوی ہوگا اور آپ کی جماعتی طاقت زبردست ہوگی۔ میں یہ دیکھ کر اکثر اپنی جگہ خوش ہوتا ہوں کہ ہماری اس جماعت میں شخصیت پرستی اور ذہنی غلامی موجود نہیں ہے بلکہ ہر شخص کے اندر اچھی خاصی نقادانہ نظر موجود ہے، اور سب سے بڑھ کر آپ کی تنقیدی نگاہیں خود میرے اوپر پڑتی ہیں۔ لیکن یہ خیال رکھیے کہ جتنی کڑی تنقیدی نگاہ آپ مجھ پر ڈالتے ہیں اور آپ کا فرض ہے کہ ایسا کریں اتنی ہی کڑی تنقیدی نگاہ میں بھی آپ پر ڈالتا ہوں اور میرا بھی یہ فرض ہے کہ ایسا کروں۔ آپ سے امر کی اطاعت اور ضابطے کی پابندی اور رضاکارانہ خدمت کی ادائیگی میں جتنی کمزوری ظاہر ہوتی ہے اتنا ہی میں اپنے آپ کو بے بس پاتا ہوں اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں ایسی بندوقوں سے کام لے رہا ہوں جو لبلبی دبانے پر بھی فائر نہیں کرتیں۔ اور ظاہر ہے کہ ایسے ہتھیاروں کو لے کر کون ایسا نادان ہوگا جو کسی بڑے اقدام کا ارادہ کر بیٹھے۔ برعکس اس کے جب میں آپ کے اندر اطاعت اور تطوع اور باضابطگی کے اوصاف پاتا ہوں اور یہ دیکھتا ہوں کہ ایک آواز پر آپ جمع کیے جا سکتے ہیں، ایک اشارے پر آپ حرکت کر سکتے ہیں اور خود اپنے دل کی لگن سے آپ اس کام کو کرتے رہتے ہیں جو آپ کے سپرد کیا جائے تو میرا دل قوی اور میری ہمت بلند ہونے لگتی ہے اور میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ اب مجھے وہ طاقت حاصل ہو رہی ہے جس سے میں اس مقصد عظیم کے لیے کچھ زیادہ کام کر سکوں۔

اب میں اس افتتاحی خطاب میں وہ چند باتیں مختصر طور پر آپ سے کہہ دینا چاہتا ہوں جنھیں آغاز میں بیان کرنے کی ضرورت ہے:

(۱) آپ کے اجتماعات میں خواہ کتنا ہی بڑا مجمع ہو مگر خیال رکھیے کہ بھیڑ اور ہڑبونگ اور شور و ہنگامہ کی کیفیت کبھی رونما نہ ہونی چاہیے۔ اگرچہ اس طرح کی کوئی چیز ابھی تک میں نے محسوس نہیں کی ہے مگر پھر بھی آپ کو اس طرف توجہ دلانے کی ضرورت ہے۔ جو کام ہم نے اپنے ہاتھ میں لیا ہے، یعنی اخلاقی اصولوں پر دنیا کی اصلاح کرنا اور دنیا کے نظم کو درست کرنا۔ اس کا تقاضا ہے کہ اخلاقی حیثیت سے ہم اپنے آپ کو دنیا کا صالح ترین گروہ ثابت کر دکھائیں۔ جس طرح ہمیں دنیا کے موجودہ بگاڑ پر تنقید کرنے کا حق ہے اسی طرح دنیا کو بھی یہ دیکھنے کا حق ہے کہ ہم انفرادی طور پر اور اجتماعی طور پر کیسے رہتے ہیں، کیا برتاؤ کرتے ہیں، کس طرح جمع ہوتے ہیں اور کس طرح اپنے اجتماعات کا انتظام کرتے ہیں؟ اگر دنیا نے دیکھا کہ ہمارے اجتماعات میں بدنظمی ہے، ہمارے مجمعوں میں انتشار اور شور و غل ہوتا ہے، ہمارے رہنے اور بیٹھنے کی جگہیں بدسلیقگی کا منظر پیش کرتی ہیں، جہاں ہم کھانے بیٹھتے ہیں وہاں آس پاس کا سارا ماحول غلیظ اور گندہ ہو جاتا ہے اور جہاں ہم مشورے کے لیے جمع ہوتے ہیں وہاں ٹھٹھے اور مذاق اور قہقہے اور جھگڑے برپا ہوتے ہیں اور بے قاعدہ حرکات کی نمائش ہوتی ہے تو دنیا ہم سے اور ہمارے ہاتھوں ہونے والی "اصلاح" سے خدا کی پناہ مانگے گی اور یہ محسوس کرے گی کہ اگر کہیں زمین کا انتظام ان لوگوں کے ہاتھ میں آگیا تو یہ ساری زمین کو ویسا ہی کر کے چھوڑیں

جیسے یہ خود ہیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنے اجتماعات کے دوران میں نظم، باقاعدگی، سنجیدگی و وقار، صفائی و طہارت اور حسن اخلاق اور خوش سلیقگی کا ایسا مکمل مظاہرہ کریں جو دنیا میں نمونہ بن سکے۔ آپ کے ہاں خواہ ہزاروں آدمی جمع ہوں لیکن کوئی شور و غل برپا نہ ہونے پائے کسی طرف غلاظت اور گندگی نہ پھیلے، کسی قسم کے نزاعات اور جھگڑے نہ برپا ہوں، کہیں بھیڑ اور بدنظمی کی کیفیت نظر نہ آئے۔ ایک منظم گروہ کی طرح اٹھیے اور بیٹھیے اور کھائیے اور جمع ہوجیے اور منتشر ہو جائیے۔ آپ میں سے جن لوگوں نے حدیث کا مطالعہ کیا ہے انھوں نے دیکھا ہوگا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لحاظ سے اپنی جماعت کو کتنا سنجیدہ، باوقار، مہذب اور منضبط بنایا تھا اور اسلامی جماعت کے پھیلنے اور چھا جانے میں اس کیفیت کا کتنا بڑا دخل تھا۔ ایک طرف مشرکین عرب کا یہ حال تھا کہ ان کا ایک چھوٹا سا دستہ بھی اگر کسی علاقے سے گذر جاتا تھا تو شور محشر برپا ہو جاتا، دوسری طرف صحابۂ کرام کا یہ حال تھا کہ ان کے بڑے سے بڑے لشکر بھی منزلوں پر منزلیں طے کرتے چلے جاتے تھے اور کوئی ہنگامہ برپا نہ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ جہاد میں صحابہ کرام نے صورت حال سے متاثر ہو کر اللہ اکبر کے نعرے بلند کیے تو حضور نے فرمایا کہ جس کو تم پکار رہے ہو وہ بہرہ نہیں ہے۔ یہی باوقار رویہ تھا جس کی تربیت دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب فتح مکہ کے موقع پر دس ہزار کا لشکر لے کر چلے تو اہل مکہ کو اس وقت تک کانوں کان آپ کے آنے کی خبر نہ ہوسکی جب تک کہ آپ نے خود ہی ان کے عین سر پر پہنچ کر آگیں روشن کرنے کا حکم نہ دیا۔ اسی روش کی تقلید ہمیں بھی کرنی چاہیے اور ہمارے اجتماعات میں بھی زیادہ سے زیادہ اسی شان کی جھلک نظر آنی چاہیے۔

(۲) دوسری بات جو میں آپ کے اجتماعات کی خصوصیت دیکھنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جہاں آپ جمع ہوں وہاں دیانت و امانت بالکل ایک محسوس و مشہود شکل میں نظر آنی چاہیے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہاں کسی شخص کو اپنے سامان کی حفاظت کے لیے کسی اہتمام کی ضرورت پیش نہ آئے۔ جس کا مال اور سامان جہاں رکھا ہو وہاں بغیر کسی نگراں اور محافظ اور قفل اور کنجی کے محفوظ پڑا رہے۔ کسی کی چیز جہاں گری ہو وہیں وہ اس کو آکر پالے۔ اور اگر کہیں کوئی دکان یا اسٹال ہو تو فروخت کنندہ کے بغیر اس کا مال ٹھیک ٹھیک فروخت ہو، جو شخص کوئی چیز لے وہ ٹھیک حساب سے اس کی قیمت وہیں رکھ دے خواہ بیچنے والا وہاں موجود ہو یا نہ ہو۔

(۳) تیسری بات آپ کی جماعت کے منصب امارت سے متعلق ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب جماعت بنی تھی اور آپ نے مجھے امیر منتخب کیا تھا تو میں نے آپ کے مطالبے کے بغیر خود یہ وعدہ کیا تھا کہ ہر اجتماع عام میں میں یہ اعلان کرتا رہوں گا کہ اگر اب آپ کو کوئی مجھ سے اہل تر آدمی مل گیا ہو تو میں جگہ خالی کرنے کے لیے تیار ہوں، آپ اس کو امیر منتخب کر لیں۔ چونکہ اس کے بعد کوئی اجتماع عام منعقد نہ ہوا اس لیے میں اپنے اس وعدے کو بھی پورا نہ کر سکا۔ آج یہ پہلا اجتماع ہے اور میں اپنے وعدے کے مطابق یہ اعلان کرتا ہوں۔ میں یہ تو ضرور چاہتا ہوں کہ کوئی دوسرا شخص اس منصب کو سنبھالے اور میں اس کی اطاعت کر کے بتاؤں کہ امیر کی اطاعت کس طرح کرنی چاہیے۔ مگر میرے اس اعلان کے معنی یہ نہ لیے جائیں کہ میں خود پیچھے ہٹ رہا ہوں اور اس کام کو انجام دینے سے جی چرانا چاہتا ہوں۔ میرا مدعا صرف یہ ہے کہ نہ میں اس منصب کا خواہشمند ہوں، نہ کسی اہل تر آدمی کے آنے میں مانع ہوں اور نہ اپنی ذات کو اس تحریک کی ترقی اور اس جماعت کی بہتری کی راہ میں روڑا بنانا چاہتا ہوں۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا اور آج بھی کہتا ہوں کہ اگر کوئی اس کام کو انجام دینے کے لیے آگے نہ بڑھے گا تو میں بڑھوں گا اور اپنی نااہلی کے جاننے کے باوجود اس کے لیے تیار نہیں ہوں کہ نہ میں کام کروں اور نہ کوئی اور۔ لہٰذا جب تک مجھے خود کوئی اہل تر آدمی نہیں ملتا اور جب تک آپ بھی کسی موزوں تر آدمی کو نہیں پاتے اس وقت تک میں اس کام کو کرتا رہوں گا اور خواہ مجھے کیسی ہی زحمتیں اور تکلیفیں اٹھانی پڑیں بہرحال اس جھنڈے کو میں خود اپنے ہاتھ سے نہ چھوڑوں گا۔

اس کے ساتھ میں یہ اعلان بھی کر دینا چاہتا ہوں کہ پچھلے تین سال کے دوران میں اگر کسی کو مجھ سے کوئی شکایت پیدا ہوئی ہو، کسی کا حق ادا کرنے میں یا کسی کے ساتھ انصاف کرنے میں مجھ سے کوئی کوتاہی ہوئی ہو یا کسی نے میرے کام میں کوئی غلطی پائی ہو تو بے تکلف اس کا اظہار کرے، خواہ شخصی طور پر میرے سامنے، خواہ پوری جماعت کے سامنے۔ میں کسی شکایت کے پیش ہونے میں کوئی رکاوٹ ڈالوں گا، نہ اپنی کسی غلطی یا قصور کے اعتراف میں مجھے کوئی باک ہوگا اور نہ اپنی اصلاح میں یا کسی جائز شکایت کی تلافی میں ذرہ برابر تامل کروں گا۔ البتہ اگر کوئی شکایت کسی غلط فہمی پر مبنی ہوگی تو اسے صاف کر دوں گا تاکہ اس کام میں میرے اور رفقاء جماعت کے درمیان تکدر باقی نہ رہے۔"

اس افتتاحی تقریر کے بعد امیر جماعت نے قیم جماعت کو اپنی رپورٹ پیش کرنے کا حکم دیا اور انھوں نے تشکیل جماعت سے لے کر اس اجتماع تک کی روداد جماعت پیش کی جو درج ذیل ہے۔

رُوداد جماعتِ اسلامی از ابتدائے تشکیل جماعت تا ۱۶ راپریل ۴۵ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ الکریم۔

امیر جماعت، رفقاء محترم اور معزز حاضرین! آپ کو معلوم ہے کہ ہمارا نصب العین اور واحد مقصد زندگی اس دنیا میں حکومت الٰہیہ کے قیام کی سعی اور آخرت میں رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی انفرادی یا اجتماعی، سیاسی یا تمدنی، معاشی یا کسی دوسری حیثیت میں بھی سوائے اپنے رب اور الٰہ واحد کے اور کسی کا بندہ بن کر نہ رہے بلکہ اپنی پوری کی پوری زندگی اور اس کے سارے معاملات اطاعت الٰہی میں دیدے اور ساتھ ہی ساتھ دوسرے انسانوں کو بھی یہی راہ عملاً اختیار کرنے کے لیے آمادہ کرے، کیونکہ بندگی کا تقاضا یہی ہے اور دنیا میں امن و سلامتی اور آخرت میں فوز و کامیابی کی یہی ایک واحد راہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کہ ہم وہی مقصد اور وہ دعوت لے کر اٹھے ہیں جو آدم علیہ السلام سے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء کرام لیکر دنیا میں تشریف لاتے رہے ہیں۔ اس راہ کو ہم نے کسی بدعت پسندی یا محض ایک نئی تحریک چلانے کے لیے اختیار نہیں کیا بلکہ اس لیے کیا ہے کہ اللہ کی الوہیت (لا الٰہ الا اللہ) اور محمدؐ کی رسالت (محمد رسول اللہ) کے اقرار کے معنی ہی اس راہ کو عملاً اختیار کر کے چل پڑنے کے ہیں۔ کلمۂ طیبہ کا اقرار اور اقامت دین کی جدوجہد سے انحراف ایک دوسرے کی عین ضد ہیں۔

اس دعوت کو عملاً لے کر اٹھنے، اسے اپنے دوسرے بھائیوں تک پہنچانے اور اس سے متاثر حضرات کو سمیٹنے اور جذب کرنے کا صحیح اور بہترین طریقہ یقیناً وہی ہو سکتا ہے جو ابتدا سے آخر تک اس دعوت کے اصل علمبردار یعنی انبیاء کرام اللہ تعالیٰ کی رہنمائی میں اختیار کرتے رہے۔ قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ وہ طریقہ ایک ہی ہے اور وہی ایک طریقہ بلا استثناء ہر زمانے میں اختیار کیا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ اسی طریقہ کار کو ہم نے اختیار کیا ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ اس ایک دعوت اور طریق کار کے علاوہ دوسری تمام دعوتیں اور طریقہائے کار سراسر باطل ہیں۔ ہم اپنے عمل کے لحاظ سے تو کسی بلندی و بزرگی کے مقام پر فائز ہونے کا دعویٰ نہیں رکھتے، مگر اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ ہم اپنی اس دعوت، اس کے مقتضیات و مطالبات اور اس کے طریق کار کے لیے انبیاء علیہم السلام

ہی کی پیروی و قائم مقامی کرنے کا داعیہ رکھتے ہیں اور ہمارا مسلک یہی ہے کہ ان تمام امور میں اپنے عقل و فہم کی حد تک ہر معاملے اور ہر مرحلے پر کتاب و سنت ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ان چیزوں میں سے کسی پر پورا نہ اترنا ہماری بشری کمزوری، کم علمی اور نادانی کا نتیجہ تو ہو سکتا ہے لیکن دیدہ دلیری، ڈھٹائی، تعصب اور خدا و رسول کے سوا کسی غیر کی عقیدت مندی کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے جماعت کے اندر اور باہر سب انسانوں پر ہم اپنا یہ حق سمجھتے ہیں کہ اگر وہ ہم میں یا ہم میں سے کسی میں کوئی کجی یا قابل اعتراض بات پائیں یا محسوس کریں تو اسے فتنے کا ذریعہ بنانے کے بجائے خاموشی کے ساتھ بلا مبالغہ اور بلا طعن و تشنیع اپنے کمزور بھائی یا بھائیوں پر اس کو واضح کر دیں اور برادرانہ نرمی اور ہمدردی سے اسے دور کرنے کی کوشش کریں۔ اَلْمُسْلِمُ مِرْآۃُ الْمُسْلِمِ کا یہی مطلب ہے۔

ہماری اس دعوت اور طریق کار کا یہ فطری تقاضا ہے کہ اس میں دکھاوے یا نمائش یا مبالغے کی کوئی جھلک بھی نہ پائی جائے کیونکہ یہ چیزیں عمل صالح کو اسی طرح ضائع کر دیتی ہیں جس طرح دودھ کو کھٹائی ضائع کر دیتی ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں ریا اور نمائش کے جذبات سے محفوظ رکھے۔ اس کے علاوہ چونکہ اس زمانہ میں نمائش اور مبالغہ اور مظاہرہ تقریباً ہر تحریک کے اٹھانے اور چلانے کا لازمی ذریعہ بن گئے ہیں اور ماحول کے اس ہمہ گیر اثر سے ہمارے رفقاء کا متاثر ہونا بعید نہیں ہے اس لیے بھی ہم اس سلسلے میں بہت زیادہ محتاط رہتے ہیں اور اپنے اجتماعات تک کی کارروائیوں کو بلا اشد ضرورت کے شائع نہیں کرتے اور وہ بھی صرف اپنے ارکان اور ہمدردوں ہی کے درمیان محدود رکھتے ہیں۔

لیکن یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ اگر ارکان اور ہمدردانِ جماعت تحریک کی رفتار سے وقتاً فوقتاً مطلع نہ ہوتے رہیں تو ایک عام جمود، بددلی اور مایوسی طاری ہو جانے کا قوی احتمال پیدا ہو جاتا ہے خصوصاً اس مرحلے پر جبکہ جماعت اور ارکان سب کے سب ابتدائی حالت میں ہیں، نظام باطل اپنے پورے قہر و غلبہ کے ساتھ پوری دنیا پر مسلط ہے اور ہمارے ارباب علم و فضل کا وہ مختصر اور منتشر گروہ بھی، جسے اس عالم گیر تاریکی کے زمانہ میں امتِ وَسط اور شہداء اللہ کے فرائض سرانجام دینے چاہیے تھے، دعوت حق میں شریک ہونے کے بجائے اہل باطل اور فساق و فجار کی قیادت و رہنمائی میں نہ صرف اپنے جان و مال اور دل و دماغ کی قوتیں ہی ضائع کر رہا ہے بلکہ عامۃ المسلمین کی گمراہی و ضلالت اور فسق و فجور کا بار بھی اپنے سر پر لے رہا ہے۔ اگر ارکان جماعت اور ہمدردوں کو وقتاً فوقتاً تحریک کی رفتار سے باخبر نہ کیا جاتا رہے تو وہ ایسا محسوس کرنے لگتے ہیں کہ شاید جماعت میں کچھ ہو ہی نہیں رہا ہے اور اس سے ایک عام سرد مہری اور افسردگی چھا جاتی ہے۔ اس لیے اجتماعات کے مواقع پر ارکان اور ہمدردانِ جماعت کو کام کی رفتار سے آگاہ کرنا ضروری ہے۔ اس سے صرف یہی فائدہ نہیں کہ مرکز سے دور رہنے والے رفقاء جماعت کی کارروائیوں سے مطلع ہو جاتے ہیں بلکہ یہ فائدہ بھی ہوتا ہے کہ رفقاء اور ہمدردوں کو ہمارے کام پر تنقید کرنے کا موقع ملتا ہے اور ہمیں ان کے نیک اور مفید مشوروں سے مستفید ہونے کا۔ چنانچہ اسی مقصد کے لیے اب میں تشکیل جماعت سے اب تک کی جماعت کے کام کی مختصر رپورٹ پیش کرتا ہوں کیونکہ تشکیل جماعت کے بعد پوری جماعت کا یہ پہلا ہی اجتماع عام منعقد ہو رہا ہے۔

تشکیل جماعت

”جماعت اسلامی“ کی تشکیل ۳ شعبان ۱۳۶۰ھ مطابق ۲۶ اگست ۱۹۴۱ء کو ہوئی اس کے متعلق مفصل معلومات ”روداد جماعت اسلامی“ حصہ اول میں موجود ہیں۔ تشکیل جماعت کے وقت اس میں شریک ہونے والے حضرات کی کل تعداد صرف ۷۵ تھی۔ دو تین سال کے اندر ہی یہ تعداد بڑھتے بڑھتے ساڑھے سات سو تک پہنچ گئی۔ لیکن شعبہ تنظیم کے باقاعدہ قائم نہ ہو سکنے کی وجہ سے ارکان اور مرکز

کے درمیان کسی خاطر خواہ ربط کا انتظام نہ ہو سکا اور نہ ہی امیر جماعت یا دوسرے ذمہ دار کارکنوں کو ارکان کی جانچ پڑتال اور نگرانی کے کوئی تسلی بخش ذرائع میسر آ سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے ایسے لوگ جماعت میں شریک ہو گئے جن کو اب ہم غالباً اپنے قریبی ہمدردوں میں بھی شریک نہ کر سکیں۔

شعبۂ تنظیم" قائم نہ ہو سکنے کی وجہ ایک تو کارکنوں کی قلت تھی اور دوسرے جماعت کی مالی حالت کی کمزوری۔ تقریباً انہی دو وجوہ سے یہ سلسلہ اسی طرح پونے تین سال تک چلتا رہا۔ آخر کار گذشتہ سال جب ۲۶، ۲۷ مارچ ۱۹۴۴ء کو صوبہ پنجاب، سندھ، سرحد، کشمیر اور بلوچستان کے ارکان جماعت کا اجتماع یہاں دار الاسلام میں منعقد ہوا تو شعبۂ تنظیم کے باقاعدہ قیام کی ضرورت کو مختلف جماعتوں اور ارکان کی طرف سے بڑے زور سے پیش کیا گیا اور امیر جماعت نے بھی فرمایا کہ وہ اس ضرورت کو ابتدا ہی سے محسوس کر رہے ہیں۔ چنانچہ یہ تجویز منظور ہو کر شعبۂ تنظیم کے باقاعدہ قیام کا فیصلہ ہو گیا اور ۱۷ اپریل ۱۹۴۴ء کو یہ شعبہ عملاً قائم کر دیا گیا۔

مقامی جماعتوں اور ارکان کی تعداد

شعبۂ تنظیم کے قیام کے وقت سارے ملک میں مقامی جماعتوں کی تعداد ۷۳ تھی جن میں سے چھ جماعتیں جماعتی نقطۂ نظر سے صفر ہو چکی تھیں اور انھیں بعد میں ختم ہی کر دینا پڑا۔ ملک کے مختلف حصوں میں ارکان کی تعداد اندازاً سات سو پچاس تھی، مگر ان کے باقاعدہ اندراج کا کوئی انتظام نہ تھا۔ نیز ان جماعتوں اور منفرد ارکان میں کافی تعداد ایسے لوگوں کی بھی بھرتی ہو گئی تھی جنھوں نے محض جماعت کے لٹریچر کی پسندیدگی یا محض نصب العین سے نظری اتفاق ہی کو رکنیت کے لیے کافی سمجھ رکھا تھا، یا پھر جنھوں نے اس سے کچھ زائد بھی سمجھا تھا تو وہ مرکز کے ساتھ ربط کا کوئی مستقل ذریعہ نہ ہونے کی وجہ سے سرد پڑتے پڑتے بالکل ابتدائی سطح پر پہنچ گئے تھے۔
شعبۂ تنظیم کے قائم ہونے پر مقامی جماعتوں اور ارکان کی جانچ پڑتال شروع ہوئی۔ چنانچہ ایک سال کی مسلسل کاٹ چھانٹ کے بعد اب ارکان کی مجموعی تعداد ساڑھے چار سو سے بھی کم رہ گئی ہے، اور ابھی اس چھانٹ کا سلسلہ جاری ہے۔ بعض جماعتوں کو بھی ان کی سرد مہری اور کم سے کم جماعتی اوصاف اور معیارِ کارکردگی سے نیچے گر جانے کی وجہ سے توڑ دینا پڑا۔ الحمد للہ کہ اس کے باوجود مقامی جماعتوں کی تعداد ۷۳ سے بڑھ کر ۱۰۳ ہو گئی ہے۔

یہ سب ہم نے اس لیے کیا کہ ہمارے پیش نظر کوئی بھیڑ جمع کر کے دوسروں کو مرعوب کرنا یا کسی کونسل یا کارپوریشن میں اپنی نشستوں میں اضافہ کروانا نہیں ہے بلکہ کچھ ایسے مردانِ کار تیار کرنا ہے جو اہل دنیا کو مسلمانوں کی طرح جینا اور مرنا سکھا سکیں اور ان بزرگوں اور عوام کو جو یہ کہتے ہیں کہ اس زمانے میں اسلامی نظام زندگی ممکن العمل نہیں ہے، بتا دیں کہ نظام اسلامی ہمیشہ کی طرح اب بھی ممکن العمل ہے صرف عزم اور ایمان کی ضرورت ہے۔

یقین رکھیے کہ جس قسم کے کارکن ہم تیار کرنا چاہتے ہیں اور جس قسم کی تربیت ان کے لیے ضروری ہے اس کے لیے یہ تعداد بھی بہت زیادہ ہے اور اپنے موجودہ ذرائع اور سٹاف کے ساتھ ہم اس تعداد ارکان کے ساتھ بھی وہ ربط اور قریبی تعلق پیدا نہیں کر سکتے جو اس بارے میں ہونا چاہیے۔ ہمیں تو اپنے علال خور سے لے کر امیر جماعت تک سب کے سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے اور ایک ہی جنون رکھنے والے کارکن درکار ہیں، اس لیے ہمیں بہت احتیاط سے ارکان کو لینا اور جماعت میں رکھنا ہے۔
یہ ضرور ہے کہ جو لوگ ہم سے ایک مرتبہ وابستہ ہو جائیں ہم آخری حد تک اور پوری ہمدردی اور برادرانہ شفقت کے ساتھ ان کو اپنے

ساتھ لگائے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کی کمزوریوں اور خامیوں کو بھی تا حدِ امکان حکیمانہ طور پر دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن جب یہ معلوم ہو جائے کہ اب اصلاح کی توقع نہیں رہی یا وہ کم سے کم معیارِ رکنیتِ جماعت سے بھی نیچے گر گئے ہیں تو ہم انھیں اسی حسرت و تکلیف کے ساتھ الگ کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جس طرح کسی عضوِ جسمانی کے سڑ جانے پر باقی جسم کی حفاظت و بقا کے لیے ہر ہوشمند انسان اسے کٹوا دینے پر راضی ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں بھی ہمارا قاعدہ یہ ہے کہ ہم ایسے اصحاب کو از خود علیحدگی اختیار کرنے کا مشورہ دیتے ہیں اور اب تک تقریباً سارے کے سارے لوگ اسی طریقہ سے الگ ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں سے شاذ ہی کوئی ایسا ہو جسے اپنی خامی یا کمزوری کا احساس نہ ہو اور رکنیت سے علیحدگی اختیار کرنے کے باوجود اب ہمارے قریبی حلقۂ ہمدرداں میں شامل نہ ہو۔

مقامی جماعتوں اور ارکان کی عام حالت

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے ارکان کی موجودہ تعداد سوا چار سو[425] اور ساڑھے چار سو[450] کے درمیان ہے اور جماعتوں کی کل تعداد ترپن[53] ہے۔ ان میں سے نصف سے زائد ارکان اور جماعتیں اس درجہ پختہ ہیں کہ کسی نہ کسی حد تک وہ خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکتے ہیں اور اگر ہمیں انھیں چھوڑ دیا جائے تو وہ خود بخود اپنی ذمہ داری پر کام کرتے رہتے ہیں، لیکن پھر بھی وہ معیارِ مطلوب سے ابھی بہت دور ہیں اور توقع نہیں کہ ان میں سے کوئی بھی پاور ہاؤس تو کیا ایک سب اسٹیشن کا کام بھی دے سکے۔ ہر رکن اور جماعت کو زیادہ سے زیادہ اس طرف توجہ کرنی چاہیے کہ وہ اپنی جگہ پر خود کافی (self sufficient) ہو کر کام کر سکے۔

اب کیسے لوگوں کو اور کس طرح جماعت میں شریک کیا جاتا ہے؟

تحریک کے اس مرحلے پر ہمارے پیشِ نظر ایسے لوگوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو اپنے ارکان اور ہمدردوں میں جذب کر لینا ہے جو صحیح معنوں میں سوسائٹی کا مکھن (Cream of The society) کہلا سکتے ہوں ــــ مادی یا دنیاوی وجاہت کے لحاظ سے نہیں بلکہ دینی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے۔ اس وقت ہمیں خاص طور پر ایسے لوگوں کی تلاش ہے جو خدیجۃ الکبریٰؓ اور صدیقِ اکبرؓ کی طرح اس دعوتِ حق کو سنیں اور سراپا اس میں شریک ہو جائیں گویا کہ اب تک اسی کی وہ تلاش میں تھے۔

چنانچہ اب کسی کو جماعت میں شریک کرنے سے پہلے حسبِ ذیل امور کے متعلق خاص طور پر تسلی کر لینے کی کوشش کی جاتی ہے۔

(۱) یہ کہ انھوں نے ہماری دعوت اور اس کے طریقِ کار کو اور دوسری دعوتوں کو جو ہندوستان میں چل رہی ہیں اور ان کے طریقِ کار کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے اور وہ ان دونوں کے فرق کو سمجھ کر ہماری طرف کھنچ رہے ہیں۔

(۲) یہ کہ انھوں نے ہماری دعوت سے متاثر ہو کر اخلاقی اور دینی حیثیت سے کوئی نمایاں ترقی کی ہے اور ان کی عملی زندگی پر اس کا نقش صاف طور پر محسوس ہوتا ہے۔

(۳) یہ کہ اس معاملے میں ان کا رویہ (Attitude) منفعلانہ (Passive) نہ ہو بلکہ فاعلانہ (Active) ہو اور وہ اس دعوت کا کام کرنے کے لیے عملاً بے چین نظر آتے ہوں۔

ان چیزوں کا اطمینان کر لینے کے بعد بھی عموماً کئی کئی ماہ ان کو امیدواری کی حالت میں رکھا جاتا ہے اور ان سے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو رکنِ جماعت سمجھتے ہوئے کچھ مدت تک کام کریں۔ اس طرح ان کا کام دیکھنے کے بعد ان کو رکن بنانے کا فیصلہ کیا جاتا ہے تاکہ اگر ان کا تاثر محض وقتی اور ہنگامی ہو تو وہ جماعت کے اندر آ کر اس کے نظم کو خراب نہ کریں۔

یہی طریقہ ہمارے مقامی ارکان اور جماعتوں کو بھی اختیار کرنا چاہیے۔

ارکان اور ہمدردوں سے کام لینے کا طریقہ

اس وقت ہمارا سارے کا سارا کام رضاکارانہ ہو رہا ہے یعنی کسی سے کوئی کام حکماً نہیں کروایا جاتا بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ ایک شخص اس دعوت سے اپنے دلی لگاؤ کی بنا پر تجدید ایمان سے اپنے اوپر عائد شدہ ذمہ داریوں کے احساس سے مجبور ہو کر کیا اور کس قدر کام کرتا ہے۔ البتہ بلاواسطہ (indirect) طریق سے مقتضیات ایمان کو اُجاگر کرنے اور ادائے شہادت کی ذمہ داریوں کا شعور پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔ اس طریقے کے بہت سے فائدے ہیں۔ اوّلاً یہ کہ اس سے کارکنوں کے اندر غلامانہ ذہنیت کے بجائے داعیانہ جذبات پرورش پاتے ہیں جو ہر انقلابی تحریک کے علمبرداروں کے لیے اساسی اہمیت رکھتے ہیں اگر کسی ایسی تحریک کے کارکنوں میں یہ پیدا نہ ہوں تو اس کا کامیاب ہونا تو درکنار زیادہ عرصہ زندہ رہنا بھی ممکن نہیں۔ ثانیاً یہ کہ اس سے ارکان اور ہمدردوں میں اخلاقی اور ذہنی تغیر کی رفتار ہر وقت معلوم ہوتی رہتی ہے اور امیر جماعت کو جماعت کی صحیح قوت اور صلاحیت کا ہر آن ٹھیک اندازہ رہتا ہے۔ ثالثاً یہ کہ اس سے مختلف ارکان کی درجہ بندی اور ان کی دعوت سے وابستگی کے اندازہ کے لیے کسی لمبی چوڑی تحقیقات کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ اس بارے میں سارے مدوجزر مسلسل سامنے آتے رہتے ہیں۔

اپنے ہمدردوں کی ہمدردی کا اندازہ بھی ہم ان کے زبانی دعووں سے نہیں بلکہ دعوت کے لیے ان کے کام اور جان، مال اور وقت کے ایثار سے ہی کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کو اپنے "مسلمان" ہونے کا شعور ہو جائے اور وہ جان لے کہ انبیاء علیہم السلام کا جانشین ہونے کی حیثیت سے دعوت حق کو لوگوں تک پہنچانے کی کتنی بڑی ذمہ داری اس کے سر پر ہے اس کے لیے آرام سے بیٹھ رہنا ممکن ہی نہیں رہتا۔ اور جو اس کے بعد بھی بیٹھا رہتا ہے وہ خود ہی اپنا بے شعور یا ناکارہ ہونا ثابت کر دیتا ہے۔

جماعت کا حلقۂ اثر

ہماری آواز پنجاب کے تقریباً ہر گوشہ میں پہنچ گئی ہے حیدرآباد (دکن)، اور مدراس کے بیشتر علاقوں میں اور یوپی اور بہار کے متعدد علاقوں پہنچ چکی ہے۔ ان کے بعد بمبئی، سندھ، اور صوبہ سرحد کا نمبر آتا ہے۔ صوبہ بنگال میں اب کلکتہ اور اس کے مضافات میں کچھ لٹریچر جانے لگا ہے۔ کلکتہ میں اب تاجران کتب بھی ہمارا لٹریچر منگوا رہے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عام پبلک میں اس کی مانگ پیدا ہو رہی ہے۔ اڑیسہ، وسط ہند، آسام اور بلوچستان میں اس وقت تک ہمارا کام تقریباً صفر کے برابر ہے۔ کہیں کہیں کوئی شخص اکا دکا کوئی کتاب یا رسالہ منگوا لیتا ہے ورنہ بحیثیت مجموعی یہ سب علاقے ہماری دعوت کے لحاظ سے تاحال بالکل بنجر ہیں۔

بنگال، سندھ، اور جنوبی ہند میں سب سے بڑی رکاوٹ زبان کی ہے کہ ان صوبوں میں اردو زبان جاری نہیں اور ان کی زبانوں میں ہم اب تک لٹریچر تیار نہیں کر سکے۔

اب جماعت کی طرف کیسے لوگ کھنچ رہے ہیں؟

جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے سنجیدہ اور سلیم الطبع لوگ بہت تیزی سے ہماری دعوت اور جماعت کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں اور ان میں سے جتنے لوگ بھی اب تک نکلے ہیں وہ بہت پختہ اور کارآمد ثابت ہو رہے ہیں۔ عربی درسگاہوں کے لوگ بھی اگرچہ اب ہماری طرف توجہ کرنے لگے ہیں لیکن ان میں سے ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو کسی نہ کسی کی عقیدت میں پھنسی ہوئی ہے اور ہر بات

کو برحق تسلیم کر لینے کے باوجود کسی حضرت صاحب میں اٹک کر رہ جاتی ہے۔ یہ چیز بھی میں نے اس ایک سال کے تنظیمی کام میں محسوس کی ہے کہ جس قدر جلدی اور آسانی سے یہ دعوت ایک جدید تعلیم یافتہ آدمی کو، جو طاغوتی نظام کے چکر میں پھنس کر بالکل چکرا گیا ہو، اپیل کرتی اور اپنے اندر جذب کر لیتی ہے اس سے کئی گنا زیادہ دشواری عربی خواں حضرات کو اسے محض سمجھانے میں پیش آتی ہے، بلکہ ہمارے بعض دوستوں کو تو یہاں تک تجربہ ہوا ہے کہ دیہاتی کسانوں کے سامنے اس دعوت کو پیش کیا گیا اور وہ فوراً ہی اس کے انتہائی مقتضیات اور مطالبات کو پاگئے، لیکن اچھے اچھے ذی علم اصحاب قال اقول کے چکر ہی میں پڑے رہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے عربی خواں بھائی ایک تو براہ راست قرآن و حدیث سے دین اخذ کرنے کے بجائے بعض مخصوص رجال سے اپنا دین لینے کے خوگر بنا دیے گئے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ساری کی ساری گروہی عصبیتوں اور شخصی عقیدتوں کو عین تقاضائے دینداری بنا کر اس طرح ان کے ذہن نشین کر دیا جاتا ہے کہ اس کے بعد وہ اپنے حلقے سے باہر کسی دینداری کے قائل ہی نہیں رہتے۔ اس کے برعکس جدید تعلیم یافتہ طبقہ اپنی ساری برائیوں اور مغرب زدگی کے باوجود یہ خوبی ضرور رکھتا ہے کہ بات کہنے والے منہ کے ساتھ ساتھ بات کے الفاظ و معانی پر بھی غور کرتا ہے اور پھر جب متوجہ ہوتا ہے تو اس یقین کے ساتھ کہ پہلے اس کے پاس جو کچھ تھا وہ غیر اسلام ہی تھا اور اب اسے اپنی پہلی زندگی کی عمارت کو سرتاپا اکھاڑ کر نئی بنیادوں پر تعمیر کرنا ہے۔

ہماری دعوت کے متعلق غیر مسلم حضرات کا تاثر

غیر مسلم اقوام میں اگرچہ ابھی ہم کوئی باقاعدہ کام کرنے کا انتظام نہیں کر سکے لیکن تھوڑا بہت لٹریچر جو اپنے زور سے ان کے اندر گھس رہا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر ہم صحیح طریق پر کام کرتے رہے تو ان شاء اللہ وہ تعصب جو غیر مسلموں اور مسلمانوں کے درمیان ایک مدت دراز تک دنیاوی اور مادی اغراض کے لیے کشمکش برپا رہنے سے پیدا ہو گیا ہے، ہماری راہ میں زیادہ حائل نہیں ہو سکے گا۔ اس امر میں تو اب کوئی شبہ نہیں رہا ہے کہ پوری دنیا اس وقت موجودہ نظام زندگی سے بری طرح بیزار ہو چکی ہے اور اپنے مصائب اور مادہ پرستی سے پیدا شدہ پیچیدگیوں کے حل کی تلاش میں بے تابی سے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ اس وقت اگر ہم کچھ صالح لوگوں کا ایسا جتھا تیار کرنے میں کامیاب ہو جائیں جو صحیح معنوں میں حق پرست اور خدا ترس بھی ہو اور دوسری طرف دنیا کے نظام کو چلانے کی صلاحیت اور قابلیت بھی موجودہ کارپردازوں سے بڑھ کر رکھتا ہو تو دنیا کو ان کی رہنمائی اور قیادت قبول کیے بغیر چارہ نہ ہوگا۔

ہمارا یہ ذاتی تجربہ ہے کہ جب بھی یہ دعوت عام لوگوں کے سامنے (خواہ وہ پیدائشی مسلمان ہوں یا غیر متعصب اور آزاد خیال غیر مسلم) صاف اور واضح الفاظ میں پیش کی گئی تو سب نے بے اختیار اس کے حق ہونے کا اعتراف کیا اور جیسا کہ قرآن کریم نے حق و ہدایت کو "ذکر" یعنی یاد دہانی کے نام سے موسوم کیا ہے۔ ان سب مواقع پر ہماری یہ دعوت سب سلیم الفطرت لوگوں کے لیے فی الواقع ان کے اپنے دل کی آواز اور ایک جانی بوجھی لیکن بھولی ہوئی حقیقت معلوم ہوئی۔ بلکہ غیر مسلم حضرات میں سے بعض ایسے بھی ملے جنھوں نے یہاں تک کہا کہ اے کاش ہندوستان میں یہی اسلام پیش کیا گیا ہوتا اور مسلمان اس پر چلے ہوتے تو آج ہندوستان کا کوئی دوسرا ہی نقشہ ہوتا۔ اور پھر انھوں نے ہمیں یہ بھی یقین دلایا کہ اگر آپ اپنی دعوت میں واقعی ثابت قدم رہے اور آپ نے ثابت کر دیا کہ آپ صرف حق پرست ہیں اور آپ کی اس سے کوئی ذاتی یا قومی غرض نہیں ہے تو موجودہ مسلمانوں

سے بڑھکر غیر مسلم اس میں شریک ہوں گے لیکن قومی اور نسلی تعصبات کی دیواریں گرنے میں وقت ضرور لگے گا۔

میں اپنے ان رفقاء سے جو غیر مسلم حلقوں میں بھی اثر و رسوخ رکھتے ہوں درخواست کروں گا کہ وہ اپنے پڑھے لکھے غیر مسلم بھائیوں میں "پردہ"، "ضبط ولادت"، "جبر و قدر"، "تنقیحات"، "معاشی مسئلہ" اور "سلامتی کا راستہ" وغیرہ کے ذریعے آہستہ آہستہ کام کا آغاز کریں۔

اسی سلسلے میں ہمارے دماغی صلاحیتیں رکھنے والے احباب کو اس امر کی طرف بھی توجہ کرنی چاہیے کہ ہندوستان کی موجودہ تاریخ کو، جو در اصل چند ترک اور افغان بادشاہوں اور ہندو راجاؤں کی باہم ملک گیری اور حصول دنیا کی کشمکش تھی مگر جسے اس طرح پیش کیا گیا ہے جیسے کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی قومی یا ہندو مذہب اور اسلام کی مذہبی جنگوں اور مناقشات کی پردرد داستان ہے، اور گویا کہ یہ ہندو راجہ ہندو مذہب کے تسلط کے لیے اور ترک اور افغان بادشاہ دین حق کی سربلندی اور اسلامی نظام زندگی کے نفاذ کے لیے باہم برسرپیکار رہے ہیں، از سرنو مرتب کیا جائے اور ان نقصانات کو واضح کیا جائے جو صحیح اسلام کی نعمت سے بہرہ ور ہونے کی بدولت ہندوستان کے باشندوں کو اٹھانے پڑے۔

موجودہ سیاسی جماعتوں پر ہماری دعوت کا اثر

ہماری دعوت کا اثر صرف مسلم و غیر مسلم افراد پر ہی نہیں پڑ رہا ہے بلکہ ملک کی پوری سیاسی فضا کسی نہ کسی حد تک اس سے متاثر ہو چکی ہے۔ ملک بھر کے پڑھے لکھے طبقے میں اب تھوڑے ہی ایسے لوگ ہوں گے جو "حکومت الٰہیہ" "قیام دین کی جدوجہد" "اسلامی نظام حیات" "اسلام ایک کمل اور مستقل نظام زندگی ہے" وغیرہ الفاظ اور فقروں سے مانوس نہ ہوں۔ مسلمانوں میں تو یہ دعوت اس قدر مقبول ہو چکی ہے کہ فی الواقع اب ان میں کوئی ایسی تحریک یا جماعت فروغ نہیں پا سکتی جو کم از کم زبان سے قرآنی نظام زندگی کے قیام کو اپنا مقصد نہ بنائے حالانکہ اب سے پانچ چھ برس پہلے تک یہ حالت تھی کہ اس نام کو زبان پر لا کر کوئی شخص سیاسی حلقوں میں مضحکہ بنے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض جماعتوں نے تو خواہ زبانی طور پر ہی سہی، صاف صاف اس مقصد اور نصب العین کو اختیار کرنے کا اعلان کر دیا ہے اور دوسری اس امر پر مجبور ہو گئی ہیں کہ اس طرف اپنے میلان کا اعلان کریں اور مسلمانوں کو یقین دلانے کی کوشش کریں کہ آخرکار ان کے سامنے بھی یہی مقصود ہے۔

ہماری دعوت سے متاثر ہونیوالے احباب میں کس قسم کی اخلاقی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں؟

ہماری دعوت کا پہلا اثر جو اس سے متاثر ہونے والے لوگوں پر پڑتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کی بے مقصد اور اندھے بھینسے کی سی زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور بامقصد اور سنجیدہ زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ انھیں محسوس ہونے لگتا ہے کہ اس سے قبل انھوں نے کس طرح اپنے اصل مقصد زندگی کو بھلا کر حیوانوں کی طرح محض چرنے چگنے پر اپنی ساری مصروفیتوں اور وسائل کو مرتکز کر رکھا تھا۔ انھیں یہ چیز بری طرح کاٹنے لگتی ہے کہ کس طرح انھوں نے اپنی ان تمام قوتوں، قابلیتوں اور ذرائع و وسائل کو جو در اصل دین حق کی خدمت و سربلندی کے لیے عطا کیے گئے تھے خدمت نفس اور غلبۂ طاغوت کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ اس کے بعد ان کا معیار تقویٰ و خدا پرستی بھی سراسر بدل جاتا ہے اور جن لوگوں کی دینداری اور مذہبیت میں اس سے پہلے اونٹ تک نگل جانے سے کوئی فرق واقع نہ ہوتا تھا اس کے بعد ان کے لیے کسی دوسرے کی گز بھر رسی بھی بلا اجازت یا ناحق طور پر لینا ممکن نہیں رہتا۔ اس کے علاوہ دین اور مذہب کا

تصور چند مخصوص مراسم کی حد سے نکل کر پوری زندگی پر چھانے لگتا ہے اور ہر بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے معاملے میں مادی نفع ونقصان سے قطع نظر صرف خدا اور رسول کی پسند اور ناپسند ہی ایک معیار رد وقبول رہ جاتا ہے چنانچہ اب آخرت کی جوابدہی کا خیال ارکان کی زندگی کے ہر شعبے میں غالب آ رہا ہے۔ حال کی بات ہے کہ ہمارے ایک رفیق جو ملازم ہیں ایم۔ اے کی تیاری کر رہے تھے۔ اس تیاری کے دوران میں انھوں نے محسوس کیا کہ ان کے ذہن میں اپنی طاغوتی ملازمت میں ترقی اور بڑے گریڈوں کے خیالات آنے شروع ہو گئے ہیں جو ناجائز اور ایمان کی عین ضد ہیں۔ چنانچہ اس اللہ کے بندے نے اسی بنا پر امتحان کا خیال ہی ترک کر دیا کہ مبادا اس کے بعد شیطان ان پر غلبہ حاصل کر کے کسی فریب میں مبتلا کر دے۔ یہ ایک واقعہ میں نے مثال کے طور پر عرض کیا ہے ورنہ خدا کے فضل سے اب ہمارے ارکان میں صحیح اسلامی تقویٰ پیدا ہو رہا ہے اور وہ اللہ کی مقرر کردہ حدود کی پاسداری کا اہتمام کرنے لگے ہیں۔

نیز جہاں جہاں بھی ہمارا اثر پہنچا ہے اللہ کے فضل سے دین اور دنیا کا فرق مٹتا چلا گیا ہے اور لوگوں کی سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آ گئی ہے کہ اپنے تمام معاملات اور انتظام دنیا کو اللہ اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے طریقے پر چلانے ہی کا نام دین ہے اور قیام دین کی جدوجہد میں دانستہ کوتاہی کرنے کے بعد زہد وتقدس کے سارے مظاہر سراسر لاحاصل ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کے ہاں قطعاً کوئی وزن نہیں رکھتے۔

ہماری راہ کی رکاوٹیں

ہاں۔ ہمیں اس بات سے انکار نہیں کہ جس تیزی اور خوبی سے یہ کام ہونا چاہیے تھا اور اب تک جو کچھ ہونا چاہیے تھا اس کے لحاظ سے ابھی بہت کمی ہے اور کام کی عام رفتار بھی بہت سست ہے لیکن اس کی ذمہ داری اگر ایک طرف کارکنوں کی اپنی کمزوری اور ناتجربہ کاری پر ہے تو دوسری طرف بہت سے ایسے وجوہ بھی ہیں جن پر ابھی تک اللہ تعالیٰ نے ہمیں اختیار نہیں بخشا۔ اپنی کوتاہیوں کے لیے ہم اللہ تعالیٰ سے معافی چاہتے ہیں اور ان کو دور کرنے کی توفیق اور ہمت طلب کرتے ہیں اور جو ہماری دسترس سے باہر ہیں ان پر اختیار کے لیے دعا اور کوشش کرتے ہیں۔

اس بارے میں ہماری سب سے بڑی مشکل اور رکاوٹ مردان کار اور صحیح قسم کے کارکنوں کی کمی ہے۔ دنیا کی سب تحریکیں اور ان کے بڑے سے بڑے کام کرایہ پر کر ڈالے جا سکتے ہیں مگر اس دعوت کا مزاج ہی کچھ اللہ تعالیٰ نے ایسا رکھا ہے کہ جہاں اس میں کرایہ کے آدمی داخل ہوئے وہیں یہ مرجھا گئی۔ ہمارے ارکان اور بیشتر کارکن تقریباً ہر لحاظ سے ابھی ابتدائی حالت میں ہیں اگرچہ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو کافی تیزی سے اصلاح قبول کر رہے ہیں لیکن پھر بھی جس عزم، ہمت، قابلیت، اخلاقی پختگی اور ایمانی قوت کی اس کام کو پروان چڑھانے کے لیے ضرورت ہے ان کے پیدا ہونے میں کافی دیر لگے گی۔ انسان بہرحال انسان ہیں، بدلتے بدلتے ہی بدلیں گے۔ ان کو اینٹ پتھر کی طرح ہتھوڑے مار مار کر فوراً مطلوبہ شکل نہیں دی جا سکتی۔ ایک چھوٹے سے چھوٹے پودے کے پروان چڑھنے اور برگ وبار لانے کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے ایک مدت رکھی ہے۔ اور پھر انسان تو قوانین طبعی کے سامنے مجبور محض ہونے کے بجائے نفسانی خواہشات اور دوسری بشری کمزوریاں اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ جو کار عظیم میرے سپرد کیا گیا ہے اس کے لیے جس علم وحکمت، قابلیت، تجربہ اور معاملہ فہمی کی ضرورت ہے اس کا عشر عشیر بھی میں اپنے اندر نہیں پاتا ہوں۔

بابو یا کسی خان بہادر کی نہیں بلکہ ان اکابر امت کی ہیں جن کے زہد و تقویٰ اور دینداری کا ڈھول پوری دنیا میں پٹ رہا ہے اور جن کی آراء گرامی سے محض دینی امور ہی میں نہیں بلکہ دنیاوی اور سیاسی مسائل تک میں، اختلاف کرنا ان کے معتقدین کے نزدیک کفر سے کم نہیں۔ عوام میں حق پرستی کی روح پیدا کرنے کے بجائے شخصیت پرستی کا مرض پیدا کر دیا گیا ہے اس لیے ہماری دعوت کے متعلق سب سے پہلا سوال یہی پیدا ہوتا ہے کہ ہے تو یہ حق مگر فلاں حضرت صاحب، فلاں شاہ صاحب اور فلاں مولانا صاحب اس میں کیوں شریک نہیں؟ اور اسی طرح مختلف قسم کے شبہات و شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ اگرچہ اس کا بہت بڑا فائدہ یہ ہے کہ جو لوگ دین کو صرف شخصیتوں سے لینے کے قائل ہیں وہ خود بخود چھٹ کر الگ ہو جاتے ہیں اور وہی لوگ ہماری طرف آتے ہیں جو صرف اس عقیدہ اور نصب العین سے محبت رکھتے ہیں۔ مگر اس امر سے پیدا شدہ فتنہ بھی کچھ کم اہم نہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان حضرات کو ہدایت دے اور یہ اپنے منصب کو سمجھیں اور ان کو اس بات کا شعور ہو کہ وہ دین حق کی راہ میں دانستہ یا نادانستہ کتنی بڑی رکاوٹ بن گئے ہیں۔

(۵) ہمارے راستے کی پانچویں رکاوٹ ہمارے بعض رفقاء میں یکسوئی کی کمی ہے جس کی اصل وجہ یہ ہے کہ انھوں نے ابھی تک ہماری دعوت اور اس کے طریق کار اور دوسری دعوتوں کو جو ملک میں چل رہی ہیں اور ان کے طریق ہائے کار کے فرق کو اچھی طرح نہیں سمجھا ہے۔ اسی وجہ سے وہ باوجود جماعت میں منسلک ہو جانے کے بار بار دوسرے قافلوں کی طرف دیکھتے ہیں اور ان کے دل کڑھنے لگتے ہیں کہ دوسری تحریکوں کی عمارت کی طرح یہاں بھی رات بھر میں پوری عمارت کیوں نہیں کھڑی ہو جاتی۔ ان حضرات کو اپنی معلومات وسیع تر کرنا چاہیے اور ٹھنڈے دل سے سوچنے اور کام کرنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔

تحریک کے اس مرحلے پر ہم صاف طور پر واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ

اولاً ہمارے ساتھ وہی حضرات شریک ہوں، اور جو شریک ہو چکے ہیں ان میں سے صرف وہی حضرات شریک رہیں، جو ہمارے اصول اور طریق کار دونوں سے پوری طرح مطمئن ہوں۔

ثانیاً جو ان دونوں کو اچھی طرح سمجھ کر اور ان کی معرفت حاصل کر کے ان میں پوری پوری دلچسپی لینے کے لیے تیار ہوں اور ثالثاً جن کی دلچسپیوں میں انتشار کے بجائے مرکزیت پیدا ہو چکی ہو، یعنی وہ ہر طرف سے توجہ کو ہٹا کر صرف اسی دعوت پر اپنی تمام توجہات اور دلچسپیاں مرتکز کر دیں اور اپنا سب کچھ اسی کام میں لگا دینے کے لیے تیار ہو جائیں۔

کسی تفصیلی بحث میں الجھے بغیر جماعت اسلامی کے کام کی نوعیت اور مسلمانوں کی دوسری جماعتوں کے پیش نظر کاموں کی نوعیت کا فرق چند فقروں میں واضح کر دوں کہ دوسری ساری جماعتیں مسلمان قوم کا کوئی باقاعدہ علاج کرنے کے بجائے اسے محض فسٹ ایڈ (First Aid) پہنچانے میں مشغول ہیں اور یہی کام ان کے لیے سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ حالانکہ ان میں سے بعض کے پاس مکمل علاج کا پورا سامان اور بہترین دواخانے بھی موجود ہیں لیکن وہ کچھ اوپری سی مرہم پٹی کر کے اپنی کارگزاری دکھا دینے کے لیے بیتاب ہیں۔ ان کے برعکس ہم مسلمانوں اور پوری دنیا کا مکمل علاج اسی طریق پر کرنا چاہتے ہیں جس طریق پر اس کے ماہرین فن (انبیائے کرام) آج تک دنیا کی اخلاقی اور اجتماعی بیماریوں کا علاج کرتے رہے ہیں۔ کتاب و سنت کی رو سے اس علاج کے سوا دوسرے سارے علاج لغو اور لاحاصل ہیں اور ان کو دی لوگ

جماعت ابھی اس امر کا انتظام کرنے میں بھی کامیاب نہیں ہو سکی کہ اپنی تجویز کے مطابق مرکز میں تربیت گاہ قائم کرکے ارکان اور کارکنوں کی تربیت کا انتظام کرے۔ اس کی بڑی وجہ یہاں پر جگہ (Accomodation) کی قلت ہے۔ اور پھر چونکہ ہماری جماعت کے اٹھانوے فیصدی ارکان غربا اور متوسط طبقہ کے لوگ ہیں اس لیے اگر ان میں سے کسی کا پورا وقت جماعت کے کام کے لیے لیا جائے تو اس کی کم سے کم ضروریات زندگی کا خرچ برداشت کرنا ضروری ہے جس کی جماعت کے بیت المال میں ابھی گنجائش نہیں۔

(۲) ہمارے راستے کی دوسری بڑی رکاوٹ اس عالمگیر جنگ کی پیدا کردہ مشکلات ہیں جن کی حد یہ ہے کہ تشکیل جماعت کے بعد چار سال میں یہ پہلا اجتماع ہے جس میں سارے ملک کے ارکان اور ہمدردان شامل ہو سکے۔ آپ جانتے ہیں کہ اس وقت تک ہماری دعوت و تبلیغ کی اشاعت کا سب سے بڑا بلکہ واحد ذریعہ جماعت کا لٹریچر ہے مگر اس جنگ کی وجہ سے جو کاغذ کا قحط پڑا تو اس کا بھی ایک عرصہ تک کوئی انتظام نہ ہو سکا اور تقریباً پورا ایک سال بیشتر لٹریچر غیر مطبوع (out of print) رہا۔ اب بھی جو کاغذ مل رہا ہے وہ لٹریچر کی مانگ کے لحاظ سے بہت ناکافی ہے اور جنگ کی ابتدا سے اب تک کوئی ایک دن بھی ایسا نہیں آیا کہ ہمارا پورا لٹریچر بیک وقت موجود ہو سکا ہو۔ لٹریچر کی مانگ کی یہ حالت ہے کہ ہر کتاب ایک بار اگر دس ہزار کی تعداد میں طبع کرائی جائے تو شاید چند ماہ کے لیے کفایت کر سکے۔ کتنی کتابیں ایسی ہیں جو ایک مرتبہ بھی شائع نہیں ہو سکیں حالانکہ ملک کے ہر کونے سے ان کے مطالبے آرہے ہیں۔

ہمارے دوسرے بھی بہت سے ضروری کاموں کو یہ جنگ روکے ہوئے ہے جو معمولی حالت میں اتنی سہولت سے انجام پا گئے ہوتے۔

(۳) ہمارے راستے کی تیسری رکاوٹ ذرائع کی کمی ہے۔ جماعت کی مالی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ اس کا بک ڈپو ہے اور اس وقت تک جماعت کا تقریباً سارا کام اسی کی آمدنی سے چل رہا ہے۔ سو اس کا حال آپ ابھی سن چکے ہیں۔ اعانت اور زکوٰۃ کی آمدنیاں ابھی کچھ زیادہ نہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ حسب دستور ہمارے ارکان قریباً سب کے سب غریب اور متوسط طبقہ ہی سے نکل کر آئے ہیں اور ان کے لیے اس عالمگیر گرانی کے زمانے میں، خصوصاً جبکہ حتی الامکان حرام و حلال ذرائع کا بھی خیال کرنا ہو، اپنی ضروریات زندگی کا کفیل ہونا ہی مشکل ہو رہا ہے چہ جائیکہ وہ بیت المال کے لیے بھی کچھ پس انداز کر سکیں۔ اگرچہ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ابھی ہمارے بیشتر ارکان میں اپنے نصب العین اور عقیدے کے لیے وہ لگن پیدا نہیں ہوئی جو انھیں اس کے لیے ہر بازی کھیل جانے اور ہر مصیبت سہ جانے کے لیے بیتاب کر دے اور وہ اپنے پیٹ کاٹ کر اپنے دین کی کھیتی کو سینچنے لگیں۔

(۴) ہماری چوتھی مشکل جو دلی تکلیف دینے والی بھی ہے ہمارے طبقۂ علما میں سے بعض کا طرز عمل ہے۔ آپ کو یہ معلوم کرکے حیرت ہوگی کہ ہماری تحریک کی کھلی مخالفت بعض علما کے علاوہ اور کسی طرف سے نہیں ہوئی۔ پھر یہ مخالفت بھی کسی عقلی یا نقلی دلیل یا اصولی اختلاف کی بنا پر نہیں بلکہ اس اقرار کے ساتھ ہے کہ نظریہ بالکل صحیح ہے، اسلام کا تقاضا بھی یہی ہے اور دین کا مطالبہ بھی یہی ہے۔ لیکن یہ آجکل قابل عمل نہیں ہے، تحریک کے "مفید و بار آور" ہونے کے لیے ظروف مساعد نہیں ہیں، اور موجودہ حالات میں یہ جو تم پیش کرتے ہو یعنی دین اسلام، ناممکن العمل ہے۔ یہ آواز کسی دیہاتی مسجد کے ملا، کسی مغرب زدہ

اختیار کر سکتے ہیں جو یا تو انبیاء کی تعلیمات سے ناواقف ہیں یا پھر خام کاری ہی کرنا چاہتے ہیں۔

ہمارے ارکان کی انفرادی مشکلات

دعوت اسلامی اور قیام دین کی جدوجہد عملاً شروع کر کے معلوم ہوا کہ جس طرح ابتداء سے آج تک دین حق ایک ہی رہا ہے اسی طرح جاہلیت اور کفر کے مزاج میں بھی ذرہ برابر تغیر نہیں ہوا۔ موجودہ سوسائٹی کے تہذیب و تمدن اور رواداری کے فلک شگاف دعاوی کے باوجود باطل کے لیے حق اسی طرح ناقابل برداشت ہے جس طرح پہلے تھا۔ اگر آپ کہیں یہ پاتے ہیں کہ باطل اپنے غلبہ و تسلط کے باوجود حق کی کچھ ظاہری اشکال کو گوارا کر رہا ہے تو سمجھ لیجیے کہ یہ صرف اس لیے ہے کہ حق نے ایک جسد بے روح اور باطل کے ماتحت تابع مہمل بن کر رہنا قبول کر لیا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بیشتر مقامات پر جہاں ہمارے رفقاء نے واقعی سنجیدگی سے اس دعوت کو قبول کیا اور بندگی رب کو مسجد کی چار دیواری سے باہر اپنے معاملات اور دوسرے مسائل زندگی پر پھیلانا شروع کیا تو اسی سوسائٹی اور خاندان و برادری کو جسے کل تک وہ کھانے میں نمک کی طرح مرغوب و محبوب تھے، پھوڑے میں نشتر کی طرح چبھنے لگے، اور ان کو وہ سب مل کر بزور اپنے سے باہر نکال پھینکنے کے لیے بیتاب ہو گئے۔ یہ صرف ابھی اتنی سی بات پر ہے کہ ہمارے رفقاء نے اب سوسائٹی کی پسند و ناپسند اور مالی منفعت کی کمی و بیشی کے بجائے اللہ اور اس کے رسول کی پسند و ناپسند کو معیار رد و قبول بنا لیا ہے۔ چنانچہ اسی بناء پر بعض والدین نے اپنے اکلوتے جگر گوشوں کو گھر سے باہر کر دیا اور ان کی شکل دیکھنے کی قسمیں کھا لیں۔ بعض بے دین بیٹوں نے اپنے ضعیف اور سفید ریش باپوں کو مار کر گھر سے نکال دیا کہ وہ ان کی فاسقانہ زندگیوں میں مخل ہوتے تھے۔ بعض بے دین شوہروں نے اپنی بے گناہ بیویوں کو معلق کر کے چھوڑ دیا۔ بعض باطل پرست والدین کے بیٹے جب ان کی خواہش کے مطابق خدمت کفر پر آمادہ نہ ہوئے تو ان کو اس پر مجبور کرنے کے لیے ان کی تعلیم و تربیت پر صرف کیے ہوئے روپے کو قرض قرار دے کر تقاضے شروع کر دیے اور آخر کار شادی کے پھندے میں پھنسا کر بے گھر کر دینے کی چالیں چلیں۔ بعض رئیس زادوں کو انھیں کے حقیقی بھائیوں نے ذلت و رسوائی کی آخری حد تک پہنچانے کی کوششیں کیں اور جائداد سے الگ کر دینے کے منصوبے باندھے۔ اور ہمارے بعض ارکان کو صرف اس بنا پر بڑے بڑے نقصانات پہنچانے کی دھمکیاں دی گئیں اور ڈرایا گیا کہ وہ ان ناخدا ترس لوگوں کے بھائیوں اور بیٹوں کی زندگیوں پر اثر انداز ہو رہے ہیں جس کی وجہ سے وہ حرام اموال اور ناجائز آمدنیوں پر بڑھ بڑھ کر ہاتھ مارنے سے احتراز کرنے لگے ہیں۔

یہ چند ایک مثالیں ہیں جن سے آپ اندازہ فرما سکتے ہیں کہ نام نہاد مسلمان قوم دینی حیثیت سے کس درجہ پر ہے اور ان کی نظروں میں دین کی کیا قدر و منزلت ہے۔

مگر صاحبو! مبارک ترین ہے اللہ کا وہ بندہ جس نے اس عالمگیر ضلالت اور گمراہی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں دنیا کو پھر دین حق سے روشناس کرایا اور اس کے قیام کی دعوت دی اور اس دین کو اس نے ایسے مبین اور واضح طریقے سے دنیا کے سامنے کھول کر رکھ دیا کہ اس سے دور بھاگنے والے بھی یہ اقرار کیے بغیر نہ رہ سکے کہ دین کی نعمت اسی شخص سے پائی۔ اور پھر مبارک ہیں آپ اور آپ جیسے دوسرے حضرات جنھوں نے ان غیر موافق بلکہ شدید مخالف حالات میں اس دعوت کو سنا، قبول کیا

اور اسے عملاً نافذ کرنے کے لیے کربستہ ہو گئے۔ اپنے اس فضل اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ اس توفیق پر آپ جس قدر ناز کریں بجا ہے مگر مومن کا ناز شکریہ اور اللہ کی راہ میں مر مٹنے ہی کی شکل میں ظاہر ہوا کرتا ہے۔ یہ اچھی طرح جان لیجیے کہ دعوت حق کا یہی مرحلہ ہے جس میں اس کے لیے خرچ کیا ہوا ایک پیسہ، اس کے لیے بہایا ہوا خون کا ایک قطرہ اور اس کی خاطر آنکھوں میں کاٹی ہوئی ایک رات، بعد کے مراحل میں کیے ہوئے بڑے بڑے اعمال و ایثار سے زیادہ بلندی درجات کا موجب ہو سکتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ صدیق اکبرؓ کی اُس ایک رات کے عوض جو انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غار ثور میں بسر کی تھی عمر فاروقؓ جیسا جلیل القدر اور مقدس انسان اپنی پوری زندگی کے اعمال دینے کی عمر بھر حسرت سے خواہش کرتا رہا۔ ہاں: پھر سن لیجیے کہ دعوت کا یہی دور قرب خداوندی اور اس کے ہاں درجات حاصل کرنے کا ہے ورنہ فتح مکہ کے بعد تو سبھی يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا کا منظر پیش کر دیتے ہیں۔

لٹریچر کی دوسری زبانوں میں اشاعت

اس وقت تک اپنی آواز کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے ہم نے صرف اردو زبان ہی کو ذریعہ بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان تمام علاقوں میں جہاں اردو بولی اور سمجھی نہیں جاتی ہماری دعوت کا کام ہنوز صفر کے ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہی رہی ہے کہ ابتدا سے ابتک اس تحریک اور جماعت کے سارے کام کا بار اور انحصار ہر حیثیت سے امیر جماعت ہی پر رہا ہے اور ظاہر ہے کہ ایک شخص سارے کام نہیں کر سکتا۔ اب دوسری زبانوں میں اس دعوت کو منتقل کرنے کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ اور بہت سی زبانوں میں تو یہ کام عملاً شروع بھی ہو گیا ہے مثلاً

عربی لٹریچر کی تیاری کے لیے مولانا مسعود عالم صاحب ندوی کی قیادت و رہنمائی میں جالندھر میں دار العروبہ کے نام سے عربی ادارہ کی بنیاد رکھ دی گئی ہے اور مولانا اپنی نرابی صحت اور دوسری مجبوریوں کے باوجود اپنے وطن (صوبہ بہار) سے ہجرت فرما کر مستقل طور پر دار العروبہ میں تشریف لے آئے ہیں اور اپنا پورا وقت، توجہ اور محنت اسی کام پر صرف کر رہے ہیں۔ اس بات کا افسوس ہے کہ دار الاسلام کی آب و ہوا انھیں موافق نہ آئی اور ان کے لیے یہاں سے دور دوسری جگہ انتظام کرنا پڑا۔ دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ مولانا کے اس ایثار و سعی کو قبول فرمائے اور ان کو صحت کامل عطا فرمائے۔ آمین

دار العروبہ سے دعوت کے متعلق دوسرے لٹریچر کے علاوہ ایک بلند پایہ عربی ماہوار رسالہ بھی جاری کرنے کی تجویز زیر غور ہے۔

ترکی لٹریچر کی تیاری کا کام یہاں دار الاسلام میں ہمارے برادر عزیز اعظم ہاشمی صاحب مہاجر ترکستانی کر رہے ہیں۔ رسالہ دینیات اور خطبات کا ترجمہ اس وقت تک مکمل ہو چکا ہے۔

ملیالم زبان جو صوبہ مدراس کی بڑی زبانوں میں سے ہے اس میں لٹریچر کو منتقل کرنے کا کام حاجی وی۔ پی محمد علی صاحب مالاباری کے سپرد کیا گیا ہے اور یہ صاحب ابتک رسالہ دینیات، خطبات، اور دو تین دوسری چھوٹی بڑی کتابوں کا ترجمہ مکمل کر چکے ہیں۔ ان کی اشاعت کے لیے جنوبی ہند کی جماعتوں نے مل کر کچھ سرمایہ بھی اکٹھا کر لیا ہے اور ان کتابوں کے طبع کرانے کی دوڑ دھوپ بھی جاری ہے لیکن موجودہ جنگی مشکلات کی وجہ سے ابھی تک اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔

تامل زبان میں دعوت کے کام کے لیے جنوبی ہند کی جماعتوں نے مل کر مولوی شیخ عبداللہ صاحب (ولندا کیمپ) کو منتخب

گیا ہے کہ وہ اس علاقے میں، کہ گجراتی کی یہ زبان ہے، مہارت حاصل کریں۔ اس دوران میں شیخ صاحب کی مناسب ضروریات کی کفالت یہ جماعتیں کریں گی۔ یہ کام شروع ہو چکا ہے یہ اقدام بہت مبارک اور قابلِ تقلید ہے اور انتخاب بھی بہت موزوں ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے کامیاب فرمائے۔

گجراتی زبان جو صوبہ بمبئی کی سب سے بڑی زبان ہے اس میں ہمارے لٹریچر کو منتقل کرنے کا ذمہ ہماری بمبئی کی مقامی جماعت نے اپنے ذمہ لیا ہے۔ انھیں اس کارِ خیر کے لیے ایک بہت مخلص گجراتی ادیب جن کا اسم گرامی بھی اسمٰعیل صاحب اخلاص ہے مل گئے ہیں۔ یہ لوگ ابتک چند ایک خطبات گجراتی میں شائع کر چکے ہیں۔ باقی خطبات اور سیاسی کشمکش کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ اخلاص صاحب اب جماعت میں شریک ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں استقامت بخشے اور اپنے دین کی خدمت پورے اخلاص سے انجام دینے کی توفیق دے۔

ہندی ترجمہ کا کام الٰہ آباد کی جماعت کے سپرد کیا گیا ہے جو یو۔پی کی دوسری جماعتوں کی امداد سے یہ کام کرے گی۔ یہ کام ابھی باقاعدہ شروع نہیں ہوا لیکن امید ہے کہ جلدی ہی کچھ انتظام ہو جائے گا۔ موزوں مترجم کا نہ ملنا سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ "سلامتی کا راستہ" کا ترجمہ کروایا جا چکا ہے۔ لیکن یہ ابھی شائع نہیں ہو سکا۔

سندھی زبان میں لٹریچر کو منتقل کرنے کا ابھی کوئی باقاعدہ انتظام تو نہیں ہو سکا البتہ کچھ ایسے لوگ دستیاب ہو گئے ہیں جو کچھ تربیت کے بعد اس کام کو کر سکیں گے۔ ویسے رسالہ دینیات کی نسبت معلوم ہوا ہے کہ ہمارے علم و اطلاع کے بغیر دو تین سال سے سندھی زبان میں شائع ہو رہا ہے لیکن یہ ترجمہ تسلی بخش نہیں ہے۔

انگریزی زبان میں ایک رکن جماعت کچھ تھوڑا تھوڑا ترجمے کا کام کر رہے ہیں۔ اس وقت "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" کا ترجمہ کیا جا رہا ہے۔ انگریزی ترجمے کے لیے بھی موزوں مترجم کا نہ ملنا ہی بڑی رکاوٹ ہے۔

جماعت کا نیا لٹریچر جو ان دنوں زیرِ طبع ہے۔

جماعت کے لٹریچر کی حسبِ ذیل نئی کتابیں ان دنوں زیرِ طبع ہیں اور انشاء اللہ بہت جلد چھپ کر آجائیں گی۔

(۱) "قرآن مجید کی چار بنیادی اصطلاحیں"۔ یہ امیر جماعت کے ان مضامین پر مشتمل ہے جو اسلام کی اصطلاحات اربعہ یعنی الٰہ، رب، عبادت، دین کے مطلب اور مفہوم کی توضیح میں رسالہ ترجمان القرآن میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ قرآن کی تعلیمات کو سمجھنے کے لیے یہ کتاب اساسی اہمیت رکھتی ہے۔

(۲) "اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر" یہ بھی امیر جماعت کے ایک اہم مضمون پر مشتمل ہے جس کی نوعیت اس کے نام سے ظاہر ہے۔

(۳) "حقیقت توحید" یہ مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کی تازہ تصنیف ہے جو "حقیقت شرک" والے سیٹ کی دوسری کڑی ہے۔

(۴) "دعوت اسلامی اور اس کے مطالبات"۔ یہ کتاب حسب ذیل چیزوں پر مشتمل ہے:۔

ا۔ "دعوت اسلامی اور اس کا طریق کار" یہ امیر جماعت کی وہ تقریر ہے جو اس رپورٹ کے بعد وہ اس اجلاس میں ارشاد فرمائیں گے۔

ب۔ مولانا امین احسن صاحب کی وہ تقریریں جو انھوں نے سیالکوٹ اور الٰہ آباد کے اجتماعات میں عام اجلاس میں ارشاد فرمائی تھیں۔ ان دونوں تقریروں کو ایک کر دیا گیا ہے۔

ج۔ قیم جماعت کا وہ پیغام جو ۱۶؍ جنوری ۱۹۴۵ء کے مطبوعہ "کوثر" میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کتاب میں اسے تقریباً سہ گن کر دیا گیا ہے۔

د۔ مولانا امین احسن صاحب کی وہ تقریر جو انھوں نے الٰہ آباد کے اجتماع میں مستورات کو مخاطب کر کے ارشاد فرمائی۔

صوبوں میں الگ الگ قیموں کا تقرر

چونکہ ایک آدمی کے لیے مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے کہ پورے ملک میں تنظیم کے کام کو سنبھال سکے، خصوصاً جبکہ وہ خود ابتدائی حالت میں ہو، ہاتھ بٹانے کے لیے ایک بھی امدادی آدمی نہ ہو اور ارکان جماعت مسلسل توجہ کے محتاج ہوں۔ اس لیے دور دراز علاقوں کے لیے الگ الگ قیم مقرر کرنے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ صوبہ بہار کے لیے سید محمد حسنین صاحب جامعی کو قیم مقرر کر دیا گیا ہے اور وہ موجودہ حالات اور وسائل و ذرائع کے لحاظ سے تسلی بخش کام کر رہے ہیں۔ یو۔پی کے لیے بھی الگ قیم جماعت مقرر کرنے کا فیصلہ ہو چکا ہے لیکن ابھی تک موزوں آدمی کا انتخاب نہیں ہو سکا۔ اس اجتماع میں اس فیصلہ کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی جائے گی۔ اسی طرح جنوبی ہند کے لیے بھی الگ قیم جماعت مقرر کرنے کا فیصلہ ہو چکا ہے اور وہاں کے ارکان نے متفقہ طور پر مولانا سید صبغۃ اللہ صاحب بختیاری کو اس کام کے لیے منتخب کیا ہے۔ لیکن ان سب نے مگر اس امر کی طرف بھی مرکز کی توجہ منعطف کرائی ہے کہ یہ کام باقاعدہ ان کے سپرد کرنے سے پہلے ان کو کچھ عرصہ یہاں رہنے کا موقع دیا جائے تاکہ وہ اپنے کام اور فرائض اور ذمہ داریوں کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ سردست وہ اپنی موجودہ مصروفیتوں کی وجہ سے شعبان ۱۳۶۴ھ تک یہاں نہیں آ سکتے اور فی الحال مکانات کی قلت کی وجہ سے ہم بھی اس حال میں نہیں ہیں کہ ان کی رہائش کا یہاں انتظام کر سکیں۔ اس لیے یہ معاملہ چند ماہ کے لیے ابھی ملتوی رہے گا۔

صوبائی قیموں کے فرائض حسب ذیل مقرر کیے گئے ہیں:۔

(۱) اپنے حلقہ کے ارکان اور جماعتوں میں نظم قائم رکھیں اور تحریک کو تازہ رکھنے اور آگے بڑھانے کے لیے ان کو اکساتے رہیں۔

(۲) اپنے حلقہ کے ارکان اور جماعتوں کے ساتھ مسلسل ربط قائم رکھیں، ان کی کارروائیوں سے باخبر رہیں اور مرکز کو اپنے حلقے کے حالات سے باخبر رکھیں۔

(۳) ارکان میں حرکت پیدا کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً اپنے حلقہ میں دورے کرتے رہیں اور جہاں کہیں جماعت کے نظم میں خرابی پیدا ہو رہی ہو وہاں بروقت موقع پر پہنچ کر حالات کی اصلاح کریں۔

صوبائی قیموں کے حلقوں کی جماعتوں اور منفرد ارکان کے فرائض حسب ذیل ہوں گے:۔

(۱) اپنے حلقہ کے قیم کے ساتھ پورا پورا تعاون کرنا اور اپنی کارروائیوں کی ماہوار رپورٹیں قیم حلقہ کو بھیجتے رہنا تاکہ وہ بروقت اپنے حلقہ کی رپورٹ مرکز میں روانہ کر سکے۔

(۲) ان اہم امور کی اطلاع جو مرکز سے متعلق ہوں یا مرکز کے قابل توجہ ہوں، مرکز کو بھیجتے رہنا۔

(۳) جہاں کہیں بدنظمی یا عدم دلچسپی کی کوئی صورت رونما ہوتی نظر آئے اس کی اطلاع فوراً قیم حلقہ اور مرکز کو

بھیجنا تاکہ اس کا بروقت تدارک ہو سکے۔
(۱۰) حلقہ کی جماعتوں اور ارکان کو اپنے قیم کی مناسب ضروریات کی حد تک اس کے مصارف کا انتظام کرنا ہوگا۔ سفر کے مصارف تو بہرحال ان کو برداشت کرنے ہیں۔

قیم کے انتخاب میں جن اوصاف کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے وہ یہ ہیں:۔

(۱) وہ فعال آدمی (Active) ہو۔

(۲) سنجیدہ متین، سمجھدار اور معاملہ فہم ہو۔

(۳) تنظیم کے کام کو سرانجام دینے کی اپنے اندر صلاحیت رکھتا ہو۔

مقام شکر ہے اور میں یہ بیان کرتے ہوئے خوشی محسوس کرتا ہوں کہ شعبۂ تنظیم کے قیام اور اس کی توسیع کے بعد تنظیم کا کام کافی حد تک ضبط میں آگیا ہے۔ اس کے بعد جتنے ارکان جماعت میں لیے گئے ہیں اور جس قدر نئی جماعتوں کی تشکیل کی گئی ہے تقریباً سب پختہ ہیں اور ان کا کام تسلی بخش ہے۔ چند مقامات کے علاوہ ہر جگہ سے ماہواری رپورٹیں باقاعدگی سے آرہی ہیں۔ مگر اس کے باوجود میں ضروری سمجھتا ہوں کہ دستور جماعت کی دفعات نمبر ۴، ۵، ۶، ۷، اور ۱۰ کی طرف آپ کو توجہ دلاؤں۔ ان دفعات میں جو امور ذکر کیے گئے ہیں وہ اس قدر اہم ہیں کہ سب ارکان کو انھیں وقتاً فوقتاً دیکھتے رہنا چاہیے اور ان کی روشنی میں اپنے ایمان و عمل کا محاسبہ کرنا چاہیے تاکہ ایسا نہ ہو کہ نقض عہد کرکے نہ صرف صاحب امر سے بلکہ خدا اور اس کے رسول کے ساتھ بھی غدر و خیانت کے مرتکب ہوں۔

اس کے علاوہ یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ بعض مقامی جماعتوں کے ارکان مقامی امیر کو صدر انجمن سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ ان کو سمجھ لینا چاہیے کہ جب انھوں نے اپنے میں سے ایک آدمی کو اہل تر سمجھ کر صاحب امر منتخب کیا ہے تو ان پر واجب ہے کہ معروف میں اس کی اطاعت کریں اور اس کی نافرمانی کو گناہ جانیں۔ اس بارے میں کہ ارکان اور صاحب امر کے باہم تعلقات اور حقوق و ذمہ داریاں کیا ہونی چاہئیں امیر جماعت کی وہ تقریر جو انھوں نے تشکیل جماعت کے وقت یہ بار گراں سنبھالتے وقت ارشاد فرمائی تھی بہت ہی اہم ہے۔ اس تقریر کا متعلقہ (Relevant) حصہ روداد جماعت حصہ اول کے صفحہ نمبر ۱۷ آخری سطر سے صفحہ نمبر ۱۹ وسط صفحہ تک قابل توجہ ہے۔ اس کا گہرا مطالعہ فرما کر آئندہ اپنے تعلقات مذکورہ تقریر کی بیان کردہ بنیادوں پر قائم کیجیے۔

درسگاہ دارالاسلام کا قیام

اگرچہ یہ کام مولانا امین احسن صاحب اصلاحی اور غازی عبدالجبار صاحب کا تھا کہ درسگاہ دارالاسلام کے قیام میں تاخیر کے وجوہ بیان کریں کیونکہ وہی حضرات اس کام کے انچارج ہیں لیکن چونکہ اس تاخیر کی بیشتر ذمہ داری جماعت اور کچھ دوسرے امور پر ہے اس لیے اصلاحی صاحب اور غازی صاحب کے بجائے مجھے ہی اس بارے میں جوابدہی کرنی چاہیے۔

ظاہر ہے کہ درسگاہ کے قیام کے لیے باقاعدہ پختہ عمارت نہ سہی بہرحال وسیع مکانات کی ضرورت ہے اور درسگاہ اور ان کے دارالاقامہ سے بھی پہلے اساتذہ کے کوارٹر موجود ہونے چاہئیں تاکہ وہ یہاں آکر بیٹھیں اور اپنے کام کی تیاری

کریں۔ عمارات جو ہمارے پاس اس وقت موجود ہیں وہ ہمارے موجودہ مقامی کارکنوں کے لیے بھی کافی نہیں۔ مزید تعمیر کے راستے میں جو رکاوٹیں پیش آ رہی ہیں ان میں پھر

(۱) سب سے پہلی اور بڑی رکاوٹ کسی موزوں آدمی کا نہ ملنا ہے جو ہماری تعمیری اسکیم کو اپنے ہاتھ میں لے سکے۔ اس کے لیے ہمیں ایسا آدمی درکار ہے جو تعمیر کے کام کو خوب اچھی طرح سمجھتا ہو، ہم سے اور جماعت سے ہمدردی رکھتا ہو، تجربہ کار، منتظم اور دیانتدار ہو، اور اس کام کو عملاً سرانجام دینے کی قابلیت اور صلاحیت رکھتا ہو تاکہ ہم اس پر اس معاملے میں آنکھیں بند کر کے اعتماد کر سکیں اور وہ اپنی ذمہ داری پر اس کام کو سنبھال سکے۔

(۲) اس کے علاوہ دوسری وجہ مسالہ اور دوسرے سامان تعمیر کی شدید گرانی اور پھر گرانی کے باوجود اس کا نایاب ہونا ہے ہم نے خیال کیا تھا کہ سردست مستقل پختہ عمارتوں کے بجائے کچھ پھونس کے چھپر وغیرہ ڈال کر کام شروع کر دیا جائے مگر حکومت وقت نے اس پر بھی کنٹرول کر لیا۔

(۳) درسگاہ کے قیام کے راستے میں تیسری رکاوٹ سرمایے کی قلت ہے۔ اس بارے میں اول تو ہمارے ذرائع و وسائل ابھی محدود ہیں، دوسرے جیسا کہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں ہمارے ارکان اور ہمدرد جن کے تعاون و اعانت سے ہم اس کام کو سرانجام دینا چاہتے ہیں بیشتر غریب اور متوسط طبقہ کے لوگ ہیں جن کے لیے اس موجودہ گرانی کے زمانے میں اپنی ضروریات زندگی بھی ٹھیک طور سے فراہم کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ اور تیسرے ابھی دراصل ان میں اپنے نصب العین اور مقصد زندگی سے حقیقتاً وہ لگاؤ بھی پیدا نہیں ہوا ہے جو اس کے لیے انھیں ہر قربانی کر جانے پر بے تاب کر دے۔

نیز جن طریقوں اور ذرائع سے عام طور پر دوسرے لوگ اور ادارے سرمایہ فراہم کیا کرتے ہیں ان طریقوں اور ذرائع سے روپیہ فراہم کرنا تو درکنار ہم تو عام پبلک اپیل اور ضرورت کے عام اشتہار کو بھی اپنے مسلک اور طریق کار کے منافی سمجھتے ہیں اور حد یہ ہے کہ اپنے ارکان جماعت تک پر بھی کوئی باضابطہ چندہ عائد کرنا اس کام کو کرنے کی صحیح شکل نہیں سمجھتے۔ ہم دینے والے سے اس کے روپے سے پہلے اس کا دل اس کام کے لیے لینا چاہتے ہیں تاکہ جو کچھ اس کی جیب سے نکلے وہ اس کے دلی جذبہ، دینی لگاؤ اور للہیت کا نتیجہ ہو کہ ایسا ہی سرمایہ فی الحقیقت اس خون صالح کا کام دے سکتا ہے جو ایک صحیح دینی درسگاہ کی رگوں میں جاری ہونا چاہیے اور اسی سے پھر یہ توقع بھی کی جا سکے گی کہ ایسے حق پرست اور خدا ترس انسان پیدا کرے جو بس ایک رب العلمین ہی کے بندے ہوں۔

اس بارے میں ہمارا طریقہ یہ ہے کہ اپنی ضروریات کو اپنے ارکان اور ہمدردوں کے سامنے رکھ دیتے ہیں، اس کے بعد پھر ہر شخص کی اپنی محبت دین، وسعت قلب اور فراخیٔ وسائل پر موقوف ہے کہ وہ صدیق اکبرؓ کی طرح اپنا سوئی سلائی تک کل اثاثہ راہ حق میں لا ڈھیر کرے، یا عمر فاروقؓ کی مانند اپنی ہر چھوٹی بڑی چیز کا نصف اپنے رب کی راہ میں نثار کر دے یا چاہے تو قارون کی طرح اپنے خزانوں پر سانپ بن کر بیٹھا رہے۔

لیکن اس سرمایہ کی قلت اور وسائل کی کمی کے باوجود مجھے پورا یقین ہے کہ اگر ہمیں کوئی موزوں آدمی مل جائے اور اپنے

دوسرے کاموں کی طرح اس کام کو بھی ہم اللہ کے بھروسے پر شروع کر دیں تو ان شاء اللہ سرمایہ کی وجہ سے یہ کام نہیں رکے گا۔

اسی فراہمی سرمایہ کے سلسلے میں میں اپنے رفقاء اور ہمدردوں کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ اس وقت ہماری آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ، جیسا کہ میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں، ہمارا مکتبہ ہے۔ اس لیے اس کی سخت ضرورت ہے کہ جو جماعتیں یا افراد یہاں سے کتابیں منگواتے ہیں ان کو اپنے حسابات جلدی سے جلدی بے باق کرتے رہنا چاہیے اور مناسب یہ ہے کہ ہر ماہ نئے آرڈر بھیجنے سے پہلے سابقہ حساب صاف کر دیا جائے تاکہ جماعت کے دوسرے کاموں میں بھی حرج نہ ہو۔

مرکزی بیت المال کے حسابات

چونکہ تشکیل جماعت کے بعد پوری جماعت کا یہ پہلا اجتماع ہے اس لیے ۲۶ اگست ۴۱ء سے لے کر ۱۶ اپریل ۴۵ء تک کے حسابات آمد و صرف اس اجلاس میں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ کو جماعت کی مالی قوت اور اس کے مادی وسائل کی رفتار کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو جائے۔

۳ شعبان ۶۰ھ مطابق ۲۶ اگست ۴۱ء کو جس سرمائے اور وسائل سے قیام دین کی اس جدوجہد کی ابتدا کی گئی تھی اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

نقد	قیمت کتب از مکتبہ ترجمان القرآن	واجب الوصول از متفرق آجرائے وخریداران بی مکتبہ ترجمان القرآن
۷۴-۱۴-۰	۶۰۰۰-۰-۰ تقریباً	۱۲۲۷-۱-۶

یہ سرمایہ سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی موجودہ امیر جماعت نے اس کام کی ابتداء کے لیے جماعت کے بیت المال میں منتقل کر دیا۔ بعد کی تفصیلات درج ذیل ہیں:-

تفصیل آمدنی جماعت اسلامی از یکم ستمبر ۱۹۴۱ء تا ۱۶ اپریل ۱۹۴۵ء

ذریعہ آمدنی	یکم ستمبر ۴۱ء تا ۳۱ دسمبر ۴۲ء	سنہ ۴۳ء	سنہ ۴۴ء	از یکم جنوری ۴۵ء تا ۱۶ اپریل ۴۵ء	میزان کل مدوار
فروخت کتب	۷۴۱۳-۱۵-۹	۸۶۳۲-۹-۹	۱۶۷۹۹-۰-۹	۹۷۲۷-۱۵-۳	۴۲۵۷۳-۹-۶
اعانت اہل خیر	۵۹۴۳-۱۲-۹	۲۸۴۵-۳-۶	۸۱۵۹-۳-۶	۲۵۸۳-۱۱-۰	۱۹۵۳۱-۱۵-۹
زکوٰۃ	۶۱۶-۱۰-۳	۱۲۰۳-۵-۰	۲۳۲۰-۱۱-۸	۹۷۷-۱۰-۰	۵۱۱۸-۴-۱۱
قرض	۲۱۴۱-۰-۰	۰-۰-۰	۲۰۰۰-۰-۰	۰-۰-۰	۴۱۴۱-۰-۰
وصولی قرض	۱۵۰-۲-۶	۲۰۲-۰-۰	۴۲۷-۰-۰	۱۳۰-۰-۰	۹۰۹-۲-۶
متفرق	۶۶۴-۱۲-۳	۰-۹-۳	۱۱۳-۳-۷	۵۶-۷-۶	۸۳۵-۱-۷
امانت	۰-۰-۰	۱۰-۸-۰	۰-۰-۰	۰-۰-۰	۱۰-۸-۰
میزان کل سالوار	۱۶۹۳۰-۷-۶	۱۲۸۹۴-۳-۶	۲۹۸۱۹-۳-۶	۱۳۴۷۵-۱۱-۹	۷۳۱۱۹-۱۰-۳
نقد سرمایہ بوقت تشکیل جماعت					۷۴-۱۴-۰
کل آمدنی از تشکیل جماعت تا ۱۶ اپریل ۱۹۴۵ء =					۷۳۱۹۴-۸-۳

تفصیل مصارف جماعت اسلامی از یکم ستمبر سنہ ۱۹۴۱ء تا ۱۶ اپریل سنہ ۱۹۴۵ء

قسم مصارف	از یکم ستمبر سنہ ۴۱ء تا ۳۱ دسمبر سنہ ۴۲ء	سنہ ۴۳	سنہ ۴۴	از یکم جنوری سنہ ۴۵ء تا ۱۶ اپریل سنہ ۴۵ء	میزان کل مدوار
معاوضہ کارکنان	۶۷۴-۰-۰	۱۰۵۴-۱۲-۰	۳۳۷۰-۹-۶	۱۵۰۰-۱۲-۰	۶۶۰۰-۴-۶
طباعت	۵۳۶۵-۱۵-۳	۷۳۰۰-۹-۹	۱۷۴۴۲-۱۵-۶	۵۰۷۰-۱-۰	۳۸۶۰۹-۹-۶
سٹیشنری	۹۸-۴-۶	۳۹-۱۵-۰	۱۷۹-۱-۹	۱۳۷-۱۲-۰	۴۵۵-۱-۳
اشتہار	۲۵-۸-۰	۰-۰-۰	۰-۰-۰	۰-۰-۰	۲۵-۸-۰
سفر خرچ	۲۸۶-۲-۰	۲۳-۹-۰	۷۸۶-۱-۶	۰-۰-۰	۱۳۰۲-۱۲-۶
مہمان خانہ	۴۶۵-۱۳-۶	۸-۱۵-۳	۱۲۵۴-۱۵-۰	۵۷۹-۳-۹	۲۳۰۸-۱۵-۶
پریس	۳۱۳۷-۱-۳	۰-۰-۰	۱۸۷-۱۰-۰	۰-۰-۰	۳۳۲۴-۱۱-۳
قرض	۲۵۹-۲-۶	۳۴۰-۰-۰	۹۷۳-۱۲-۰	۳۵۰-۰-۰	۱۹۲۲-۱۴-۶
ادائے قرض	۱۴۴۳-۰-۰	۱۶۰-۰-۰	۱۲۰۶-۱۰-۹	۲۰۰۰-۰-۰	۴۸۰۹-۱۰-۹
دار العروبہ	۲۰-۰-۰	۰-۰-۰	۰-۰-۰	۳۲۶-۰-۰	۳۴۶-۰-۰
اعانت	۱۵۰-۴-۰	۴۳۴-۲-۳	۸۹۳-۲-۹	۱۳۶-۸-۶	۱۵۷۴-۱-۶
ڈاک خرچ	۵۸۹-۱۰-۶	۵۴۸-۱۳-۰	۷۶۲-۷-۹	۲۴۹-۳-۹	۲۱۵۰-۳-۰
کتب ایجنسی	۱۱۹۵-۰-۰	۱۳۴۳-۱۵-۰	۷۳۷۳-۲-۰	۲۵۷۲-۱۳-۰	۱۲۵۰۵-۱۵-۰
متفرق	۲۵۳-۱۲-۶	۷۲۰-۲-۳	۳۳۷-۳-۳	۵۰-۴-۳	۱۳۶۱-۸-۳
تعلیمی اسکیم	۰-۰-۰	۱۷-۰-۰	۱۹-۸-۰	۲-۱۳-۰	۳۸-۵-۰
فرنیچر	۰-۰-۰	۳۲-۱-۰	۱۰۸-۴-۹	۱۵-۴-۰	۱۵۶-۹-۹
کتب خانہ	۰-۰-۰	۰-۰-۰	۵-۰-۰	۲۳۳-۱-۶	۲۳۸-۱-۶
ترکی ترجمہ	۰-۰-۰	۰-۰-۰	۸۰-۰-۰	۵۰-۰-۰	۱۳۰-۰-۰
تعمیرات	۰-۰-۰	۰-۰-۰	۰-۰-۰	۴۴۲-۸-۶	۴۴۲-۸-۶
میزان کل سالوار	۱۳۹۶۳-۱۱-۰	۵۷۶۳-۰-۶	۳۴۹۴۷-۹-۶	۱۳۷۲۸-۷-۳	۶۸۳۱۲-۱۲-۳

میزان کل آمدنی از یکم ستمبر سنہ ۱۹۴۱ء تا ۱۶ اپریل سنہ ۱۹۴۵ء = ۷۳۱۹۴-۸-۳

میزان کل صرف از " " " " = ۶۸۳۱۲-۱۲-۳

بقایا جو نقد موجود ہے = ۴۸۸۱-۱۲-۰

اس کے علاوہ مکتبۂ جماعت میں اس وقت تقریباً پچیس ہزار روپے کی کتابیں موجود ہیں۔ یہ اعداد و شمار ہیں جن سے ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس ملک کے لوگ ہم سے کس قدر اور کس رفتار سے متاثر ہو رہے ہیں کیونکہ اس عام مادہ پرستی کے زمانے میں ہمارے روکھے پھیکے اور دنیا کے چلتے ہوئے مذاق کے بالکل برعکس لٹریچر کی خریداری کے لیے اور ہمارے بے مزہ کام کی اعانت کے لیے وہی لوگ آتے ہیں جو فی الواقع اس سے دلچسپی اور لگاؤ رکھتے ہیں۔"

قیم جماعت کی رپورٹ کے بعد امیر جماعت نے "دعوتِ اسلامی اور اس کا طریق کار" کے عنوان سے ایک نہایت ہی اہم تقریر فرمائی جس میں اپنی اس دعوت اور اس کے طریق کار پر بہت تفصیل سے اور نہایت مبین طریقے سے روشنی ڈالی اور بتایا کہ کیوں اس ایک راہ اور طریق کار کے سوا دوسری ساری راہیں مسلمانوں کے لیے غلط اور اسلامی نقطۂ نظر سے ناقابلِ قبول ہیں اور وہ اس میں کوتاہی برت کر کس طرح مبادیاتِ دین تک سے دور ہو گئے ہیں۔ اس تقریر میں بہت سے ان اعتراضات اور شکوک کو بھی صاف کیا جو عام طور سے لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ یہ تقریر پہلے ہی نوٹ کرا دی گئی تھی اس لیے لفظ بلفظ درج ذیل ہے۔

دعوت اسلامی اور اس کا طریق کار

حمد و ثنا کے بعد فرمایا:۔

سب سے پہلے میں اس امر پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے ہمیں ایک نہایت خشک دعوت اور نہایت بے مزہ طریق کار کو بالآخر لوگوں کے لیے دلچسپ و خوش ذائقہ بنانے میں توقع سے زیادہ کامیابی عطا کی۔ ہم جس دعوت کو لے کر اٹھے تھے اس سے زیادہ کاسد جنس آج دنیا کی دعوتوں کے بازار میں اور کوئی نہ تھی اور اس کے لیے جو طریق کار ہم نے اختیار کیا اس کے اندر ان چیزوں میں سے کوئی چیز بھی نہ تھی جو آج کل دنیا کی دعوتوں کے پھیلانے میں اور خلق کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں استعمال کی جاتی ہیں۔ نہ جلسے، نہ جلوس، نہ نعرے، نہ جھنڈے، نہ مظاہرے، نہ نمائش، نہ تقریریں نہ وعظ۔ لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں اور یہ دیکھ کر ہمارا دل شکر و سپاس کے جذبے سے لبریز ہو جاتا ہے کہ بندگانِ خدا روز بروز زیادہ کثرت کے ساتھ ہماری اس دعوت کی طرف کھنچ رہے ہیں اور ہمارے بے لطف اجتماعات میں شرکت کے لیے دور دور سے بغیر کسی طلب کے آتے ہیں۔

ہمارے اس اجتماع کا اعلان صرف ایک مرتبہ اخبار کوثر میں شائع ہوا اور اس کے بعد کوئی پروپگنڈا اور کسی قسم کی اشتہار بازی (عام اصطلاح میں جلسہ کو کامیاب بنانے کے لیے) نہیں کی گئی، پھر بھی ایک ہزار اشخاص ہندوستان کے مختلف گوشوں سے یہاں آ کر جمع ہو گئے۔ یہ کشش بہرحال حق ہی کی کشش ہے کیونکہ ہمارے پاس حق کے سوا کوئی اور چیز کھینچنے والی سرے سے ہے ہی نہیں۔

اجتماعات کا مقصد ہمارے ان اجتماعات کا مقصد کوئی مظاہرہ کرنا اور ہنگامہ برپا کر کے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا نہیں ہے۔ ہماری غرض ان سے صرف یہ ہے کہ ہمارے ارکان ایک دوسرے سے متعارف اور مربوط ہوں، ان کے درمیان اجنبیت اور ناآشنائی باقی نہ رہے، وہ ایک دوسرے سے قریب ہوں اور باہمی مشورے سے تعاون کی صورتیں نکالیں اور اپنے کام کو آگے بڑھانے اور مشکلاتِ راہ اور پیش آمدہ مسائل کو حل کرنے کی تدبیریں سوچیں۔ اس کے علاوہ ہمارے پیش نظر ان اجتماعات سے یہ فائدہ بھی ہے کہ ہمیں اپنے کام کا جائزہ لینے اور اس کی کمزوریوں کو سمجھنے اور انہیں دور کرنے کا وقتاً فوقتاً موقع ملتا رہتا ہے۔ نیز جو لوگ ہم سے ہمدردی رکھتے ہیں یا ہمارے خیالات سے متاثر ہیں یا ہمارے کام کے متعلق کچھ شکوک و شبہات رکھتے ہیں ان کو بھی یہ موقع مل جاتا ہے کہ بالمشافہ ہماری دعوت اور ہمارے کام کو سمجھیں اور اگر ان کا دل گواہی دے کہ ہم واقعی حق پر ہیں تو ہمارے ساتھ شریک ہو جائیں۔ بہت سی غلط فہمیاں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ صرف دوری کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں اور بڑھتی رہتی ہیں۔ محض قرب اور مشاہدہ و معائنہ اور شخصی تعلق (Personal Contact) ہی ایسی غلط فہمیوں کو رفع کر دینے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہیں اور ان حضرات کے بھی شکر گذار ہیں جو اپنا وقت اور اپنا مال صرف کر کے ہمارے ان اجتماعات میں محض ہماری بات کو سمجھنے کے لیے تشریف لاتے ہیں۔ ہم ان کی اس جستجوئے حق کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ جہاں ان کی دلچسپی کا کوئی سامان نہیں ہے وہاں وہ محض اس وجہ سے آتے ہیں کہ اللہ کے کچھ بندے جو اللہ کا نام لے کر ایک کام کر رہے ہیں ان کے متعلق تحقیق کریں۔

کہ واقعی ان کا کام کس حد تک اللہ کا ہے اور اللہ کے لیے ہے۔ یہ مخلصانہ حق جوئی اگر ذہن و دماغ کی صفائی کے ساتھ بھی ہو تو اللہ ان کی سعی و جستجو کو ضائع نہ ہونے دے گا اور ضرور انھیں حق کے نشاناتِ راہ دکھا دے گا۔

چونکہ یہاں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ہماری دعوت اور ہمارا مقصد کیا ہے اور کس طریقے سے ہم اس کو حاصل کرنا چاہتے ہیں اس لیے سب سے پہلے میں انہی دو امور پر کچھ عرض کر دوں گا۔

ہماری دعوت کیا ہے ہماری دعوت کے متعلق عام طور پر جو بات کہی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ہم حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی دعوت دیتے ہیں۔ حکومتِ الٰہیہ کا لفظ کچھ تو خود غلط فہمی پیدا کرتا ہے اور کچھ اسے غلط فہمی پیدا کرنے کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں اور انھیں ایسا سمجھایا بھی جاتا ہے کہ حکومتِ الٰہیہ سے مراد محض ایک سیاسی نظام ہے اور ہماری غرض اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ موجودہ نظام کی جگہ وہ مخصوص سیاسی نظام قائم ہو۔ پھر چونکہ اس سیاسی نظام کے چلانے والے لامحالہ وہی مسلمان ہوں گے جو اس کے قیام کی تحریک میں حصہ لے رہے ہوں اس لیے خود بخود اس تصور میں سے یہ معنی نکل آتے ہیں یا ہوشیاری کے ساتھ نکال لیے جاتے ہیں کہ ہم محض حکومت چاہتے ہیں۔ اس کے بعد ایک دیندارانہ وعظ شروع ہوتا ہے اور ہم سے کہا جاتا ہے کہ تمھارے پیشِ نظر محض دنیا ہے حالانکہ مسلمان کے پیشِ نظر دین اور آخرت ہونی چاہیے۔ اور یہ کہ حکومت طلب کرنے کی چیز نہیں ہے بلکہ ایک انعام ہے جو دیندارانہ زندگی کے صلے میں اللہ کی طرف سے مل جاتا ہے۔ یہ باتیں کہیں تو نافہمی کے ساتھ کہی جاتی ہیں اور کہیں نہایت ہوشمندی کے ساتھ اس غرض کے لیے کہ اگر ہمیں نہیں تو کم سے کم خلقِ خدا کے بڑے حصے کو بدگمانیوں اور غلط فہمیوں میں مبتلا کیا جائے حالانکہ اگر کوئی شخص ہمارے لٹریچر کو کھلے دل کے ساتھ پڑھے تو اس پر بآسانی یہ بات کھل سکتی ہے کہ ہمارے پیشِ نظر صرف ایک سیاسی نظام کا قیام نہیں ہے بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ پوری انسانی زندگی ——— انفرادی و اجتماعی ——— میں وہ ہمہ گیر انقلاب رونما ہو جو اسلام رونما کرنا چاہتا ہے جس کے لیے اللہ نے اپنے انبیاء کو مبعوث کیا تھا اور جس کی دعوت دینے اور جد و جہد کرنے کے لیے ہمیشہ انبیاء علیہم السلام کی امامت و رہنمائی میں امتِ مسلمہ کے نام سے ایک گروہ بنتا رہا ہے۔

دعوتِ اسلامی کے تین نکات اگر ہم اپنی اس دعوت کو مختصر طور پر صاف اور سیدھے الفاظ میں بیان کرنا چاہیں تو یہ تین نکات (Points) پر مشتمل ہوگی:

(۱) یہ کہ ہم بندگانِ خدا کو بالعموم اور جو پہلے سے مسلمان ہیں ان کو بالخصوص اللہ کی بندگی کی دعوت دیتے ہیں۔

(۲) یہ کہ جو شخص بھی اسلام قبول کرنے یا اس کو ماننے کا دعویٰ یا اظہار کرے اس کو ہم دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی سے منافقت اور تناقض کو خارج کرے اور جب وہ مسلمان ہے یا بنا ہے تو مخلص مسلمان بنے اور اسلام کے رنگ میں رنگ کر یک رنگ ہو جائے۔

(۳) یہ کہ زندگی کا نظام جو آج باطل پرستوں اور فساق و فجار کی رہنمائی اور قیادت و فرمانروائی میں چل رہا ہے اور معاملاتِ دنیا کے انتظام کی زمامِ کار جو خدا کے باغیوں کے ہاتھ میں آگئی ہے، ہم یہ دعوت دیتے ہیں کہ اسے بدلا جائے اور رہنمائی و امامت نظری اور عملی دونوں حیثیتوں سے مومنین صالحین کے ہاتھ میں منتقل ہو۔

یہ تینوں نکات اگرچہ اپنی جگہ بالکل صاف ہیں لیکن ایک مدت دراز سے ان پر غفلتوں اور غلط فہمیوں کے پردے پڑے رہے ہیں اس لیے بدقسمتی سے آج غیر مسلموں کے سامنے ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کے سامنے بھی ان کی تشریح کرنے کی ضرورت پیش آگئی ہے۔

بندگیٔ رب کا حقیقی مفہوم اللہ کی بندگی کی طرف دعوت دینے کا مطلب صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ خدا کو خدا اور اپنے آپ کو خدا کا بندہ تسلیم کیا

مگر اس کے بعد اخلاقی و عملی اور اجتماعی زندگی ویسی کی ویسی ہی رہے جیسی خدا کو نہ ماننے اور اس کی بندگی کا اعتراف نہ کرنے کی صورت میں ہوتی ہے۔ اسی طرح خدا کی بندگی کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ خدا کو فوق الفطری طریقے پر خالق اور رازق اور معبود تسلیم کرلیا جائے مگر عملی زندگی کی فرمانروائی و حکمرانی سے اس کو بے دخل کر دیا جائے۔ اسی طرح خدا کی بندگی کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ زندگی کو مذہبی اور دنیوی دو الگ الگ حصوں میں تقسیم کیا جائے اور صرف مذہبی زندگی میں جس کا تعلق عقائد اور عبادات اور حرام و حلال کی چند محدود قیود سے سمجھا جاتا ہے خدا کی بندگی کی جائے، باقی رہے دنیوی معاملات جو تمدن، معاشرت، سیاست، معیشت، علوم و فنون اور ادب وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں تو ان میں انسان خدا کی بندگی سے بالکل آزاد رہے اور جس نظام کو چاہے خود وضع کرے یا دوسروں کے وضع کیے ہوئے کو اختیار کرلے۔ بندگی رب کے ان سب مفہومات کو ہم سراسر غلط سمجھتے ہیں، ان کو مٹانا چاہتے ہیں اور ہماری لڑائی جتنی شدت کے ساتھ نظام کفر کے ساتھ ہے اتنی ہی بلکہ اس سے زیادہ شدت کے ساتھ بندگی کے ان مفہومات کے خلاف ہے، کیونکہ ان کی بدولت دین کا تصور ہی سرے سے مسخ ہوگیا ہے۔ ہمارے نزدیک قرآن اور اس سے پہلے کی تمام آسمانی کتابیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ سے پہلے کے تمام پیغمبر جو دنیا کے مختلف گوشوں میں آئے ان کی بالاتفاق دعوت جس بندگی رب کی طرف تھی وہ یہ تھی کہ انسان خدا کو پورے معنی میں الٰہ اور رب، معبود اور حاکم، آقا اور مالک، رہنما اور قانون ساز، محاسب اور مجازی (جزا دینے والا) تسلیم کرے اور اپنی پوری زندگی کو خواہ وہ شخصی (Individual) ہو یا اجتماعی، اخلاقی ہو یا مذہبی، تمدنی و سیاسی اور معاشی ہو یا علمی و نظری، اسی ایک خدا کی بندگی میں سپرد کردے۔ یہی مطالبہ ہے جو قرآن میں اس طرح کیا گیا ہے کہ ادخلوا فی السلم کافۃ: تم پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ یعنی اپنی زندگی کے کسی پہلو اور کسی شعبے کو بندگی رب سے محفوظ (Reserve) کرکے نہ رکھو۔ اپنے تمام وجود کے ساتھ، اپنی پوری ہستی کے ساتھ خدا کی غلامی و اطاعت میں آجاؤ۔ زندگی کے کسی معاملے میں بھی تمہارا یہ طرز عمل نہ ہو کہ اپنے آپ کو خدا کی بندگی سے آزاد سمجھو اور اس کی رہنمائی و ہدایت سے مستغنی ہوکر اور اس کے مقابلہ میں خود مختار بن کر یا کسی خود مختار بنے ہوئے بندے کے پیرو یا مطیع ہوکر وہ راہ چلنے لگو جس کی ہدایت خود خدا نے نہ دی ہو۔ بندگی کا یہی وہ مفہوم ہے جس کی ہم تبلیغ کرتے ہیں اور جسے قبول کرنے کی سب لوگوں کو، مسلمانوں اور غیر مسلموں سب کو، دعوت دیتے ہیں۔

منافقت کی حقیقت دوسری چیز جس کی ہم دعوت دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ اسلام کی .... پیروی کا دعویٰ کرنے والے یا اسلام قبول کرنے والے سب لوگ منافقانہ رویے کو بھی چھوڑیں اور اپنی زندگی کو تناقضات سے بھی پاک کریں۔ منافقانہ رویے سے ہماری مراد یہ ہے کہ آدمی جس دین کی پیروی کا دعویٰ کرے اس کے بالکل برخلاف نظام زندگی کو اپنے اوپر حاوی و مسلط پاکر راضی اور مطمئن رہے، اس کو بدل کر اپنے دین کو اس کی جگہ قائم کرنے کی کوئی سعی نہ کرے بلکہ اس کے برعکس اسی فاسقانہ و باغیانہ نظام زندگی کو اپنے لیے سازگار بنانے اور اس میں اپنے لیے آرام کی جگہ پیدا کرنے کی فکر کرتا رہے یا اگر اس کو بدلنے کی کوشش بھی کرے تو اس کی غرض یہ نہ ہو کہ اس فاسقانہ نظام زندگی کی جگہ دین حق قائم ہو، بلکہ صرف یہ کوشش کرے کہ ایک فاسقانہ نظام ہٹ کر دوسرا فاسقانہ نظام اس کی جگہ قائم ہوجائے۔ ہمارے نزدیک یہ طرز عمل سراسر منافقانہ ہے، اس لیے کہ ہمارا ایک نظام زندگی پر ایمان رکھنا اور دوسرے نظام زندگی میں راضی رہنا بالکل ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ مخلصانہ ایمان کا اولین تقاضا یہ ہے کہ جس طریق زندگی پر ہم ایمان رکھتے ہیں اسی کو ہم اپنا قانون حیات دیکھنا چاہیں اور ہماری روح اپنی آخری گہرائیوں تک ہر اس رکاوٹ کے پیش آجانے پر بے چین و مضطرب ہوجائے جو اس طریق زندگی کے مطابق جینے میں سدراہ بن رہی ہو۔ ایمان تو ایسی کسی چھوٹی سے چھوٹی رکاوٹ کو بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوسکتا کجا کہ اس کا پورا کا پورا دین کسی دوسرے

نظام زندگی کا تابع مہمل بن کر رہ گیا ہو۔ اس دین کے کچھ اجزاء پر عمل درآمد ہوتا بھی ہو تو صرف اس وجہ سے کہ غالب نظام زندگی نے ان کو بے ضرر سمجھ رعایتاً باقی رکھا ہو اور ان رعایات (Concessions) کے ماسوا ساری زندگی کے معاملات دین کی بنیادوں سے ہٹ کر غالب نظام زندگی کی بنیادوں پر چل رہے ہوں اور پھر بھی ایمان اپنی جگہ نہ صرف خوش اور مطمئن ہو بلکہ جو کچھ بھی سوچے اسی غلبۂ کفر کو اصول موضوعہ کے طور پر تسلیم کرکے سوچے۔ اس قسم کا ایمان ہے تو فقہی اعتبار سے معتبر ہو لیکن دینی لحاظ سے تو اس میں اور نفاق میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اور قرآن کی متعدد آیات اس بات پر شاہد ہیں کہ حقیقت میں نفاق ہی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ جو لوگ بھی اپنے آپ کو بندگی رب کے اس مفہوم کے مطابق جس کی ابھی میں نے تشریح کی ہے خدائے واحد کی بندگی میں دینے کا اقرار کریں ان کی زندگی اس نفاق سے پاک ہو۔ بندگی حق کے اس مفہوم کا تقاضا یہ ہے کہ ہم سچے دل سے یہ چاہیں کہ جو طریق زندگی، جو قانون حیات، جو اصول تمدن و اخلاق و معاشرت و سیاست، جو نظام فکر و عمل اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کے واسطے سے ہمیں دیا ہے، ہماری زندگی کا پورا کاروبار اسی کی پیروی میں چلے اور ہم ایک لمحے کے لیے بھی اپنی زندگی کے کسی چھوٹے سے چھوٹے شعبے کے اندر بھی اس نظام حق کے خلاف کسی دوسرے نظام کے تسلط کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہوں۔ اب آپ خود سمجھ لیں کہ نظام باطل کے تسلط کو برداشت کرنا بھی جبکہ تقاضائے ایمان کے خلاف ہو تو اس پر راضی و مطمئن رہنا اور اس کے قیام و بقا کی سعی میں حصہ لینا یا ایک نظام باطل کی جگہ دوسرے نظام باطل کو سرفراز کرنے کی کوشش کرنا ایمان کے ساتھ کیسے میل کھا سکتا ہے۔

تناقض کی حقیقت

اس نفاق کے بعد دوسری چیز جس کو ہم ہر پرانے اور نئے مسلمان کی زندگی سے خارج کرنا چاہتے ہیں اور جس کے خارج کرنے کی ہر مدعی ایمان کو دعوت دیتے ہیں وہ تناقض ہے۔ تناقض سے ہماری مراد یہ ہے کہ آدمی جس چیز کا زبان سے دعویٰ کرے عمل سے اس کی خلاف ورزی کرے۔ نیز یہ بھی تناقض ہے کہ آدمی کا اپنا عمل ایک معاملے میں کچھ ہو اور دوسرے معاملے میں کچھ اور۔ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے اپنی پوری زندگی کو خدا کی بندگی میں دے دیا ہے تو اسے جان بوجھ کر کوئی حرکت بھی ایسی نہ کرنی چاہیے جو بندگی رب کی ضد ہو، اور اگر بشری کمزوری کی بنا پر ایسی کوئی حرکت اس سے سرزد ہو جائے تو اسے اپنی غلطی کا اعتراف کرکے پھر بندگی رب کی طرف پلٹنا چاہیے۔ ایمان کے مقتضیات میں سے یہ بھی ایک اہم مقتضا ہے کہ پوری زندگی صبغۃ اللہ میں رنگی ہوئی ہو۔ بہ رنگی اور چو رنگی زندگی تو درکنار دو رنگی زندگی بھی دعوئے ایمان کے ساتھ میل نہیں کھاتی۔ ہمارے نزدیک یہ بات بہروپیے پن سے کچھ کم نہیں ہے کہ ہم ایک طرف تو خدا اور آخرت اور وحی اور نبوت اور شریعت کو ماننے کا دعویٰ کریں اور دوسری طرف دنیا کی طلب میں نکلے ہوئے ان درسگاہوں کی طرف خود دوڑیں۔ انسان کو ان کا شوق دلائیں اور خود اپنے اہتمام میں ایسی درسگاہیں چلائیں جن میں انسان کو خدا سے دور کرنے والی، آخرت کو بھلا دینے والی اور مادہ پرستی میں غرق کر دینے والی تعلیم دی جاتی ہو۔ ایک طرف ہم خدا کی شریعت پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کریں اور دوسری طرف ان عدالتوں کے وکیل اور جج بنیں اور انہی عدالتوں کے فیصلوں پر حق و غیر حق کے فیصلے کا دارومدار رکھیں جو شریعت الٰہی کو دیوان عدالت سے بے دخل کرکے شریعت غیر الٰہی کی بنیاد پر قائم کی گئی ہوں۔ ایک طرف ہم مسجد میں جا جا کر نمازیں پڑھیں اور دوسری طرف مسجد سے باہر نکلتے ہی اپنے گھر کی زندگی میں اپنے لین دین میں، اپنی معاش کی فراہمی میں، اپنی شادی بیاہ میں، اپنی میراثوں کی تقسیم میں، اپنی سیاسی تحریکوں میں، اور اپنے سارے دنیوی معاملات میں خدا اور اس کی شریعت کو بھول کر کہیں اپنے نفس کے قانون کی، کہیں اپنی برادری کے رواج کی، کہیں اپنی سوسائٹی کے طور طریقوں کی اور کہیں خدا سے پھرے ہوئے حکمرانوں کے قوانین کی پیروی میں کام کرنے لگیں۔ ایک طرف ہم اپنے خدا کو بار بار یقین دلائیں کہ ہم تیرے ہی بندے

ہیں اور تیری ہی عبادت کرتے ہیں، اور دوسری طرف ہر اس بت کی پوجا کریں جس کے ساتھ ہمارے مفاد، ہماری دلچسپیاں، اور ہماری محبتیں اور آسائشیں کچھ بھی وابستگی رکھتی ہوں۔ یہ اور ایسے بے شمار تناقضات جو آج مسلمانوں کی زندگی میں پائے جاتے ہیں، جن کے موجود ہونے سے کوئی ایسا شخص جو بینائی رکھتا ہو انکار نہیں کرسکتا، ہمارے نزدیک وہ اصلی گھن ہیں جو امت مسلمہ کی سیرۃ و اخلاق کو اور اُس کے دین و ایمان کو اندر ہی اندر کھائے جاتے ہیں اور آج زندگی کے ہر پہلو میں مسلمانوں سے جن کمزوریوں کا اظہار ہو رہا ہے ان کی اصل جڑ یہی تناقضات ہیں۔ ایک مدت تک مسلمانوں کو یہ اطمینان دلایا جاتا رہا ہے کہ تم شہادت توحید و رسالت زبان سے ادا کرنے اور روزہ و نماز وغیرہ چند مذہبی اعمال کر لینے کے بعد خواہ کتنے ہی غیر دینی اور غیر ایمانی طرز عمل اختیار کر جاؤ بہر حال نہ تمہارے اسلام پر کوئی آنچ آسکتی ہے اور نہ تمہاری نجات کو کوئی خطرہ لاحق ہو سکتا ہے حتیٰ کہ اس ڈھیل (Allowance) کی حدود اس حد تک بڑھیں کہ نماز روزہ بھی مسلمان ہونے کے لیے شرط نہ رہا اور مسلمانوں میں عام طور پر یہ تخیل پیدا کر دیا گیا کہ اگر ایک طرف ایمان و اسلام کا اقرار ہو، اور دوسری طرف ساری زندگی اس کی ضد ہو تب بھی کچھ نہیں بگڑتا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً۔ اسی چیز کا نتیجہ آج ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ اسلام کے نام کے ساتھ ہر فسق، ہر کفر، ہر معصیت و نافرمانی اور ہر ظلم و سرکشی کا جوڑ آسانی سے لگ جاتا ہے اور مسلمان مشکل ہی سے یہ محسوس کرتے ہیں کہ جن راہوں میں وہ اپنے اوقات، اپنی محنتیں، اپنے مال، اپنی قوتیں، اور قابلیتیں، اور اپنی جانیں کھپا رہے ہیں اور جن مقاصد کے پیچھے ان کی انفرادی اور اجتماعی کوششیں صرف ہو رہی ہیں وہ اکثر اُن کے اُس ایمان کی ضد ہیں جس کا وہ دعویٰ رکھتے ہیں۔ یہ صورتِ حال جب تک جاری رہے گی اسلام کے دائرے میں نومسلموں کا داخلہ بھی کوئی مفید نتیجہ پیدا نہ کر سکے گا کیونکہ جو منتشر افراد اس کانِ نمک میں آتے جائیں گے وہ اسی طرح نمک بنتے چلے جائیں گے۔ پس ہماری دعوت کا ایک لازمی عنصر یہ ہے کہ ہم ہر مدعی ایمان کی زندگی کو ان تناقضات سے پاک دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہمارا مطالبہ ہر مومن سے یہ ہے کہ وہ حنیف ہو، یکسو ہو، یکرنگ مومن و مسلم ہو، ہر اس چیز سے کٹ جائے اور نہ کٹ سکتا ہو تو پیہم کٹنے کی جدوجہد کرتا رہے جو ایمان کی ضد اور مسلمانہ طریق زندگی کے منافی ہو، اور خوب اچھی طرح مقتضیاتِ ایمان میں سے ایک ایک تقاضے کو سمجھے اور اسے پورا کرنے کی پیہم سعی کرتا رہے۔

امامت میں تغیر کی ضرورت

اب ہماری دعوت کے تیسرے نکتے کو لیجیے۔ ابھی جن دو نکات کی تشریح میں آپ کے سامنے کر چکا ہوں، یہ تیسرا نکتہ اُن سے بالکل ایک منطقی نتیجے کے طور پر نکلتا ہے۔ ہمارا اپنے آپ کو بندگیٔ رب کے حوالے کر دینا اور اس حوالگی و سپردگی میں ہمارا منافق نہ ہونا بلکہ مخلص ہونا اور پھر ہمارا اپنی زندگی کو تناقضات سے پاک کر کے مسلم حنیف بننے کی کوشش کرنا لازمی طور پر اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ہم اُس نظامِ زندگی میں انقلاب چاہیں، جو آج کفر، دہریت، شرک، فسق و فجور اور بد اخلاقی کی بنیادوں پر چل رہا ہے اور جس کے نقشے بنانے والے مفکرین اور جس کا عملی انتظام کرنے والے مدبرین سب کے سب خدا سے پھرے ہوئے اور اس کی شرائع کے قیود سے نکلے ہوئے لوگ ہیں جب تک زمام کار ان لوگوں کے ہاتھ میں رہے گی اور جب تک علوم و فنون، آرٹ اور ادب، تعلیم و تدریس، نشر و اشاعت، قانون سازی اور تنفیذ قانون، مالیات، صنعت و حرفت و تجارت، انتظام ملکی اور تعلقات بین الاقوامی، ہر چیز کی باگ ڈور یہ لوگ سنبھالے ہوئے رہیں گے، کسی شخص کے لیے دنیا میں مسلمان کی حیثیت سے زندگی بسر کرنا اور خدا کی بندگی کو اپنا ضابطِ حیات بنا کر رہنا نہ صرف عملاً محال ہے بلکہ اپنی آئندہ نسلوں کو اعتقاداً بھی اسلام کا پیرو چھوڑ جانا غیر ممکن ہے۔ اس کے علاوہ صحیح معنوں میں جو شخص بندۂ رب ہو اس پر منجملہ دوسرے فرائض کے ایک اہم ترین فرض یہ بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ خدا کی رضا کے مطابق دنیا کے انتظام کو فساد سے پاک کرے اور صلاح پر قائم کرے۔ اور یہ ظاہر بات ہے کہ یہ مقصد اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک کہ زمام کار صالحین کے ہاتھ میں نہ ہو۔ فساق و فجار اور خدا کے باغی اور شیطان

کے مطیع دنیا کے امام و پیشوا اور منتظم رہیں اور پھر دنیا میں ظلم، فساد، بد اخلاقی اور گمراہی کا دور دورہ نہ ہو، یہ عقل اور فطرت کے خلاف ہے اور آج تجربہ ومشاہدہ سے کالشمس فی النہار ثابت ہو چکا ہے کہ ایسا ہونا ممکن ہے۔ پس ہمارا مسلم ہونا خود اس بات کا متقاضی ہے کہ ہم دنیا کے ائمہ ضلالت کی پیشوائی ختم کر دینے اور غلبۂ کفر و شرک کو مٹا کر دین حق کو اس کی جگہ قائم کرنے کی سعی کریں۔

امامت میں انقلاب کیسے ہوتا ہے؟

اگر یہ تغیر محض چاہنے سے نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت بہرحال دنیا کا انتظام چاہتی ہے، اور دنیا کے انتظام کے لیے کچھ صلاحیتیں اور قوتیں اور صفات درکار ہیں جن کے بغیر کوئی گروہ اس انتظام کو ہاتھ میں لینے اور چلانے کے قابل نہیں ہو سکتا۔ اگر مومنین صالحین کا ایک منظم جتھا ایسا موجود نہ ہو جو انتظامِ دنیا کو چلانے کی اہلیت رکھتا ہو تو پھر مشیتِ الٰہی غیر مومن اور غیر صالح لوگوں کو اپنی دنیا کا انتظام سونپ دیتی ہے۔ لیکن اگر کوئی گروہ ایسا موجود ہو جائے جو ایمان بھی رکھتا ہو، صالح بھی ہو اور ان صفات اور صلاحیتوں اور قوتوں میں بھی کفار سے بڑھ جائے جو دنیا کا انتظام چلانے کے لیے ضروری ہیں تو مشیتِ الٰہی نہ ظالم ہے اور نہ فساد پسند کہ پھر بھی اپنی دنیا کا انتظام فساق و فجار اور کفار ہی کے ہاتھ میں رہنے دے۔ پس ہماری دعوت صرف اسی حد تک نہیں ہے کہ دنیا کی زمام کار فساق و فجار کے ہاتھ سے نکل کر مومنین صالحین کے ہاتھ میں آئے بلکہ ایجاباً (Positive) ہماری دعوت یہ ہے کہ اہل ایمان و صلاح کا ایک ایسا گروہ منظم کیا جائے جو نہ صرف اپنے ایمان میں پختہ، نہ صرف اپنے اسلام میں مخلص و یکرنگ اور نہ صرف اپنے اخلاق میں صالح و پاکیزہ ہو بلکہ اس کے ساتھ ان تمام اوصاف اور قابلیتوں سے بھی آراستہ ہو جو دنیا کی کارگاہِ حیات کو بہترین طریقے پر چلانے کے لیے ضروری ہیں، اور صرف آراستہ ہی نہ ہو بلکہ موجودہ کارفرماؤں اور کارکنوں سے ان اوصاف اور قابلیتوں میں اپنے آپ کو فائق تر ثابت کردے۔

مخالفت اور اس کے اسباب

یہ ہے ہماری دعوت کا خلاصہ۔ اب آپ تعجب کریں گے اگر میں آپ کو بتاؤں کہ اس دعوت کی مزاحمت اور مخالفت سب سے پہلے جس گروہ کی طرف سے ہوئی ہے وہ مسلمانوں کا گروہ ہے۔ اس وقت تک غیر مسلموں کی طرف سے ہمارے خلاف نہ کوئی آواز اٹھی ہے اور نہ عملاً کوئی مزاحمت و مخالفت ہوئی ہے۔ یہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ آئندہ بھی یہی صورت حال رہے گی، نہ یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ کب تک یہ صورتِ حال رہے گی، مگر بہرحال یہ واقعہ اپنی جگہ نہایت دردناک اور افسوسناک ہے کہ اس دعوت کو سن کر ناک بھوں چڑھانے والے، اسے اپنے لیے خطرہ سمجھنے والے اور اس کی مزاحمت میں سب سے آگے بڑھ کر سعی کرنے والے غیر مسلم نہیں بلکہ مسلمان ہیں۔ شاید ایسی ہی کچھ صورتِ حال ہوگی جس میں اہل کتاب سے فرمایا گیا تھا کہ وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ۔ ہمیں ہندوؤں، سکھوں اور انگریزوں تک سے تبادلۂ خیال کا موقع ملا ہے مگر بہت کم ایسا اتفاق ہوا کہ ان لوگوں میں سے کسی نے ہمارے لٹریچر کو پڑھ کر یا ہمارے مدعا کو تفصیل کے ساتھ ہماری زبان سے سن کر یہ کہا ہو کہ یہ "حق" نہیں ہے، یا یہ کہ اگر تم اس چیز کو قائم کرنے کی کوشش کرو گے تو ہم ایڑی سے چوٹی تک کا زور تمہاری مزاحمت میں لگا دیں گے۔ متعدد غیر مسلم ہم کو ایسے بھی ملے ہیں جنھوں نے بے اختیار ہو کر کہا کہ کاش یہی اسلام ہندوستان میں پیش کیا گیا ہوتا اور اسی کو قائم کرنے کے لیے باہر سے آنے والے اور اندر سے قبول کرنے والے مسلمانوں نے کوشش کی ہوتی تو آج ہندوستان کا یہ نقشہ نہ ہوتا اور اس ملک کی تاریخ کچھ اور ہی ہوتی۔ بعض غیر مسلموں نے ہم سے یہاں تک کہا کہ اگر فی الواقع ایسی ایک سوسائٹی موجود ہو جو پوری دیانت کے ساتھ انہی اصولوں پر چلے اور جس کا مرنا اور جینا سب اسی ایک مقصد کے لیے ہو تو ہمیں اس کے اندر شامل ہونے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔ لیکن اس کے برعکس ہماری مخالفت میں سرگرم اور ہمارے متعلق بدگمانیاں پھیلانے اور ہم پر ہر طرح کے الزام لگانے والے اگر کسی گروہ میں سب سے پہلے اٹھے تو وہ مسلمانوں کا گروہ ہے اور ان میں بھی سب سے زیادہ یہ شرف مذہبی طبقے کے حضرات کو حاصل ہوا ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ آج تک

کسی کو یہ کہنے کی جرات نہیں ہوئی کہ جس چیز کی دعوت تم لوگ دیتے ہو وہ باطل ہے۔ شاید اس دعوت پر سامنے سے حملہ (Frontal attack) ممکن ہی نہیں ہے، اس لیے مجبوراً کبھی عقب سے اور کبھی دائیں پہلو سے اور کبھی بائیں جانب سے چھاپے مارنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ بات تو حق ہے مگر اس کی طرف دعوت دینے والا ایسا اور ایسا ہے۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ اس کے حق ہونے میں تو کلام نہیں مگر اس زمانے میں یہ چلنے والی چیز نہیں ہے۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ حق تو یہی ہے مگر اس کا عَلَم بلند کرنے کے لیے صحابہ کرام جیسے لوگ درکار ہیں اور وہ بھلا اب کہاں آ سکتے ہیں۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ اس کے صداقت ہونے میں کوئی شبہ نہیں مگر مسلمان اپنی موجودہ سیاسی و معاشی پوزیشن میں اس دعوت کو اپنی واحد دعوت کیسے بنا سکتے ہیں، ایسا کریں تو ان کی دنیا تباہ ہو جائے اور تمام سیاسی اور معاشی زندگی پر غیر مسلم قابض ہو کر ان کے لیے سانس لینے تک کی جگہ نہ چھوڑیں۔ پھر جب اس مسلمان قوم میں سے کوئی اللہ کا بندہ ایسا نکل آتا ہے جو ہماری اس دعوت کو قبول کر کے اپنی زندگی کو واقعی نفاق و تناقض سے پاک کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنی پوری زندگی کو بندگیٔ رب میں دے ڈالنے کا تہیہ کر لیتا ہے تو سب سے پہلے اس کی مخالفت کرنے کے لیے اس کے اپنے بھائی بند، اس کے ماں باپ، اعزا اور اقربا، برادری کے لوگ اور دوست آشنا کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اچھے اچھے متقی اور دیندار آدمی بھی جن کی پیشانیوں پر نمازیں پڑھتے پڑھتے گٹے پڑ چکے ہیں اور جن کی زبانیں مذہبیت کی باتوں سے ہر وقت تر رہتی ہیں اس بات کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے کہ ان کا بیٹا یا بھائی یا کوئی عزیز جس کا دنیوی مفاد انھیں کسی درجے میں بھی محبوب ہو اپنے آپ کو اس خطرے میں ڈالے۔

یہ بات کہ اس دعوت کی مخالفت سب سے پہلے مسلمانوں نے کی اور ان کے بھی اہلِ دنیا نے نہیں بلکہ اہلِ دین نے، کی ایک بہت بڑی بیماری کا پتہ دیتی ہے جو مدتوں سے پرورش پا رہی تھی مگر ظاہر فریب پردوں کے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔ آج اگر ہم محض علمی رنگ میں اس دعوت کو پیش کرتے اور یہ نہ کہتے کہ آؤ اس چیز کو عمل میں لانے اور بالفعل قائم کرنے کی کوشش کریں تو آپ دیکھتے کہ مخالفت کے بجائے ان مزیدار علمی باتوں پر ہر طرف سے تحسین و آفرین ہی کی صدائیں بلند ہوتیں۔ بھلا کوئی مسلمان ایسا بھی ہو سکتا ہے جو یہ کہہ سکے کہ بندگی خدا کے سوا کسی اور کی ہونی چاہیے، یا یہ کہ مسلمان کو نفاق کی حالت میں اور منافیِ ایمان اعمال میں مبتلا رہنا چاہیے، یا یہ کہ زمام کار مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں بلکہ کفار ہی کے ہاتھ میں رہنی چاہیے، یا شریعتِ الٰہی کو نہیں کفر ہی کے قوانین کو دنیا میں جاری رہنا چاہیے۔ میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اب تک جن چیزوں کی ہم نے دعوت دی ہے ان میں سے کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے جسے ہم دعوتِ عمل کے بغیر صرف علمی حیثیت سے پیش کرتے تو مسلمانوں میں سے کوئی گروہ بلکہ کوئی فرد اس کے خلاف زبان کھولنے پر آمادہ ہوتا۔ لیکن جس چیز نے لوگوں کو مخالفت پر آمادہ کیا وہ صرف یہ ہے کہ ہم ان باتوں کو فقط علمی رنگ میں ہی نہیں پیش کرتے بلکہ ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ آؤ جس چیز کو از روئے حق جانتے ہو اسے عملاً پہلے اپنی زندگی میں اور پھر اپنے گرد و پیش دنیا کی زندگی میں قائم و جاری کرنے کی کوشش کرو۔ یہ بعینہٖ وہی صورت حال ہے جو اس سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے وقت پیش آ چکی ہے۔ جو لوگ عرب جاہلیت کے لٹریچر پر نگاہ رکھتے ہیں ان سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس توحید کی دعوت دی تھی اور جن اصولِ اخلاق کو آپ پیش فرماتے تھے وہ عرب میں بالکل کوئی نئی چیز نہ تھے۔ اسی قسم کے موحدانہ خیالات زمانۂ جاہلیت کے متعدد شعراء اور خطیب پیش کر چکے تھے اور اسی طرح اسلامی اخلاقیات میں سے بھی بیشتر وہ تھے جن کو اہلِ عرب کے حکماء اور خطباء اور شعراء بیان کرتے رہے تھے۔ مگر فرق جو کچھ تھا وہ یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طرف تو باطل کی آمیزشوں سے الگ کر کے خالص حق کو ایک مکمل و مرتب نظامِ زندگی کی شکل میں لوگوں کے سامنے پیش کیا، اور دوسری

طرف آپ نے یہ بھی چاہا کہ جس توحید کو ہم حق کہتے ہیں اس کے مخالف عناصر کو ہم اپنی زندگی سے خارج کر دیں، اور سارے نظامِ زندگی کو اسی توحید کی بنیاد پر تعمیر کریں۔ نیز یہ کہ جن اصولِ اخلاق کو ہم معیار تسلیم کرتے ہیں ہماری پوری زندگی کا نظام بھی انہی اصولوں پر عملاً قائم ہو۔ یہی سبب تھا کہ جن باتوں کے کہنے پر زمانۂ جاہلیت کے کسی خطیب، کسی شاعر اور کسی حکیم کی مخالفت نہیں کی گئی بلکہ الٹا انھیں سراہا گیا، انہی باتوں کو جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا تو ہر طرف سے مخالفتوں کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا، کیونکہ لوگ اس بات کے لیے تیار نہیں تھے کہ شرک پر جو نظامِ زندگی قائم تھا اسے بالکل ادھیڑ کر از سرِ نو توحید کی بنیادوں پر قائم کیا جائے اور اس طرح ان تمام تعصبات اور آبائی رسموں کا، امتیازات اور "حقوق" اور مناصب کا اور اعزازات و اکرامات اور معاشی مفادات کا یک لخت خاتمہ ہو جائے جو صدہا برس سے عہدِ جاہلیت میں زندگی کی بنیاد بنے ہوئے تھے اور جن سے بعض طبقوں اور خاندانوں کی اغراض وابستہ تھیں۔ اسی طرح لوگ اس بات کے لیے بھی تیار نہیں تھے کہ اخلاقِ فاسدہ کے رواج سے جو آسائشیں اور لذتیں اور منفعتیں اور آزادیاں ان کو حاصل ہیں ان سے دست بردار ہو جائیں اور اخلاقِ صالحہ کی بندشوں میں اپنے آپ کو خود کسوا دیں۔ یہ معاملہ صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ساتھ پیش نہیں آیا بلکہ حضور سے پہلے جتنے نبی گزرے ہیں ان کی مخالفت بھی زیادہ تر اسی مسئلے پر ہوئی ہے۔ اگر انبیاء صرف علمی اور ادبی حیثیت سے توحید اور آخرت اور اخلاقِ فاضلہ کا ذکر کرتے تو ان کے زمانے کی سوسائٹیاں اسی طرح ان کو برداشت کرتیں بلکہ سر آنکھوں پر بٹھاتیں جس طرح انھوں نے مختلف قسم کے شاعروں اور فلسفیوں اور ادیبوں کو سر آنکھوں پر بٹھایا۔ لیکن ہر نبی کا مطالبہ ان باتوں کے ساتھ یہ بھی تھا کہ اتقوا اللہ واطیعون (اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو) اور لا تطیعوا امر المسرفین (حد سے گزرنے والوں کی اطاعت نہ کرو) اور اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونہ اولیاء (جو ہدایت تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہے اس کی پیروی کرو اور اپنے رب کے سوا دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو) اور پھر انبیاء نے اس پر بھی اکتفا نہ کیا بلکہ ایک مستقل تحریک اسی مقصد کو پورا کرنے کے لیے جاری کی اور اپنے پیروؤں کے جتھے منظم کر کے عملاً نظامِ تہذیب و تمدن و اخلاق کو اپنے نصب العین کے مطابق بدل ڈالنے کی جدوجہد شروع کر دی۔ بس یہی وہ نقطہ تھا جہاں سے اُن لوگوں کی مخالفت کا آغاز ہوا جن کے مفاد نظامِ جاہلیت سے کلی یا جزئی طور پر وابستہ تھے، اور آج ہم مشاہدہ کر رہے ہیں کہ ٹھیک یہی نقطہ ہے جہاں سے ہماری مخالفت کی ابتدا ہوئی ہے۔ مسلمانوں نے ایک طویل مدت سے اپنی پوری زندگی کی عمارت ان بہت سی مصالحتوں (Compromises) پر قائم کر رکھی ہے جو نظامِ جاہلیت کے اور ان کے درمیان طے ہو چکے ہیں۔ یہ مصالحتیں صرف دنیادارانہ ہی نہیں ہیں بلکہ انھوں نے اچھی خاصی مذہبی نوعیت بھی اختیار کر لی ہے۔ بڑے بڑے مقدس لوگ جن کے تقدس کی قسمیں کھائی جا سکتی ہیں، ان مصالحتوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ نظامِ باطل کی وابستگی کے ساتھ تقویٰ اور عبادت کے چند مظاہر اس قدر کافی قرار دیے جا چکے ہیں کہ بکثرت لوگ اپنی محدود پرہیزگاریوں اور عبادت گزاریوں پر اپنی نجات کی طرف سے مطمئن بیٹھے ہوئے ہیں۔ بہت سے اربابِ فضل اور اصحابِ مقاماتِ عالیہ ایسے موجود ہیں جن کی بزرگی اور روحانیت، اور جن کے اونچے مراتب، نظامِ جاہلیت کے ساتھ مصالحت کر لینے کے باوجود قائم ہیں۔ زبان سے کفر و جاہلیت اور فسق و فجور اور بد اعتقادیوں اور ضلالتوں کی مذمت کر لینا اور عہدِ صحابہ کے نقشے بڑی طلاقتِ لسانی کے ساتھ اپنے وعظوں اور اپنی تحریروں میں کھینچ دینا اسلام کا حق ادا کرنے کے لیے بالکل کافی ہو چکا ہے اور اس کے بعد ان حضرات کے لیے بالکل حلال ہے کہ خود اپنے آپ کو اور اپنی ۔ ۔ ۔ اولاد کو اور اپنے متعلقین اور اپنے پیروؤں کو اُسی نظامِ باطل کی خدمت میں لگا دیں جس کے لائے ہوئے سیلابِ ضلالت و گمراہی اور طوفانِ فسق و فجور کی یہ دن رات مذمت کرتے رہتے ہیں۔ ان حالات میں جب ہم دینِ حق اور اس کے مطالبات اور مقتضیات کو محض علمی حیثیت ہی سے پیش کرنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ یہ دعوت بھی دیتے ہیں کہ غلط نظام

سے ساتھ وہ تمام مصالحتیں ختم کر دو جو تم نے کر رکھی ہیں اور کامل یکسوئی و یکرنگی کے ساتھ حق کی پیروی اختیار کرو اور پھر اس باطل کی جگہ اس حق کو قائم کرنے کے لیے جان و مال اور وقت و محنت کی قربانی دو جس پر تم ایمان لائے ہو، تو ظاہر ہے کہ یہ قصور ایسا نہیں ہے جسے معاف کیا جا سکے۔ اگر سیدھی طرح یہ تسلیم کر لیا جائے کہ واقعی دین کے مطالبات اور تقتضیات یہی ہیں اور حقیقت میں حنیفیت اسی کو کہتے ہیں اور اصل بات یہی ہے کہ نظام باطل کے ساتھ مومن کا تعلق مصالحت کا نہیں بلکہ نزاع و کشمکش کا ہونا چاہیے، تو پھر دو صورتوں میں سے ایک صورت اختیار کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے، یا تو اپنے مفاد کی قربانی گوارا کر کے اس جد و جہد میں حصہ لیا جائے اور ظاہر ہے کہ یہ بہت جاں گسل بات ہے، یا پھر اعتراف کر لیا جائے کہ حق تو یہی ہے مگر ہم اپنی کمزوری کی وجہ سے اس کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ لیکن یہ اعتراف بھی مشکل ہے کیونکہ ایسا کرنے سے صرف یہی نہیں کہ نجات کی وہ گارنٹی خطرے میں پڑ جاتی ہے جس کے اطمینان پر اب تک زندگی بسر کی جا رہی تھی بلکہ اس طرح وہ مقام تقدس بھی خطرے میں پڑ جاتا ہے جو مذہبی و روحانی حیثیت سے ان حضرات کو حاصل رہا ہے اور یہ چیز بھی بہر حال ٹھنڈے پیٹوں گوارا نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے ایک بڑے گروہ نے مجبوراً یہ تیسری راہ اختیار کی ہے کہ صاف صاف ہماری اس دعوت کو باطل تو نہ کہا جائے کیونکہ باطل کہنے کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے، لیکن صاف صاف اس کے حق ہونے کا بھی اعتراف نہ کیا جائے، اور اگر کہیں اس کی حقانیت کا اقرار کرنا پڑ ہی جائے تو پھر اصول کو چھوڑ کر کسی شخص یا اشخاص کو بدگمانیوں اور الزامات کا ہدف بنایا جائے تاکہ خود اپنے ہی مانے ہوئے حق کا ساتھ نہ دینے کے لیے وجہ جواز پیدا ہو جائے۔ کاش یہ حضرات کبھی اس بات پر غور فرماتے کہ جو حجتیں آج بندوں کا منہ بند کرنے کے لیے وہ پیش کرتے ہیں کل قیامت کے روز کیا وہ خدا کا منہ بھی بند کر دیں گی۔

ہمارا طریق کار اب میں آپ کے سامنے مختصر طور پر اس "طریق کار" کو پیش کروں گا جو ہم نے اپنی اس دعوت کے لیے اختیار کیا ہے۔ ہماری دعوت کی طرح ہمارا یہ طریق کار بھی در اصل قرآن اور انبیاء علیہم السلام کے طریقے سے ماخوذ ہے۔ جو لوگ ہماری دعوت کو قبول کرتے ہیں ان سے ہمارا اولین مطالبہ یہی ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو عملاً اور بالکلیہ بندگی رب میں دیدو اور اپنے عمل سے اپنے اخلاص اور اپنی یکسوئی کا ثبوت دو اور ان تمام چیزوں سے اپنی زندگی کو پاک کرنے کی کوشش کرو جو تمہارے ایمان کی ضد ہیں۔ یہیں سے ان کے اخلاق و سیرت کی تعمیر اور ان کی آزمائش کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جن لوگوں نے بڑی بڑی امنگوں (Ambitions) کے ساتھ اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی انھیں اپنے اونچے اونچے خوابوں کی عمارتیں اپنے ہاتھ سے ڈھا دینی پڑتی ہیں، اور اس زندگی میں قدم رکھنا پڑتا ہے جس میں جاہ و منصب اور معاشی خوشحالیوں کے امکانات انھیں اپنی زندگی میں تو درکنار اپنی دوسری تیسری پشت میں بھی دور دور نظر نہیں آتے۔ جن لوگوں کی معاشی خوشحالی کسی مرہونہ زمین یا کسی مغصوبہ جائداد یا کسی ایسی میراث پر قائم تھی جس میں حقداروں کے حقوق مارے گئے تھے انھیں بسا اوقات دامن جھاڑ کر اس خوشحالی سے کنارہ کش ہو جانا پڑتا ہے صرف اس لیے کہ جس خدا کو انھوں نے اپنا آقا تسلیم کیا ہے اس کے منشا کے خلاف کسی مال کا کھانا ان کے ایمان کے منافی ہے۔ جن لوگوں کے وسائل زندگی غیر شرعی تھے یا نظام باطل سے وابستہ تھے ان کو ترقیوں کے خواب دیکھنا تو درکنار موجودہ وسائل سے حاصل کی ہوئی روٹی کا بھی ایک ایک ٹکڑا حلق سے اتارنا ناگوار ہونے لگتا ہے اور وہ ان وسائل کو پاک تر وسائل سے خواہ وہ حقیر ترین ہی کیوں نہ ہوں، بدلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگتے ہیں۔ پھر جیسا کہ ابھی میں آپ کے سامنے بیان کر چکا ہوں، اس مسلک کو عملاً اختیار کرتے ہی آدمی کا قریب ترین ماحول اس کا دشمن بن جاتا ہے۔ اس کے اپنے والدین، اس کے بھائی بند، اس کی بیوی اور بچے اور اس کے جگری دوست سب سے پہلے اس کے ایمان سے قوت آزمائی شروع کر دیتے ہیں اور بسا اوقات

اس مسلک کا پہلا اثر ظاہر ہوتے ہی آدمی کا اپنا گہوارہ جس میں وہ نازوں سے پالا گیا تھا اس کے لیے زنبور خانہ بن کر رہ جاتا ہے۔ یہ پہلی ابتدائی تربیت گاہ ہے جو صالح و مخلص اور قابل اعتماد سیرت کے کارکن فراہم کرنے کے لیے قدرت الٰہی نے ہمارے لیے خود بخود پیدا کر دی ہے۔ ان ابتدائی آزمائشوں میں جو لوگ ناکام ہو جاتے ہیں وہ آپ سے آپ چھٹ کر الگ ہو جاتے ہیں اور ہمیں ان کو چھانٹ پھینکنے کی زحمت گوارا نہیں کرنی پڑتی۔ اور جو لوگ ان میں پورے اترتے ہیں وہ ثابت کر دیتے ہیں کہ ان کے اندر کم از کم اتنا اخلاص، اتنی یکسوئی، اتنا صبر اور عزم، اتنی محبت حق اور اتنی مضبوط سیرت ضرور موجود ہے جو خدا کی راہ میں قدم رکھنے اور پہلے مرحلۂ امتحان سے کامیاب گزر جانے کے لیے ضروری ہے۔ اس مرحلے کے کامیاب لوگوں کو ہم نسبتاً زیادہ بھروسے اور اطمینان کے ساتھ لے کر دوسرے مرحلے کی طرف پیش قدمی کر سکتے ہیں جو آگے آنے والا ہے اور جس میں اس سے زیادہ آزمائشیں پیش آنے والی ہیں۔ وہ آزمائشیں پھر ایک دوسری بھٹی تیار کریں گی جو اسی طرح کھوٹے سکوں کو چھانٹ کر پھینک دے گی اور زرِ خالص کو اپنی گود میں رکھ لے گی۔ جہاں تک ہمارا علم ساتھ دیتا ہے ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ انسانی معادن سے کار آمد عناصر کو چھانٹنے اور ان کو زیادہ کار آمد بنانے کے لیے یہی طریقہ پہلے بھی اختیار کیا جاتا رہا ہے اور جو تقویٰ ان بھٹیوں میں تیار ہوتا ہے، چاہے وہ فقہی ناپ تول میں پورا نہ اترے اور خانقاہی معیاروں پر بھی ناقص نکلے، مگر صرف اسی طرز سے تیار کیے ہوئے تقویٰ میں یہ طاقت ہو سکتی ہے کہ انتظامِ دنیا کی بھاری ذمہ داریوں کا بوجھ سنبھال سکے اور ان عظیم الشان امانتوں کا بار اٹھا سکے جن کے ایک قلیل سے قلیل جز کا وزن بھی خانقاہی تقویٰ کی برداشت سے باہر ہے۔

اس کے ساتھ دوسری چیز جو ہم اپنے ارکان پر لازم کرتے ہیں یہ ہے کہ جس حق کی روشنی انھوں نے پائی ہے اس سے وہ اپنے قریبی ماحول کو اور ان سب لوگوں کو جن سے ان کا قرابت یا دوستی یا ہمسائگی یا لین دین کا تعلق ہے، روشناس کرانے کی کوشش کریں اور انھیں اس کی طرف آنے کی دعوت دیں۔ یہاں پھر آزمائشوں کا ایک سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ سب سے پہلے تو اس تبلیغ کی وجہ سے مبلغ کی اپنی زندگی درست ہوتی ہے کیونکہ یہ کام شروع کرتے ہی بے شمار خورد بین اور دیدبان اور Search lights اس کی ذات کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور مبلغ کی زندگی میں اگر کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی اس کے ایمان اور اس کی دعوت کے منافی موجود ہو تو یہ مفت کے محتسب اسے نمایاں کر کے مبلغ کے سامنے رکھ دیتے ہیں اور تازیانے لگا لگا کر اسے مجبور کرتے ہیں کہ اپنی زندگی کو اس سے پاک کرے۔ اگر مبلغ فی الواقع اس دعوت پر سچے دل سے ایمان لایا ہو تو وہ ان تنقیدوں پر جھنجھلانے اور تاویلوں سے اپنے عمل کی غلطی کو چھپانے کی کوشش نہ کرے گا بلکہ ان لوگوں کی خدمات سے فائدہ اٹھائے گا جو مخالفت کی نیت ہی سے سہی مگر بہرحال اس کی اصلاح میں بغیر کسی معاوضے کے سعی و محنت صرف کرتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس برتن کو سیکڑوں ہاتھ مانجھنے میں لگ جائیں اور مانجھتے ہی چلے جائیں وہ چاہے کتنا ہی کثیف ہو آخرکار مجلّٰی و مصفّٰی ہو کر رہے گا۔

پھر اس تبلیغ سے ہمارے کارکنوں میں بہت سے ان اوصاف کو بالیدگی حاصل ہوتی ہے جنھیں آگے چل کر دوسرے میدانوں میں کسی اور شکل سے ہم کو استعمال کرنا ہے۔ جب مبلغ کو طرح طرح کے دل شکن حالات سے گزرنا پڑتا ہے، کہیں اس کی ہنسی اڑائی جاتی ہے، کہیں اس پر طعنے اور آوازے کسے جاتے ہیں، کہیں گالیوں اور دوسری جہالتوں سے اس کی تواضع کی جاتی ہے، کہیں اس پر الزامات کی بوچھاڑ کی جاتی ہے، کہیں اس کو فتنوں میں الجھانے کی نت نئی تدبیریں کی جاتی ہیں، کہیں اسے گھر سے نکال دیا جاتا ہے، میراث سے محروم کیا جاتا ہے، دوستیاں اور رشتہ داریاں اس سے منقطع کر لی جاتی ہیں اور اس کے لیے اپنے ماحول میں سانس تک لینا دشوار کر دیا جاتا ہے، تو ان حالات میں جو کارکن نہ ہمت ہارے، نہ حق سے پھرے، نہ باطل پرستوں کے آگے سپر ڈالے، نہ مشتعل ہو کر اپنے دماغ کا توازن کھوئے،

بلکہ اس کے برعکس حکمت اور تدبر اور ثابت قدمی اور راست بازی اور پرہیزگاری اور ایک سچے حق پرست کی سی ہمدردی و خیرخواہی کے ساتھ اپنے مسلک پر قائم اور اپنے ماحول کی اصلاح میں پیہم کوشاں رہے۔ اس کے اندر ان اوصاف عالیہ کا پیدا ہونا اور نشوونما پانا یقینی ہے جو آگے چل کر ہماری اس جدوجہد کے دوسرے مرحلوں میں اس سے بہت زیادہ بڑے پیمانے پر درکار ہوں گے۔

اس تبلیغ کے سلسلے میں ہم نے وہی طریق کار اپنے کارکنوں کو سکھانے کی کوشش کی ہے جو قرآن مجید میں تعلیم فرمایا گیا ہے، یعنی یہ کہ حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ خدا کے راستے کی طرف دعوت دیں۔ تدریج اور فطری ترتیب کو ملحوظ رکھتے ہوئے لوگوں کے سامنے دین کے اولین بنیادی اصولوں کو اور پھر رفتہ رفتہ ان کے مقتضیات اور لوازم کو پیش کریں۔ کسی کو اس کی قوت ہضم سے بڑھ کر خوراک دینے کی کوشش نہ کریں۔ فروع کو اصول پر اور جزئیات کو کلیات پر مقدم نہ کریں۔ بنیادی خرابیوں کو رفع کیے بغیر ظاہری برائیوں اور بیرونی شاخوں کو چھانٹنے اور کاٹنے میں اپنا وقت ضائع نہ کریں۔ غفلت اور اعتقادی و عملی گمراہیوں میں پھنسے ہوئے لوگوں کے ساتھ نفرت و کراہیت کا برتاؤ کرنے کے بجائے ایک طبیب کی سی ہمدردی و خیرخواہی کے ساتھ ان کے علاج کی فکر کریں۔ گالیوں اور پتھروں کے جواب میں دعائے خیر کریں۔ ظلم اور ایذا رسانی پر صبر کریں۔ جاہلوں سے بحثوں اور مناظروں اور نفسانی مجادلوں میں نہ الجھیں۔ لغو اور بیہودہ باتوں سے عالی ظرف اور شریف لوگوں کی طرح درگزر کریں۔ جو لوگ حق سے مستغنی ہو رہے ہیں ان کے پیچھے پڑنے کے بجائے ان لوگوں کی طرف توجہ کریں جن کے اندر کچھ طلب حق پائی جاتی ہو خواہ وہ دنیوی اعتبارات سے کتنے ہی ناقابل توجہ سمجھے جاتے ہوں۔ اور اپنی اس تمام سعی و جہد میں ریا اور نمود و نمائش سے بچیں۔ اپنے کارناموں کو گنانے اور فخر کے ساتھ ان کا مظاہرہ کرنے اور لوگوں کی توجہات اپنی طرف کھینچنے کی ذرہ برابر کوشش نہ کریں۔ بلکہ جو کچھ کریں اس نیت اور اس یقین و اطمینان کے ساتھ کریں کہ ان کا سارا عمل خدا کے لیے ہے، اور خدا بہرحال ان کی خدمات سے بھی واقف ہے اور ان خدمات کی قدر بھی اسی کے ہاں ہونی ہے خواہ خلق اس سے واقف ہو یا نہ ہو اور خلق کی طرف سے سزا ملے یا جزا۔

یہ طریق کار غیر معمولی صبر اور تحمل اور لگاتار محنت چاہتا ہے۔ اس میں ایک مدت دراز تک مسلسل کام کرنے کے بعد بھی شاندار نتائج کی وہ ہری بھری فصل لہلہاتی نظر نہیں آتی جو سطحی اور نمائشی کام شروع کرتے ہی دوسرے دن سے تماشائیوں اور مداریوں کا دل لبھانا شروع کر دیتی ہے۔ اس میں ایک طرف خود کارکن کے اندر وہ گہری بصیرت، وہ سنجیدگی، وہ پختہ کاری اور وہ معاملہ فہمی پیدا ہوتی ہے جو اس تحریک کے زیادہ صبر آزما اور زیادہ محنت و حکمت چاہنے والے مراحل میں درکار ہونے والی ہے، اور دوسری طرف اس سے تحریک اگرچہ آہستہ رفتاری سے چلتی ہے مگر اس کا ایک ایک قدم مستحکم ہوتا چلا جاتا ہے۔ صرف ایسے ہی طریق تبلیغ سے سوسائٹی کا مکھن نکال کر تحریک میں جذب کیا جا سکتا ہے۔ اوچھے اور سطحی لوگوں کی بھیڑ جمع کرنے کے بجائے اس طریق تبلیغ سے سوسائٹی کے صالح ترین عناصر تحریک کی طرف کھنچتے ہیں اور وہ سنجیدہ (Serious) کارکن تحریک کو میسر آتے ہیں جن میں سے ایک ایک آدمی کی شرکت ہزار بوالفضولوں کے انبوہ سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔

ہمارے طریق کار کا ایک بڑا اہم جزء یہ ہے کہ ہم نے اپنے آپ کو نظام باطل کی قانونی اور عدالتی حفاظت سے خود بخود محروم کر لیا ہے اور علی الاعلان دنیا کو بتا دیا ہے کہ ہم اپنے انسانی حقوق، اپنے مال و جان اور عزت و آبرو کسی چیز کی عصمت بھی قائم رکھنے کے لیے اس نظام کی مدد حاصل کرنا نہیں چاہتے جس کو ہم باطل سمجھتے ہیں۔ لیکن اس چیز کو ہم نے تمام ارکان پر لازم نہیں کیا ہے بلکہ ان کے سامنے ایک بلند معیار رکھ دینے کے بعد ان کو اختیار دے دیا ہے کہ چاہیں تو اس معیار کی انتہائی بلندیوں تک پہنچ جائیں ورنہ حالات کی مجبوریوں سے شکست کھا کھا کر جس قدر پستی میں گرنا چاہیں گرتے چلے جائیں۔ البتہ پستی کی ایک حد ہم نے مقرر کر دی ہے کہ اس سے گر جانے والے

کہ ہم اپنی جماعت میں نہ رکھیں گے، یعنی ایسا شخص جو جھوٹا مقدمہ بنائے، یا جھوٹی شہادت دے، یا ایسی مقدمہ بازی میں الجھے جس کے لیے کسی مجبوری کا عذر نہ پیش کیا جا سکے بلکہ وہ سراسر منفعت طلبی یا نفسانیت کی تسکین یا دوستی اور رشتہ داری کی عصبیت ہی پر مبنی ہو، ہماری جماعت میں جگہ نہیں پا سکتا۔

بظاہر لوگ ہمارے اس طریق کار کی حکمتوں کو جو ہم نے قانون و عدالت کے معاملے میں اختیار کیا ہے پوری طرح نہیں سمجھتے اس لیے وہ طرح طرح کے سوالات ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ مگر فی الحقیقت اس کے بے شمار فائدے ہیں۔ اس کا اولین فائدہ یہ ہے کہ ہم اپنا ایک با اصول جماعت ہونا اپنے عمل سے اور ایسے عمل سے ثابت کر دیتے ہیں جو محض تفریحی نوعیت ہی نہیں رکھتا بلکہ صریح طور پر نہایت تلخ اور انتہائی کڑی آزمائشیں اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ خدا کے سوا کسی کو انسانی زندگی کے لیے قانون بنانے کا حق نہیں ہے، اور جب ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ حاکمیت (Sovereignty) صرف خدا کا حق ہے اور خدا کی اطاعت اور اس کے قانون کی پابندی کے بغیر کوئی زمین میں حکم چلانے کا مجاز نہیں ہے، اور جب ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ جو قانونِ الٰہی کی سند کے بغیر معاملاتِ انسانی کا فیصلہ کرے وہ کافر اور فاسق اور ظالم ہے تو ہمارے اس عقیدے اور ہمارے اس دعوے سے خود بخود یہ بات لازم آ جاتی ہے کہ ہم اپنے حقوق کی بنیاد کسی غیر الٰہی قانون پر نہ رکھیں اور حق اور غیر حق کا فیصلہ کسی ایسے حاکم کی حکومت پر نہ چھوڑیں جس کو ہم باطل سمجھتے ہیں۔ اپنے عقیدے کے اس تقاضے کو اگر ہم سخت سے سخت نقصانات اور انتہائی خطرات کے مقابلے میں بھی پورا کر کے دکھا دیں تو یہ ہماری راستی اور ہماری مضبوطیِ سیرت اور ہمارے عقیدے اور عمل کی مطابقت کا ایسا بیّن ثبوت ہو گا جس سے بڑھ کر کسی دوسرے ثبوت کی حاجت نہیں رہتی۔ اور اگر کسی نفع کی امید یا کسی نقصان کا خطرہ یا کسی ظلم و ستم کی چوٹ ہم کو مجبور کر دے کہ ہم اپنے عقیدے کے خلاف کام کر گذریں تو یہ ہماری کمزوری کا اور ہماری سیرت کے بودے پن کا بھی ایک نمایاں ترین ثبوت ہو گا جس کے بعد کسی دوسرے ثبوت کی ضرورت نہ رہے گی۔

اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اپنے ارکان کی پختگی اور ان کے قابلِ اعتماد یا ناقابلِ اعتماد ہونے کا اندازہ کرنے کے لیے ہمارے پاس یہ ایک ایسی کسوٹی ہو گی جس سے ہم بآسانی یہ معلوم کرتے رہیں گے کہ ہم میں سے کون لوگ کتنے پختہ ہیں اور کس سے کس قسم کی آزمائشوں میں ثابت قدم رہنے کی توقع کی جا سکتی ہے۔

اس کا تیسرا اور عظیم الشان فائدہ یہ ہے کہ ہمارے ارکان یہ مسلک اختیار کرنے کے بعد آپ سے آپ اس بات پر مجبور ہو جائیں گے کہ سوسائٹی کے ساتھ اپنے تعلقات کو قانون کی بنیادوں پر قائم کرنے کے بجائے اخلاق کی بنیادوں پر قائم کریں۔ ان کو اپنا اخلاقی معیار اتنا بلند کرنا پڑے گا، اپنے آپ کو اپنے ماحول میں اس قدر راست باز، اتنا متدین، اتنا امین، اتنا خدا ترس اور اس قدر خیر مجسم بنانا پڑے گا کہ لوگ خود بخود ان کے حقوق اور ان کی عزت اور ان کی جان و مال کا احترام کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ کیونکہ اس اخلاقی تحفظ کے سوا ان کے لیے دنیا میں اور کوئی تحفظ نہ ہو گا اور قانونی تحفظ سے محروم ہونے اور پھر اخلاقی تحفظ بھی حاصل نہ کرنے کی صورت میں ان کی حیثیت دنیا میں بالکل ایسی ہو کر رہ جائے گی جیسے جنگل میں ایک بکری بھیڑیوں کے درمیان رہتی ہو۔

اس کا چوتھا فائدہ یہ ہے اور یہ بھی کچھ کم اہم نہیں ہے کہ ہم اس طرح اپنے آپ کو اور اپنے مفاد اور حقوق کو خطرے میں ڈال کر موجودہ سوسائٹی کی اخلاقی حالت کو بالکل برہنہ کر کے دنیا کے سامنے رکھ دیں گے۔ جب لوگ یہ جاننے کے بعد کہ ہم پولیس اور عدالت سے اپنی حفاظت کے لیے کوئی مدد لینے والے نہیں ہیں، ہمارے حقوق پر علی الاعلان ڈاکے ماریں گے تو یہ اس بات کا نمایاں ترین ثبوت ہو گا کہ ہمارے ملک کی اور ہماری

سوسائٹی کی اخلاقی حالت کس قدر کھوکھلی ہے۔ کتنے آدمی ہیں جو صرف اس وجہ سے شریف بنے ہوئے ہیں کہ قانون نے ان کو شریف بنا رہنے پر مجبور کر رکھا ہے۔ کتنے آدمی ہیں جو ہر قسم کی خیانت اور بے ایمانی کرنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں، بشرطیکہ ان کو اطمینان ہو جائے کہ دنیا میں کوئی ان پر گرفت کرنے والا نہیں ہے۔ کتنے آدمی ہیں جنھوں نے مذہب اور اخلاق اور انسانیت کے جھوٹے لبادے اوڑھ رکھے ہیں حالانکہ اگر موقع میسر آجائے اور کوئی رکاوٹ موجود نہ ہو تو ان سے بدترین بداخلاقی اور لامذہبیت اور حیوانیت کا صدور نہایت آسانی کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ یہ اخلاقی ناسور جو چھپا ہوا ہے اور اندر ہی اندر ہماری قومی سیرت کو گلا اور سڑا رہا ہے ہم اس کو علیٰ رؤس الاشہاد بے پردہ کر کے رکھ دیں گے تاکہ ہمارے ملک کا اجتماعی ضمیر چونک پڑے اور اسے ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو کہ جس مرض سے وہ اب تک غفلت برت رہا ہے وہ کتنی دور پہنچ چکا ہے۔

صاحبو! اپنی دعوت اور اپنے طریق کار کی یہ مختصر تشریح میں نے آپ کے سامنے پیش کر دی ہے۔ آپ اس کو جانچیں اور پرکھیں اور اس پر کڑی سے کڑی تنقید کریں اور دیکھیں کہ ہم کس چیز کی طرف بلا رہے ہیں، اور بلانے کے لیے ہم نے جو ڈھنگ اختیار کیا ہے وہ کہاں تک صحیح ہے، کس حد تک خدا اور رسول کی تعلیمات کے مطابق ہے، کس حد تک موجودہ انفرادی و اجتماعی امراض کا صحیح علاج ہے، اور کس حد تک اس سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ ہم اپنے آخری مقصود یعنی کلمۃ اللہ کے بلند اور کلمات باطلہ کے پست ہو جانے کو حاصل کر سکتے ہیں۔ اب میں ان شبہات و اعتراضات پر کچھ عرض کروں گا جو اسی اجتماع کے دوران میں بعض رفقاء اور ہمدردوں کے ذریعے سے مجھ تک پہنچائے گئے ہیں۔

علماء اور مشائخ کی آڑ ایک اعتراض جو پہلے بھی بار بار سن چکا ہوں اور آج بھی وہ میرے پاس تحریری شکل میں آیا ہے، یہ ہے کہ "ایسے بڑے بڑے علماء اور پیشوایانِ دین (جن کے کچھ نام بھی گنائے گئے ہیں) کیا دین سے اس قدر ناواقف تھے کہ نہ صرف یہ کہ خود انھوں نے دین کے ان تقاضوں کو جو تم بیان کرتے ہو نہیں سمجھا اور پورا کرنے کی طرف توجہ نہیں کی بلکہ تمھارے بیان کرنے کے بعد بھی انھوں نے اسے تسلیم نہیں کیا اور نہ تمھارے ساتھ تعاون کرنا قبول کیا؟ کیا یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ سب دین سے ناواقف ہیں؟ یا اس بات کا کہ تم نے خود دین کے نام سے ایک ایسی چیز پیش کی ہے جو مقتضیاتِ دین میں سے نہیں ہے؟" اس سوال کا بہت مختصر جواب میرے پاس یہ ہے کہ میں نے دین کو حال یا ماضی کے اشخاص سے سمجھنے کے بجائے ہمیشہ قرآن اور سنت ہی سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے میں کبھی یہ معلوم کرنے کے لیے کہ خدا کا دین مجھ سے اور ہر مومن سے کیا چاہتا ہے، یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کرتا کہ فلاں اور فلاں بزرگ کیا کہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں بلکہ صرف یہ دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ قرآن کیا کہتا ہے اور رسول نے کیا کیا؟ اسی ذریعہ معلومات کی طرف میں آپ لوگوں کو بھی توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ آپ یہ دیکھیے کہ جس چیز کی طرف میں آپ کو دعوت دے رہا ہوں اور جو طریق کار اس کے لیے پیش کر رہا ہوں آیا قرآن کی دعوت وہی ہے اور انبیاء علیہم السلام کا طریق کار وہی رہا ہے یا نہیں۔ اگر قرآن و سنت سے یہ بات ثابت ہو جائے اور آپ کے نزدیک قرآن و سنت ہی اصل ذریعہ ہدایت ہوں تو میری بات مانیے اور میرے ساتھ آجائیے اور اگر اس دعوت اور اس طریق کار میں کوئی چیز قرآن و سنت سے ہٹی ہوئی ہو تو بے تکلف اسے ظاہر کر دیجیے۔ جس وقت مجھ پر اور میرے رفقاء پر یہ منکشف ہو جائے گا کہ ہم کہیں بال برابر بھی قرآن اور سنت سے ہٹے ہیں تو آپ ان شاء اللہ دیکھ لیں گے کہ ہم حق کی طرف رجوع کرنے میں ایک لمحے کے لیے بھی تامل کرنے والے نہیں ہیں۔ لیکن اگر آپ حق و باطل کا فیصلہ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کی بجائے اشخاص پر رکھنا چاہتے ہیں تو آپ کو پورا اختیار ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنے مستقبل کو اشخاص ہی کے حوالے کر دیجیے اور خدا کے ہاں بھی یہی جواب دیجیے گا کہ ہم نے اپنا دین تیری کتاب اور تیرے رسول کی سنت کے بجائے فلاں اور فلاں لوگوں کے حوالے کر دیا تھا۔ یہ جواب دہی اگر آپ کو خدا کے ہاں بچا سکتی ہے تو اسی پر اطمینان سے کام کرتے رہیے۔

زہد کا طعنہ

ایک اور اعتراض جس کے متعلق مجھے لکھا گیا ہے کہ ایک مخلص ہمدرد نے اسے پیش کیا ہے یہ ہے کہ "تمہاری جماعت محض چند زہاد اور تارکین دنیا کی ایک جماعت ہے جو دنیا کے معاملات سے بے تعلق ہو کر ایک طرف بیٹھ گئی ہے اور جسے سیاسیات حاضرہ سے کوئی بحث نہیں ہے، درآنحالیکہ مسلمانوں کو حالات نے مجبور کر دیا ہے کہ بغیر ایک لمحہ ضائع کیے ان مسائل سیاسی کو حل کریں جن کے حل پر پوری قوم کے مستقبل کا انحصار ہے۔ اور صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ غیر مسلم بھی مجبور ہیں کہ سب سے پہلے اپنے ملک کے سیاسی مستقبل کی فکر کریں کیونکہ اسی پر ان کی فلاح کا مدار ہے، لہذا اس ملک میں جو لوگ بھی زندگی کے عملی مسائل سے دلچسپی و تعلق رکھتے ہیں وہ تو تمہاری طرف توجہ نہیں کر سکتے البتہ کچھ گوشہ نشین و زاویہ پسند لوگ جو مذہبی ذہنیت رکھتے ہوں تمہیں ضرور مل جائیں گے۔" یہ اعتراض دراصل اس سطح بینی کا نتیجہ ہے جس سے ہمارے آجکل کے سیاست کار حضرات معاملات کو دیکھنے اور سمجھنے میں کام لے رہے ہیں۔ یہ لوگ محض سیاسی اشکال اور صورتوں کے ردوبدل کو دیکھتے ہیں اور انہی میں اپنے مسائل کا حل تلاش کرتے ہیں لیکن سیاست کی عمارت جن بنیادوں پر قائم ہوتی ہے ان تک ان کی نگاہ نہیں پہنچتی۔ آپ کے موجودہ سیاسی مسائل جن کی فکر میں آپ لوگ آجکل الجھے ہوئے ہیں کس چیز کے پیدا کردہ ہیں؟ صرف اس چیز کے کہ جن اخلاقی، اعتقادی و فکری اور تہذیبی و تمدنی بنیادوں پر اس ملک کی سوسائٹی قائم تھی وہ اتنی کمزور ثابت ہوئیں کہ ایک دوسری قوم اگرچہ وہ نہایت ہی گمراہ اور نہایت ہی غلط کار تھی مگر بہرحال اپنے اخلاقی اوصاف، اپنی تہذیبی و تمدنی طاقت اور اپنی عملی قابلیتوں کے لحاظ سے وہ آپ سے اتنی زیادہ برتر ثابت ہوئی کہ ہزاروں میل دور سے آکر اس نے آپ کو اپنا محکوم بنا لیا۔ پھر آپ اپنی مدت ہائے دراز کی غفلتوں اور کمزوریوں کی وجہ سے اس حد تک گرے کہ خود اس محکومی کے اندر بھی آپ کی ہمسایہ قومیں آپ کے مقابلے میں زیادہ طاقتور ہو گئیں اور آپ کے لیے یہ سوال پیدا ہو گیا کہ اپنے آپ کو کس کس سے بچائیں، گھر والے سے یا باہر والے سے؟ یہ ہے آپ کی تمام موجودہ سیاسی مسائل کا خلاصہ۔ اور ان مسائل کو آپ بھی اور آپ کی ہمسایہ دوسری ہندوستانی قومیں بھی صرف اس طرح حل کرنا چاہتی ہیں کہ ملک کا سیاسی نظام جس شکل پر قائم ہے اس میں بس کچھ اوپری ردوبدل ہو جائے۔ میں اس سیاست کو اور اس سیاسی طریق کار کو بالکل مہمل سمجھتا ہوں اور اس میں اپنا وقت ضائع کرنے کا کچھ حاصل نہیں پاتا۔ پھر صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ ساری دنیا میں جو سیاسی مسائل اس وقت درپیش ہیں ان کا خلاصہ بھی میرے نزدیک صرف یہ ہے کہ انسان کو جو حیثیت دنیا میں فی الواقع حاصل نہیں تھی اسے خواہ مخواہ اپنی حیثیت بنا لینے پر اس نے اصرار کیا اور اپنے اخلاق، اپنی تہذیب، اپنے تمدن، اپنی معیشت اور اپنی سیاست کی بنیاد خدا سے خود مختاری پر رکھ دی جس کا انجام آج ایک عظیم الشان فساد اور ایک زبردست طوفان فسق و فجور کی شکل میں رونما ہو رہا ہے۔

اس انجام کو انتظام دنیا کی محض ظاہری شکلوں کے ردوبدل سے دور کرنے کے لیے جو کوششیں آج کی جا رہی ہیں انہی کا نام آج "سیاست" ہے۔ اور میرے نزدیک بلکہ فی الحقیقت اسلام کے نزدیک یہ ساری سیاست سراسر لغو اور بے حاصل ہے۔ میں نے اسلام سے جن حقیقتوں کو سمجھا ہے ان کی بنا پر میرے نزدیک ہندوستان کے مسلمانوں کی اور ہندوستان کے سارے باشندوں کی اور تمام دنیائے مسلمین اور دنیائے غیر مسلمین کی سیاست کا حل صرف یہ ہے کہ ہم سب خدا کی بندگی اختیار کریں، اس کے قانون کو اپنا قانون حیات تسلیم کریں اور انتظام دنیا کی زمام اختیار فساق و فجار کے بجائے عباد اللہ الصالحین کے ہاتھ میں ہو۔ یہ سیاست اگر آپ کو اپیل نہیں کرتی اور آپ کچھ دوسری سیاست بازیوں سے اپنے مسائل کو حل کرنا چاہتے ہیں تو آپ کا راستہ الگ ہے اور میرا راستہ الگ۔ جائیے اور جن جن طریقوں سے اپنے مسائل کو حل کرنا چاہتے ہیں حل کر کے دیکھ لیجیے۔ مگر میں اور میرے رفقا علی وجہ البصیرت جس چیز میں

اپنی، اپنی قوم کی، اپنے ملک کی اور ساری دنیا کی فلاح دیکھتے ہیں، اسی پر ہم اپنی ساری کوششیں صرف کرتے رہیں گے۔ اگر دنیا کے لوگ ہماری باتوں کی طرف توجہ کریں گے تو ان کے اپنے لیے بھلا ہے، ورنہ کریں گے تو اپنا کچھ بگاڑیں گے ہمارا کچھ نقصان نہ کر سکیں گے۔

رہی یہ غلط فہمی کہ ہم زاہدوں اور گوشہ نشینوں کا ایک گروہ بنا رہے ہیں تو اگر یہ واقعہ کی غلط تعبیر نہیں ہے اور واقعی غلط فہمی ہی ہے تو اسے ہم صاف صاف رفع کر دینا چاہتے ہیں۔ ہم دراصل ایک ایسا گروہ تیار کرنا چاہتے ہیں جو ایک طرف زہد و تقویٰ میں اصطلاحی زاہدوں اور متقیوں سے بڑھ کر ہو اور دوسری طرف دنیا کے انتظام کو چلانے کی قابلیت و صلاحیت بھی عام دنیاداروں سے زیادہ اور بہتر رکھتا ہو۔ ہمارے نزدیک دنیا کی تمام خرابیوں کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ نیک لوگ نیکی کے صحیح مفہوم سے ناآشنا ہونے کی بنا پر گوشہ گیر ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور پرہیزگاری اسی کو سمجھتے ہیں کہ دنیا کے معاملات ہی سے پرہیز کریں، اور دوسری طرف ساری دنیا کے کاروبار بدوں کے ہاتھ میں آجاتے ہیں جن کی زبان پر نیکی کا نام اگر کبھی آتا بھی ہے تو صرف خلق خدا کو دھوکا دینے کے لیے۔ اس خرابی کا علاج صرف یہی ہو سکتا ہے کہ صالحین کی ایک جماعت منظم کی جائے جو خدا ترس بھی ہو، راست باز اور دیانت دار بھی ہو، خدا کے پسندیدہ اخلاق و اوصاف سے آراستہ بھی ہو اور اس کے ساتھ دنیا کے معاملات کو دنیاداروں سے زیادہ اچھی طرح سمجھے اور خود دنیاداری ہی میں اپنی مہارت و قابلیت سے ان کو شکست دے سکے۔ ہمارے نزدیک اس سے بڑا اور کوئی سیاسی کام نہیں ہو سکتا اور نہ اس سے زیادہ کامیاب سیاسی تحریک اور کوئی ہو سکتی ہے کہ ایسے ایک صالح گروہ کو منظم کر لیا جائے۔ بد اخلاق اور بے اصول لوگوں کے لیے دنیا کی چراگاہ میں بس اسی وقت تک چرنے چگنے کی مہلت ہے جب تک ایسا گروہ تیار نہیں ہو جاتا، اور جب ایسا گروہ تیار ہو جائے گا تو آپ یقین رکھیے کہ نہ صرف آپ کے اس ملک کی بلکہ بتدریج ساری دنیا کی سیاست اور معیشت اور مالیات اور علوم و آداب اور عدل و انصاف کی باگیں اسی گروہ کے ہاتھ میں آجائیں گی اور فساق و فجار کا چراغ ان کے آگے نہ جل سکے گا۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ انقلاب کس طرح رونما ہو گا لیکن جتنا مجھے کل سورج کے طلوع ہونے کا یقین ہے اتنا ہی مجھے اس بات کا بھی یقین ہے کہ یہ انقلاب بہرحال رونما ہو کر رہے گا بشرطیکہ ہمیں صالحین کے ایسے گروہ کو منظم کرنے میں کامیابی حاصل ہو جائے۔

رفقائے جماعت سے خطاب

اب میں آپ لوگوں سے اجازت چاہوں گا کہ تھوڑی دیر کے لیے عام خطاب کو چھوڑ کر خاص طور پر کچھ باتیں اپنے رفقاء سے عرض کروں:

رفقائے محترم! سب سے پہلے آپ سے خطاب کرتے ہوئے میں اسی بات کو دہرانا ضروری سمجھتا ہوں جسے ہمیشہ ہر اجتماع کے موقع پر دہراتا رہا ہوں کہ اپنی اس عظیم الشان ذمہ داری کو محسوس کیجیے جس کو آپ نے شعوری طور پر اپنے خدا سے عہد و میثاق مضبوط کر کے اپنے اوپر خود عائد کر لیا ہے۔ آپ کے اس عہد کا تقاضا صرف یہی نہیں ہے کہ آپ قانون الٰہی کے زیادہ سے زیادہ پابند ہوں، اور آپ کے عقیدے اور قول و عمل میں کامل مطابقت ہو اور آپ کی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہ رہ جائے جس میں آپ کے افکار و اعمال اس اسلام سے مختلف ہوں جس پر آپ ایمان لائے ہیں، بلکہ اس کے ساتھ آپ کے اسی عہد کا تقاضا اور نہایت شدید تقاضا یہ بھی ہے کہ جس اسلام پر آپ ایمان لائے ہیں اور جسے آپ اپنے بادشاہ کا دین سمجھتے ہیں اور جسے آپ تمام نوع انسانی کے لیے حق جانتے ہیں اور واحد ذریعہ فلاح بھی سمجھتے ہیں اس کو تمام دوسرے دینوں اور مسلکوں اور نظاموں کے مقابلے میں سربلند کرنے کے لیے، اور نوع انسانی کو ادیان باطلہ کی فساد انگیز تباہ کاریوں سے بچا کر دین حق کی سعادتوں سے بہرہ ور کرنے کے لیے آپ میں کم از کم اتنی بے چینی پائی جائے جتنی آج ادیان باطلہ کے پیرو

اپنے اپنے جھوٹے اور غارتگر دینوں کی حمایت و برتری کیلیے دکھا رہے ہیں۔ آپ کی آنکھوں کے سامنے اُن لوگوں کی مثالیں موجود ہیں جو سخت سے سخت خطرات، شدید سے شدید نقصانات، جان و مال کے زیاں، ملکوں کی تباہی اور اپنی اور اپنی اولاد اور اپنے عزیزوں اور جگر گوشوں کی قربانی صرف اس لیے گوارا کر رہے ہیں کہ جس طریق زندگی کو وہ صحیح سمجھتے ہیں اور جس نظام میں اپنے لیے فلاح کا امکان انھیں نظر آتا ہے اسے نہ صرف اپنے ملک پر بلکہ ساری دنیا پر غالب کر کے چھوڑیں۔ ان کے صبر اور ان کی قربانیوں اور محنتوں اور ان کے تحمل مصائب اور اپنے مقصد کے ساتھ اُن کے عشق کا موازنہ آپ اپنے عمل سے کر کے دیکھیے اور محسوس کیجیے کہ آپ اس معاملے میں ان کے ساتھ کیا نسبت رکھتے ہیں۔ اگر فی الواقع آپ کبھی ان کے مقابلے میں کامیاب ہو سکتے ہیں تو صرف اُسی وقت جبکہ ان حیثیات میں آپ ان سے بڑھ جائیں، ورنہ آپ کے مالی ایثار، آپ کے وقت اور محنت کے ایثار، اور اپنے مقصد کے ساتھ آپ کی محبت اور اس کے لیے آپ کی قربانی کا جو حال اس وقت ہے اس کو دیکھتے ہوئے تو آپ یہ حق بھی نہیں رکھتے کہ اپنے دل میں اس تمنا کو پرورش کریں کہ آپ کے ہاتھوں یہ جھنڈا کبھی بلند ہو۔

دوسری چیز جس کی طرف مجھے آپ کو توجہ دلانے کی بار بار ضرورت محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ لوگ دین کے اصولی اور بنیادی امور کی اہمیت کو سمجھیں اور فروع کے ساتھ جو اہتمام اب تک کرتے رہے ہیں اور جس اہتمام کی بیماری آپکے سارے مذہبی ماحول کو لگی ہوئی ہے اس سے بچنے کی کوشش کریں۔ میں دیکھتا ہوں کہ میری اور جماعت کے چند دوسرے صاحب علم و نظر رفقاء کی کوششوں کے باوجود ہماری جماعت میں ابھی تک ان جزئیات کے ساتھ اچھا خاصا انہماک بلکہ غلو پایا جاتا ہے جن پر ایک مدت سے فرقہ بندیاں اور گروہی کشمکشیں ہوتی رہی ہیں اور یہ کیفیت بسا اوقات اتنی بڑھ جاتی ہے کہ ہماری تفہیم سے اس طریقے کو چھوڑنے کے بجائے ہمارے بعض رفقاء الٹے ہمیں کو ان بحثوں میں الجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ خوب اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ جن جزئیات پر آپ لوگ بحثیں کرتے ہیں وہ خواہ کتنی ہی اہمیت رکھتی ہوں مگر بہرحال یہ وہ چیزیں نہیں ہیں جن کو قائم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کو مبعوث کیا ہو اور اپنی کتابوں کو نازل کیا ہو۔ انبیا کی بعثت اور کتب الٰہی کی تنزیل کا مقصد ان جزئیات کو قائم کرنا نہیں ہے بلکہ دین حق کو قائم کرنا ہے۔ ان کا اصل مقصد یہ رہا ہے کہ خلق خدا اپنے مالک حقیقی کے سوا کسی کی تابع فرمان نہ رہے، قانون صرف خدا کا قانون ہو، تقویٰ صرف خدا سے ہو، امر صرف خدا کا مانا جائے، حق اور باطل کا فرق اور زندگی میں راہ راست کی ہدایت صرف وہی مسلّم ہو جسے خدا نے واضح کیا ہے، اور دنیا میں ان خرابیوں کا استیصال کیا جائے جو اللہ کو ناپسند ہیں، اور ان خیرات و حسنات کو قائم کیا جائے جو اللہ کو محبوب ہیں۔ یہ ہے دین اور اسی کی اقامت ہمارا مقصد ہے اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے اسی کام پر ہم مامور ہیں۔ اس کام کی اہمیت اگر آپ پوری طرح محسوس کر لیں، اور اگر آپ کو اس بات کا بھی احساس ہو کہ اس کام کے معطل ہو جانے اور باطل نظاموں کے دنیا پر غالب ہو جانے سے دنیا کی موجودہ حالت کس قدر شدت سے غضب الٰہی کی مستحق ہو چکی ہے، اور اگر آپ یہ بھی جان لیں کہ اس حالت میں ہمارے لیے غضب الٰہی سے بچنے اور رضائے الٰہی سے سرفراز ہونے کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں ہے کہ ہم اپنی تمام قوت خواہ وہ مال کی ہو یا جان کی، دماغ کی ہو یا زبان کی، صرف اقامت دین کی سعی میں صرف کر دیں تو آپ سے کبھی ان فضول بحثوں اور ان لایعنی افکار کا صدور نہ ہو سکے جن میں اب تک آپ میں سے بہت سے لوگ مشغول ہیں۔ میرے نزدیک یہ تمام مشاغل صرف اس ایک چیز کا نتیجہ ہیں کہ لوگوں نے ابھی تک اس بات کو پوری طرح سمجھا نہیں ہے کہ دین حقیقت میں کس چیز کا نام ہے اور اس کے واقعی مطالبات اپنے پیرووں سے کیا ہیں۔

ایک اور خامی جو ہمارے بعض رفقا میں پائی جاتی ہے اور جو اکثر ہمارے لیے سبب پریشانی بنتی رہتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ حضرات اصول اور مقصد اور نظریے کی حد تک تو اس جماعت کے مسلک کو سمجھ گئے ہیں لیکن طریق کار کو اچھی طرح نہیں سمجھے، اس لیے بار بار ان کی توجہات دوسری مختلف جماعتوں کے طریقوں کی طرف پھر جاتی ہیں اور وہ کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر کے بطور خود ہمارے نصب العین اور دوسروں کے طریق کار کی ایک معجون مرکب بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور جب انھیں اس سے روکا جاتا ہے تو وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم خواہ مخواہ ایک اچھے چلتے ہوئے زود اثر طریق کار کو محض اس تعصب کی بنا پر اختیار نہیں کرنا چاہتے کہ وہ ہمارا نہیں بلکہ دوسروں کا ایجاد کردہ طریقہ ہے۔ بعض حضرات نے تو ستم ہی کر دیا کہ جب ہماری طرف سے ان کو ٹوکا گیا تو انھوں نے ہمیں یہ اطمینان دلانے کی کوشش کی کہ نام آپ ہی کا لیا جائے گا دوسروں کا نہ لیا جائے گا۔ گویا ان کے نزدیک ہماری ساری تگ و دو صرف اپنا رجسٹرڈ ٹریڈ مارک چلانے کے لیے ہے، اور لطف یہ ہے کہ یہ سمجھتے ہوئے بھی وہ ہمارے ساتھ اس جماعت میں شریک ہیں۔ ہماری جماعت کی بعض مقامی شاخیں اس وبا سے خاص طور پر بہت زیادہ متاثر ہوئی ہیں، لیکن جہاں تاثر اتنا زیادہ نہیں ہے وہاں بھی مختلف طریقوں سے اس بات کا اظہار ہوتا رہتا ہے کہ کوئی تیز رفتار طریق کار اختیار کر کے جلدی سے کچھ چلتا پھرتا کام دنیا کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ یہ سب عمل بلا فکر کی اس پرانی بیماری کے نتائج ہیں جو مسلمانوں میں بہت دنوں سے پرورش پا رہی ہے اور فکر بلا عمل سے کچھ کم خطرناک نہیں ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر ان مذہبی اور سیاسی تحریکوں میں سے کسی میں بھی فی الواقع کوئی جان ہوتی جو اس وقت مسلمانوں میں چل رہی ہیں تو شاید ہم اس جماعت کی تاسیس میں ابھی کچھ تامل سے کام لیتے اور اپنی پوری قوت ان نسخوں کو آزما لینے میں صرف کر دیتے۔ مگر جو تھوڑی بہت نظر و بصیرت اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا کی ہے اس کی بنا پر ہم خوب اچھی طرح یہ سمجھ چکے ہیں کہ وقت کی چلتی ہوئی تحریکوں اور ان کی قیادتوں میں سے ایک بھی مسلمانوں کے مرض کا صحیح علاج نہیں ہے، اور نہ اسلام کے اصل منشا کو پورا کرنے والی ہے۔ محض جزوی طور پر مسلمانوں کے امراض کی ناکافی اور سطحی تشخیص کی گئی ہے اور اسلام کے اصل تقاضوں کا بھی صحیح طور پر ادراک نہیں کیا گیا ہے۔ پھر یہ بھی اچھی طرح نہیں سمجھا گیا کہ کفر و فسق کا یہ غلبہ اور دین کی یہ بے بسی اور مغلوبی جو آج موجود ہے فی الحقیقت کن اسباب کا نتیجہ ہے اور اب اس حالت کو بدلنے کے لیے کس ترتیب و تدریج سے کن کن میدانوں میں کیا کیا کام کرنا ہے۔ ان سب چیزوں کو سوچے اور سمجھے بغیر جو علمی اور حزبی تحریکیں جاری کی گئیں اور ان کو چلانے کے لیے جو زود اثر اور فی الفور نتیجہ منظر عام پر لے آنے والے طریقے اختیار کیے گئے وہ سب ہمارے نزدیک چاہے غلط نہ ہوں، چاہے ان کی مذمت ہم نہ کریں، اچھا ہے ان کی اور ان کے پیچھے کام کرنے والے اخلاص کی ہم دل سے قدر کریں مگر بہرحال ہم ان کو لاحاصل سمجھتے ہیں اور ہمیں پوری طرح یقین ہے کہ اس قسم کی تحریکیں اگر صدیوں تک بھی پوری کامیابی اور ہنگامہ خیزی کے ساتھ چلتی رہیں تب بھی نظام زندگی میں کوئی حقیقی انقلاب رونما نہیں ہو سکتا۔ حقیقی انقلاب اگر کسی تحریک سے رونما ہو سکتا ہے تو وہ صرف ہماری یہ تحریک ہے اور اس کے لیے فطرتاً بھی ایک طریق کار ہے جو ہم نے خوب سوچ سمجھ کر اور اس دین کے مزاج اور اس کی تاریخ کا گہرا جائزہ لے کر اختیار کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارا طریق کار نہایت صبر آزما اور سست رفتار ہے، جلدی سے کوئی محسوس نتیجہ اس سے رونما نہیں ہو سکتا اور اس میں برسوں تک لگاتار ایسی محنت کرنی پڑتی ہے جس کے اثرات، اور جس کی عملی نمو کو بسا اوقات خود محنت کرنے والا بھی محسوس نہیں کر سکتا لیکن اس راہ میں کامیابی کا راستہ یہی ہے اور اس کے سوا کوئی دوسرا طریق کار اس مقصد کے لیے ممکن نہیں ہے۔ جن لوگوں کو ہمارے مسلک اور طریق کار یا ان دونوں میں سے کسی ایک پر بھی اطمینان حاصل نہ ہو ان کے لیے یہ راستہ تو کھلا ہوا ہے کہ جماعت سے باہر جا کر اپنی صوابدید سے جس طرح چاہیں کام

کریں لیکن یہ اختیار انھیں کسی طرح نہیں دیا جا سکتا کہ بطور خود وہ ان دونوں میں یا ان میں سے کسی ایک چیز میں جو ترمیم چاہیں کرلیا کریں۔ ہمارے ساتھ جس کو چلنا ہے اسے پورے اطمینان کے ساتھ ہمارے مسلک اور طریق کار کو ٹھیک سمجھ کر چلنا چاہیے اور جو شخص کچھ بھی میلان دوسری تحریکوں اور جماعتوں کی طرف رکھتا ہو اسے پہلے ان راستوں کو آزما کر دیکھ لینا چاہیے پھر اگر اس کا ذہن انھی فیصلوں پر پہنچ جس پر ہم پہنچے ہوئے ہیں تو وہ اطمینان قلب کے ساتھ ہمارے ساتھ آجائے۔

سطحیت اور مظاہرہ پسندی اور جلد بازی کی جو کمزوری مسلمانوں میں بالعموم پیدا ہو گئی ہے اس کا ایک ثبوت مجھے حال میں ملا ہے۔ عوام میں تعلیم بالغان کے ذریعے سے کام کرنے کا جو طریقہ چند ماہ پیشتر میں نے پیش کیا تھا اس نے تو بہت کم لوگوں کو اپیل کیا، مگر گروہ بنا کر بستیوں میں گشت لگانے اور فوری نتیجہ دکھانے والے طریق کار کے لیے (خواہ اس کا اثر کتنا ہی ناپائیدار ہو) مختلف مقامات سے ہمارے رفقا کے تقاضے برابر چلے آرہے ہیں اور کسی فہمائش پر بھی ان کا سلسلہ ٹوٹنے میں نہیں آتا۔ حالانکہ ایک طرف یہ طریق کار ہے کہ ایک سال یا اس سے زیادہ مدت تک ناخواندہ عوام میں سے چند آدمیوں کو پیہم تعلیم و تربیت دے کر خوب پختہ کر لیا جائے اور ان کے عقائد، اخلاق، اعمال، مقصد زندگی، معیار قدر و قیمت، ہر چیز کو پوری طرح بدل ڈالا جائے اور پھر ان کو اپنی جماعت کا مستقل کارکن بنا کر، مزدوروں، کسانوں اور دوسرے عامی طبقوں میں کام کرنے کے لیے استعمال کیا جائے، اور دوسری طرف یہ طریق کار ہے کہ ایک قلیل مدت میں ہزارہا آدمیوں کو بیک وقت چند ابتدائی امور دین کی حد تک مخاطب کیا جائے اور فوری طور پر ان میں ایک حرکت پیدا کر کے چھوڑ دیا جائے چاہے دوسرے چلہ کے وقت پہلی حرکت کا کوئی اثر ڈھونڈھے بھی نہ مل سکے۔ ان دونوں طریقوں میں سے جب میں دیکھتا ہوں کہ لوگ پختہ نتائج پیدا کرنے والے دیر طلب، محنت طلب اور صبر آزما طریقے کو سنتے ہیں اور اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتے، اور دوسرے طریقے کی طرف بار بار دوڑ چلنے کی کوشش کرتے ہیں تو میرے سامنے مسلمانوں کی وہ کمزوریاں بالکل بے نقاب ہو جاتی ہیں جن کی وجہ سے اب تک وہ خام کاریوں ہی میں اپنی قوتیں اور محنتیں، اور اپنے مال اور اوقات ضائع کرتے رہے ہیں۔ میں اس سلسلے میں زیادہ سے زیادہ اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ جب تک اس جماعت کی باگیں میرے ہاتھ میں ہیں میں اپنے رفقا کو صحیح اور حقیقی نتیجہ خیز کاموں ہی پر لگانے کی کوشش کروں گا اور بے حاصل کوششوں میں جانتے بوجھتے ان کو مشغول نہ ہونے دوں گا۔

اپنی تقریر کو ختم کرنے سے پہلے ایک آخری بات کی طرف میں آپ لوگوں کو توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں۔ ہمارے حلقۂ رفقا میں ایک اچھا خاصا گروہ ایسا پایا جاتا ہے جس نے تبلیغ و اصلاح کے کام میں تشدد اور سخت گیری کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ جو سوالات ان کی طرف سے اکثر میرے پاس آتے رہتے ہیں ان سے میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ ان کے اندر بگڑے ہوئے لوگوں کو سنوارنے کی بے تابی اتنی زیادہ نہیں ہے جتنی انھیں اپنے سے کاٹ پھینکنے کی بیتابی ہے۔ وہی حرارت اسنے ان میں ہمدردی اور خیر خواہی کا جذبہ اتنا نہیں ابھارا جتنا نفرت اور غصے کا جذبہ ابھار دیا ہے۔ اسی وجہ سے وہ اکثر یہ تو پوچھتے ہیں کہ جو لوگ ایسے اور ایسے ہیں ان سے ہم تعلقات کیوں نہ منقطع کر لیں اور ان کے ساتھ نمازیں کیوں پڑھیں اور ان کو کافر و مشرک کیوں نہ کہیں۔ لیکن یہ پوچھنے کا ان کو بہت کم خیال آتا ہے کہ ہم اپنے ان بھٹکے ہوئے بھائیوں کو سیدھی راہ پر کیسے لائیں، ان کی غفلت و بے خبری کو کس طرح دور کریں، ان کی کج روی کو راست روی سے کیسے بدلیں، اور ان کو نور ہدایت سے مستفید ہونے پر کیونکر آمادہ کریں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے اللہ کے فضل سے اور اپنی خوش قسمتی سے حق کو پا لیا ہے ان کے اندر اس وجدانِ حق نے شکر کے بجائے کبر کا جذبہ پیدا

کردیا ہے اور اسی کا اظہار ان شکلوں میں ہو رہا ہے۔ خدا نہ کرے کہ میرا یہ گمان صحیح ہو لیکن میں یہ صاف صاف اس لیے بیان کر رہا ہوں کہ ہمارے رفیقوں میں سے ہر شخص پوری خدا ترسی کے ساتھ اپنے نفس کا جائزہ لے کر تحقیق کرنے کی کوشش کرے کہ کہیں شیطان نے یہ رخنہ تو ان کو نہیں لگا دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بگڑی ہوئی سوسائٹی کے درمیان علم صحیح اور عمل صالح رکھنے والوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک وبائے عام میں مبتلا ہو جانے والی بستی کے درمیان چند تندرست لوگ موجود ہوں جو کچھ طب کا علم بھی رکھتے ہوں اور کچھ دواؤں کا ذخیرہ بھی ان کے پاس ہو۔ مجھے بتایئے کہ اس وبا زدہ بستی میں ایسے چند لوگوں کا حقیقی فرض کیا ہے؟ کیا یہ کہ مریضوں سے اور ان کو لگی ہوئی آلائشوں سے نفرت کریں یا انھیں اپنے سے دور بھگائیں اور انھیں چھوڑ کر نکل جانے کی کوشش کریں یا یہ کہ اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر ان کا علاج اور ان کی تیمارداری کرنے کی فکر کریں، اور اس سعی میں اگر کچھ نجاستیں ان کے جسم و لباس کو لگ بھی جائیں تو انھیں برداشت کرلیں۔ شاید میں پورے وثوق کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ اگر یہ لوگ پہلی صورت اختیار کریں تو خدا کے ہاں الٹے مجرم قرار پائیں گے اور ان کی اپنی تندرستی اور ان کا علم طب سے واقف ہونا اور ان کے پاس دواؤں کا ذخیرہ موجود ہونا نافع ہونے کے بجائے الٹا ان کے جرم کو اور زیادہ سخت بنا دے گا۔ اسی پر آپ قیاس کرلیں کہ جن لوگوں کو دینی تندرستی حاصل ہے اور جو دین کا علم اور اصلاح کے ذرائع بھی رکھتے ہیں ان کے لیے کونسا طریقہ رضائے الٰہی کے مطابق ہے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

اس تقریر کے بعد اجتماع کا اجلاس اول ختم ہوا اور نمازِ عصر سے نماز مغرب تک کا وقفہ دیا گیا۔

اجلاس دوم

(تاریخ مذکور، بعد نماز مغرب)

اس اجلاس میں صوبہ بہار کی رپورٹ سید محمد حسنین صاحب قیم جماعت صوبہ بہار نے، اور صوبہ سرحد کی رپورٹ تاج الملوک صاحب نے پیش کی۔ اس کے بعد امیر جماعت نے ان رپورٹوں پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

(۱) جن مقامات سے ارکانِ جماعت اجتماع میں شریک ہونے کے لیے نہیں آئے اور انھوں نے کوئی عذر بھی پیش نہیں کیا ان کے متعلق یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ بلا عذر نہیں آئے۔ ایسے ارکان سے مقامی جماعتوں کے امراء کو باز پرس کرنی چاہیے۔ اگر پہلے ان کا رویہ جماعت میں درست رہا ہے تو انھیں صرف تنبیہ کر دینی چاہیے تاکہ آئندہ ان سے یہ کمزوری سرزد نہ ہو اور اگر پہلے سے ان کا طرزِ عمل جماعت کے کاموں میں عدم دلچسپی کا رہا ہو تو ان سے صاف کہہ دینا چاہیے کہ وہ جماعت کی رکنیت سے الگ ہو جائیں۔ عذر کے لیے ہم نے "عذر شرعی" کی قید لگائی ہے اس کے لحاظ سے کاروبار کا حرج یا مالی نقصان کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اگر ہمارے رفقاء اس وقت اتنی قربانی بھی نہیں کر سکتے تو آئندہ ان سے کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ ہمارے رفقاء میں متعدد ایسے لوگ بھی ہیں جو ملازم تھے اور انھیں چھٹی نہ مل سکی مگر وہ پھر بھی اجتماع میں شریک ہونے کے لیے آگئے اور اب وہ اس کے نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہیں۔ ایسے ہی لوگ ہمارے نقطۂ نظر سے قابلِ اعتماد ہیں۔ جو ارکان جماعت محض کاروباری نقصان کے خطرے سے نہیں آئے ہیں ان سے صاف کہہ دینا چاہیے کہ اب آپ اپنے کاروبار ہی کی خدمت کرتے رہیں،

اس عظیم الشان نصب العین کی خدمت کا نام لینا آپ کے لیے کچھ موزوں نہیں ہے۔ البتہ جو ارکان جماعت مالی کمزوری کی وجہ سے نہیں آسکے ہیں ان کا عذر معقول ہے۔ مگر جو دوسرے ارکان ان کے مصارف برداشت کرنے کے قابل تھے اور انھیں اپنے بھائیوں کی مجبوری کا علم بھی تھا اور پھر بھی انھوں نے اپنے ان بھائیوں کو ساتھ لانے کی کوشش نہیں کی ان پر ایسے ارکانِ جماعت کی عدم شرکت کا از روئے ضابطہ چاہے کوئی بار نہ ہو لیکن اخلاقی طور پر وہ اس کے ذمہ دار ہیں۔ ایسے حضرات کو اپنی اس تنگ دلی کو رفع کرنے کی فکر کرنی چاہیے ورنہ جن سے آج یہ تھوڑا تھوڑا مالی ایثار بھی برداشت نہیں ہوسکتا ان سے کل کسی بڑے ایثار کی کیا توقع کی جاسکتی ہے۔

(۲) جن حلقوں کے لیے قیم جماعت بنا دیے گئے ہیں ان کی جماعتیں اپنی رپورٹیں براہ راست مرکز کو بھیجنے کے بجائے اپنے حلقے کے قیم کو بھیجیں، اور قیم جماعت پورے حلقے کی رپورٹ مرکز میں روانہ کریں۔

(۳) جہاں جہاں جماعتیں قائم ہیں وہاں کے ارکان اپنی زکوٰۃ مقامی بیت المال میں داخل کریں اور باقاعدہ حساب دیں کہ ان کا مال کس قدر تھا اور اس پر انھوں نے کتنی زکوٰۃ ادا کی۔ جماعتی بیت المال کی موجودگی میں لوگوں کو اپنی زکوٰۃ انفرادی طور پر نکال کر خرچ نہیں کرنی چاہیے۔ جو لوگ صاحب نصاب ہوں اور باقاعدہ زکوٰۃ ادا نہ کریں ان کی شرعی حیثیت وہی ہے جو نماز نہ پڑھنے والوں کی ہے اور ایسے لوگ ہماری جماعت میں نہیں رہ سکتے۔

(۴) جن حضرات نے بعض علماء سے اپنی گفتگوؤں کا ذکر کیا ہے ان کو میں اپنی اس ہدایت کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں جو میں نے تشکیل جماعت کے آغاز میں دی تھی اور روداد اجتماع اول میں اسے پھر دیکھا جاسکتا ہے۔ میں نے اس میں کہا تھا کہ ہر آدمی کو اسی حلقے میں جانا چاہیے جس حلقے کے لوگوں سے خطاب کرنے کی اس میں اہلیت ہو۔ خصوصیت کے ساتھ غیر عالم لوگوں کو علماء کے پاس جاکر اپنی دعوت پیش کرنے میں تو بہت زیادہ احتیاط کرنی چاہیے کیونکہ ان حضرات کے مسائل بہت پیچیدہ اور نازک ہیں، اور فتنہ ہر وقت ان کے پاس حاضر رہتا ہے۔ ان کے نفسیات کچھ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو دین میں گہری بصیرت رکھنے کے ساتھ ان کے "دینیات" سے بھی واقف ہیں۔ ان کو راہ حق کی طرف دعوت دینا نئے تعلیم یافتہ لوگوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ وہ ان کے پاس جائیں گے تو کچھ کام بنانے کے بجائے اُلٹا کوئی خطرہ مول لے آئیں گے

(۵) آج کی رپورٹ میں یہ بیان کیا گیا ہے اور اس سے پہلے بھی یہ اعتراض میں اکثر سنتا رہا ہوں کہ بعض حلقوں میں جب ہماری دعوت پہنچتی ہے تو اس کا جواب یہ کہہ کر دیا جاتا ہے کہ "ہماری تحریک میں کوئی نہ کوئی چیز مشتبہ ضرور ہے ورنہ کیسے ممکن تھا کہ تم یہ دعوت دیتے اور فلاں طاقت اسے ٹھنڈے دل سے برداشت کرلیتی"۔ دراصل اس قسم کی باتیں وہ لوگ کرتے ہیں جن کے اندر خود حق و باطل کی کوئی تمیز نہیں ہے اور انھوں نے صرف کسی دشمن طاقت کو حق کے پہچاننے کا کام سپرد کردیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جس چیز پر دشمن بھڑکے وہ حق ہے اور جس چیز کو وہ برداشت کرلے وہ باطل ہے۔ اس معیار حق و باطل پر جو لوگ تکیہ کیے بیٹھے ہیں ہمیں یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ ان میں ایک اچھا خاصا گروہ علماء دین کا بھی ہے۔ ہم ان سے عرض کرتے ہیں کہ اگر فی الواقع آپ کے پاس دین کا علم موجود ہے تو سب سے پہلے قرآن وحدیث کے معیار سے پرکھ کر یہ دیکھیے کہ جس چیز کی دعوت ہم دے رہے ہیں وہ بجائے خود حق ہے یا نہیں۔ اس کے بعد پھر اس امر پہ غور کیجیے کہ اگر یہ حق ہے تو آخر بات کیا ہے کہ شیطان اور اولیائے شیطان

اسے برداشت کرنے لگے ہیں؟ کیا حق کی فطرت بدل گئی ہے یا شیطان اب وہ نہیں رہا ہے جو پہلے تھا؟ اس پہلو پر جب آپ غور کریں گے تو آپ پر خود یہ بات منکشف ہو جائے گی کہ اتنا بڑا انقلاب، یعنی توحید خالص کی دعوت کا شیطان کے لیے قابلِ برداشت ہو جانا خود آپ حضرات کی اپنی غلطیوں کا نتیجہ ہے۔ آپ ہی نے تمام اُن الفاظ اور اصطلاحات کی جان نکال دی ہے جن کے ذریعے سے دین کی دعوت قرآن وسنت میں پیش کی گئی تھی۔ الٰہ، اور رب، دین، اور عبادت، شرک اور توحید، طاغوت اور فتنہ وفساد، معروف اور منکر، خیر اور صلاح غرض ایسے تمام الفاظ جو اسلام کی روح کو پیش کرنے کے لیے شریعت میں اختیار کیے گئے تھے آج آپ ہی حضرات کے تصرفات کی بدولت اتنے بے معنی ہو گئے ہیں کہ طاغوت کی چھاؤنیوں تک میں اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا پانچ وقت اعلان ہوتا ہے اور وہاں اس سے ذرہ برابر بھی کوئی کھلبلی برپا نہیں ہوتی بلکہ خود طاغوت اپنے جاں نثاروں کے لیے امام اور موذن اور خطیب پورے اطمینان کے ساتھ مہیا کرتا ہے، اور اس کے سرفروش خادموں میں اگر پورے کا پورا قرآن بھی مفت تقسیم کیا جائے تو وہ اس سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتا۔ اس طرح دین کو شیطان کے لیے بالکل بے ضرر و بے خطر بنا چکنے کے بعد اب آپ لوگ دوسری خدمت یہ انجام دینا چاہتے ہیں کہ اگر دین کی وہی دعوت قرآن وسنت کی انہی اصل اصطلاحوں میں پیش کی جائے اور شیطان اور دنیائے شیطان اس پر نہ بھڑکیں تو آپ اسے اس بات کا ثبوت قرار دیتے ہیں کہ یہ دین کی دعوت ہی نہیں ہے یا یہ حق نہیں ہے۔ ہم اس وقت اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ اسلام کی ان تمام اصطلاحات میں پھر وہی معنی پیدا کریں جو فی الاصل ان کے اندر پنہاں تھے اور کلمۂ اسلام کے ماننے اور بولنے والے اسے اس کے پورے معنی کے ساتھ نہ صرف مانیں اور بولیں بلکہ اپنی پوری زندگی میں اسی شعور کا اظہار بھی کریں۔ ہماری اس کوشش کے پوری طرح بارآور ہونے میں ظاہر ہے کہ ابھی بہت دیر لگے گی اور جب تک یہ بارآور نہ ہو شیطان اور اس کے اولیا مطمئن رہیں گے اور دوسرے محاذوں پر اپنی قوت صرف کرتے رہیں گے۔ خصوصاً جبکہ انھیں یہ بھی اطمینان ہے کہ احیاء دین کی اس کوشش کو مٹانے کے لیے آپ حضرات کافی ہو سکتے ہیں تو پھر وہ خونِ شہیداں اپنی گردن پر کیوں لیں؟ البتہ اگر ہم اپنی اس سعی میں کامیاب ہو گئے اور آپ کے فتنوں سے بھی بخیریت بچ نکلے تو بعید نہیں کہ صورت حال اُس سے بھی زیادہ سخت ہو جتنا سخت آپ اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔ مگر اندیشہ ہے، اور خدا کرے کہ ہمارا یہ اندیشہ غلط ہو، کہ آپ اس وقت بھی ہمارا ساتھ نہ دینے کے لیے اسی قسم کا کوئی بہانہ تلاش کر لیں گے جیسا کہ آج آپ نے تلاش کر لیا ہے۔

(۶) صوبہ سرحد کے ارکان نے اپنے راستے کی جن رکاوٹوں کا ذکر کیا ہے وہ بلاشبہ بہت وزنی رکاوٹیں ہیں اور ہر ایسے علاقے میں جہاں تعصب اور ضد اور شعلہ مزاجی کا زور ہو ایسی رکاوٹوں کا موجود ہونا فطری امر ہے لیکن میں اپنے رفقاء کو یہ اچھی طرح سمجھا دینا چاہتا ہوں کہ حکیمانہ تبلیغ، جبکہ وہ صبر اور حلم اور لگاتار محنتوں کے ساتھ ہو، وہ زبردست ہتھیار ہے جس سے مخالفتوں کے بڑے بڑے پہاڑ کٹ جاتے ہیں اور راستہ ہموار ہو جاتا ہے۔ جن لوگوں کو روسی ترکستان کے حالات کا علم ہے وہ جانتے ہیں کہ اب سے پچیس سال پہلے وہاں اسلام کے خلاف ذرا سی بھاپ بھی منہ سے نہیں نکالی جا سکتی تھی لیکن اشتراکیوں نے جس حکمت اور صبر کے ساتھ خود اپنے الحاد اور مادہ پرستانہ پروگرام کی تبلیغ کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند سال ہی کے اندر اسلام کے اس پرانے قلعہ کی جڑیں ہل گئیں اور خود انہی مسلمانوں نے جو بظاہر اسلام میں بڑے پختہ تھے اشتراکی تبلیغ سے متاثر ہو کر اپنے

ہاتھوں سے اسلام کی بنیادیں ڈھادیں۔ اگر حکمت اور صبر کے ساتھ باطل یہ سب کچھ کر سکتا ہے درانحالیکہ وہ انسانی فطرت سے بعید تر ہے تو میں نہیں سمجھتا کہ حق کم از کم اتنا ہی کچھ کیوں نہیں کر سکتا جبکہ وہ فطرت انسانی سے قریب تر ہے۔ پس حالات اس وقت خواہ کتنے ہی مخالف ہوں ان سے ہمت نہ ہاریے، کتاب و سنت سے اور دنیا کے تجربات سے تبلیغ کی حکمت سیکھیے اور وہ اوصاف اپنے اندر پیدا کیجیے جن سے بنجر زمینوں کو بار آوری کے لیے تیار کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ خدا کے فضل سے ساری رکاوٹیں دور ہو کر رہیں گی۔

نوٹ:۔ صوبہ سرحد میں اس وقت تک باقاعدہ جماعت نہیں بلکہ منتشر ارکان تھے۔ مگر اس اجلاس کے بعد امیر جماعت کی ہدایت کے مطابق باقاعدہ جماعت کی تشکیل کر دی گئی اور جناب سردار علی خاں صاحب (موضع سیر، ڈاکخانہ تخت بائی ضلع پشاور) اس صوبے کے لیے قیم مقرر کیے گئے۔

اجلاس سوم

(۷ رجادی الاول ۱۳۶۴ھ بروز جمعہ۔ ۹ بجے صبح)

یہ اجلاس ٹھیک وقت پر مسجد میں شروع ہوا۔ سب سے پہلے چودھری غلام محمد صاحب نے صوبہ سندھ کے حالات اجمالاً بیان کیے اور ان اسباب کو بھی مختصراً پیش کیا جن کی وجہ سے اب تک سندھ ہماری تحریک سے غیر متاثر رہا ہے۔ اس کے بعد جے۔ بشیر احمد صاحب نے بمبئی کی رپورٹ پڑھ کر سنائی۔ پھر ریاست حیدر آباد کے مختلف مقامات کی رپورٹیں پیش ہوئیں۔ اس کے بعد صوبہ مدراس اور مالابار اور میسور کی رپورٹیں پڑھی گئیں۔ آخر میں امیر جماعت نے ان رپورٹوں پر حسب ذیل تبصرہ کیا:۔

(۱) رات سے اب تک جو رپورٹیں پیش ہوئی ہیں ان کو سننے سے یہ اندازہ ہوا کہ ہمارے رفقاء جماعت اپنی رپورٹیں مرتب کرنے میں غیر ضروری تفصیلات شامل کر دیتے ہیں اور ضروری تفصیلات بسا اوقات چھوڑ جاتے ہیں۔ اس طریقے کی اصلاح ہونی چاہیے۔ رپورٹوں میں ایسی چیزیں نہیں آنی چاہئیں جو محض مقامی حیثیت رکھتی ہوں اور جن کے بیان کرنے یا نہ کرنے کا اصل معاملات کو سمجھنے میں کوئی دخل نہ ہو۔ اسی طرح رپورٹوں میں اشخاص اور جماعتوں کے نام بھی کم سے کم آنے چاہئیں، نہ شکایت کے پہلو سے اور نہ تعریف کے پہلو سے۔ مرکز کو جو رپورٹیں بھیجی جاتی ہیں ان میں تو ایسی چیزیں آنے کا مضائقہ نہیں ہے لیکن اجتماع میں پیش کرنے کے لیے جو روداد یں مرتب کی جائیں ان کو ایسی چیزوں سے خالی رہنا چاہیے۔ دراصل جس غرض کے لیے ہم اجتماع میں روداد میں پیش کرتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ ہمارے ارکان کو یہ معلوم ہو کہ مختلف علاقوں میں تحریک کس رفتار سے چل رہی ہے، کہاں کہاں کس کس قسم کی رکاوٹیں پیش آ رہی ہیں، مختلف مقامات کے ارکان کن کن طریقوں سے کام کر رہے ہیں، کن کن حلقوں میں ہمارے خیالات پھیل رہے ہیں اور کہاں حالات امید افزا یا مایوس کن ہیں۔

(۲) جہاں ہماری مقامی جماعتوں یا انفرادی طور پر ہمارے کسی مقامی رکن نے دارالمطالعہ قائم کیا ہو وہاں انھیں لوگوں کو صرف کتابیں دینے پر ہی اکتفا نہ کرنا چاہیے بلکہ اس امر پر بھی نگاہ رکھنی چاہیے کہ کون لوگ کیا پڑھتے ہیں اور کس حد تک دلچسپی لیتے ہیں۔ پھر ان لوگوں سے شخصی طور پر ملنے اور تبادلۂ خیال کرنے کی بھی کوشش کرنی چاہیے تاکہ انھیں بتدریج اپنے نقطۂ نظر سے قریب

لایا جائے۔ اگر ان کے کچھ شکوک ہوں تو وہ رفع کیے جائیں اور یہ اندازہ ہوتا رہے کہ کس قسم کے لوگ کس کس حد تک ہمارے خیالات سے متاثر ہیں، اور ان کی ہمدردی اور ہم خیالی سے کہاں تک فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ دارالمطالعہ قائم کرنا تو بالکل ایسا ہے جیسے تخم ریزی کرنا، لیکن آپ ہوا کی طرح صرف بیج پھیلانے ہی پر اکتفا نہ کریں بلکہ کسان کی سی حیثیت اختیار کریں۔ جو زمین میں بیج ڈالنے کے بعد پیہم اس کو سینچتا اور اس کی نگہداشت کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ کھیتی پک کر تیار ہو جائے۔

(۳) مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بعض مقامی جماعتوں میں امارت کے انتخاب میں کچھ انجمنوں کی صدارت کا سا رنگ اختیار کر لیا گیا ہے۔ یہ منصب دراصل مقامی لیڈرشپ کا منصب ہے۔ جو شخص جماعت میں اہل ترین نظر آئے اسی کو منتخب کرنا چاہیے مگر کسی کے سر زبردستی اس منصب کو چپیکنا نہ چاہیے۔ اسی طرح جس شخص کو اپنے اندر اس منصب کے سنبھالنے کی اہلیت نظر آئے یا یہ محسوس ہو کہ کوئی اتنی اہلیت بھی نہیں رکھتا جتنی اس کے اندر ہے تو اسے خواہ مخواہ انکسار کر کے ذمہ داری سنبھالنے سے انکار بھی نہیں کرنا چاہیے۔ یہ کام بہرحال کرنے کا ہے اور ہم میں سے ہر ایک میں یہ جذبہ ہونا چاہیے کہ اگر کوئی اس کی ذمہ داری سنبھالنے کے لیے نہیں اٹھتا تو اسے اٹھنا ہے۔

(۴) سندھ کے حالات پر غور کرنے سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جب تک سندھی زبان میں کافی لٹریچر تیار نہ ہو جائے ہمیں اردو زبان کے ذریعہ سے اس پنجابی عنصر کو جو سندھ میں آباد ہے یا ان تھوڑے سے اردو خواں سندھی لوگوں کو جو وہاں مل سکیں، متاثر کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، پھر ان کے ذریعے سے خالص سندھی بولنے والے لوگوں میں خیالات پھیلائے جا سکتے ہیں۔ سندھی پبلک کی جہالت اور ان کی قبائلی عصبیت نیز ان کے اندر پیر پرستی کا زور ہونا بلاشبہ بڑی رکاوٹیں ہیں لیکن ان چیزوں سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ کام کرنے کا ڈھنگ آ جانے اور حکمت تبلیغ سیکھ لینے کے بعد اگر آپ صبر، تحمل اور لگاتار محنت کے ساتھ کام کریں گے تو آپ خود دیکھ لیں گے کہ یہ رکاوٹیں دور ہوتی چلی جائیں گی اور یہی پبلک جو آج آپ کی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہے خود ان رکاوٹوں کو راستے سے ہٹانے میں آپ کی مددگار بن جائے گی۔

(۵) لوگوں سے اپنے کاموں میں مالی اعانتیں ہم کس حالت میں قبول کر سکتے ہیں؟ اس باب میں جماعت کی پالیسی کو میں پھر بیان کر دینا چاہتا ہوں کیونکہ بعض رپورٹوں سے یہ اندازہ ہوا کہ ہمارے ارکانِ جماعت ابھی اس پالیسی کو اچھی طرح نہیں سمجھے ہیں۔ ہم مالی اعانت صرف ان لوگوں سے قبول کر سکتے ہیں جو اول تو ہمارے مقصد سے اچھی طرح واقف ہوں اور اس کے ساتھ پوری ہمدردی رکھتے ہوں۔ دوسرے ان کو ہمارے طریق کار سے پورا اتفاق ہو اور ہم پر بحیثیت اشخاص بھی اور بحیثیت جماعت اعتماد ہو۔ تیسرے یہ کہ وہ روپیہ یا کسی شکل میں مال دینے کے بعد کسی قسم کی کوئی شرط ہم پر عائد نہ کریں نہ اپنے روپے کے ذریعے سے ہمارے کام میں کسی قسم کی مداخلت کی کوشش کریں اور نہ ہماری اسکیم سے باہر کا کوئی کام ہمارے لیے تجویز کریں کہ وہ ان کے روپے سے کیا جائے۔ البتہ ہمارے اپنے زیر تجویز کاموں میں سے کسی کے متعلق وہ اس خواہش کا اظہار کر سکتے ہیں کہ ان کا روپیہ فلاں کام میں صرف ہو۔ چوتھے یہ کہ ان کے اندر اس قسم کی کوئی خواہش نہ پائی جائے کہ ان کے نام کی شہرت ہو یا ہمارا کوئی کام ان کے نام سے منسوب ہو۔ یا شخصی طور پر ہم میں سے کوئی ان کا شکر گزار ہو یا جماعتی طور پر ہم ان کے احسان مند ہوں۔ جس کو بھی ہمارے اس کام میں روپیہ دینا ہو وہ خالص خدا کے لیے دے، خدا ہی سے اجر کا امیدوار ہو اور اعلائے کلمۃ اللہ

کے سوا اور کسی چیز کو اپنے مالی ایثار کا صلہ نہ سمجھے۔ یہ ہماری مستقل پالیسی ہے اور اس میں ہم کسی بڑے سے بڑے انسان کی خاطر یا کسی بڑی سے بڑی رقم کی خاطر بھی کوئی ترمیم نہیں کر سکتے۔

(۶) جو تعلیمی، تبلیغی، اصلاحی یا کسی اور قسم کے ادارے ملک میں قائم ہیں یا آئندہ قائم ہوں ان کے متعلق بھی میں جماعت کی پالیسی کی تشریح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں، کیونکہ اس معاملے میں بھی مجھے بعض ارکان جماعت کا طرز عمل قابل اصلاح نظر آیا ہے۔ اس قسم کے ادارے اگر بالکلیہ ہماری جماعت کے حوالے کر دیے جائیں اور ہماری پالیسی کے مطابق چل سکیں حتیٰ کہ اگر ہم ان کو غیر ضروری سمجھ کر یا غیر مفید پا کر توڑنا چاہیں تو توڑ بھی سکیں تب تو ہماری جماعت کا کوئی رکن ان کے چلانے کی ذمہ داری اپنے ہاتھ میں لے سکتا ہے لیکن اگر یہ صورت نہ ہو تو کسی رکن جماعت کو ان کے چلانے کی ذمہ داری قبول نہ کرنی چاہیے۔ وہ اگر معاشی حیثیت سے مجبور ہو تو اس قسم کے کسی ادارے میں ملازم کی حیثیت سے کام کر سکتا ہے لیکن ان کا ذمہ دار رکن نہیں بن سکتا کیونکہ اس صورت میں وہ ادارہ خواہ مخواہ ہماری طرف منسوب ہوگا، اس کے کاموں کی جوابدہی جماعت پر عائد ہوگی اور ان اداروں کے چلانے میں جو نامناسب طریقے بالعموم اختیار کرنے پڑتے ہیں انھیں بادل نخواستہ ہمارے رکن جماعت کو بھی اختیار کرنا پڑے گا اور اس سے جماعت کی اخلاقی پوزیشن متاثر ہوگی۔

اس کے بعد اجلاس برخاست ہوا اور لوگ جمعہ اور کھانے کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔

خطبۂ جمعہ

ٹھیک ڈیڑھ بجے جمعہ کی دوسری اذان ہوئی اور امیر جماعت نے بعد حمد و ثنا حسب ذیل خطبہ ارشاد فرمایا:۔

برادرانِ دین! اللہ تعالیٰ اپنی کتاب پاک میں فرماتا ہے:۔ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَا شَرِیْکَ لَهٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ۔ یعنی اے محمدؐ! کہو میری نماز اور میرے تمام مراسم عبودیت اور میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ کے لیے ہے جو ساری کائنات کا مالک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے میں اس کی اطاعت میں سر تسلیم خم کرتا ہوں۔

اس آیت کی تشریح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہوتی ہے: من احب للّٰہ وابغض للّٰہ واعطی للّٰہ ومنع للّٰہ فقد استکمل الایمان۔ جس نے کسی سے دوستی و محبت کی تو خدا کے لیے کی اور دشمنی کی تو خدا کے لیے کی اور کسی کو دیا تو خدا کے لیے دیا اور کسی سے روکا تو خدا کے لیے روکا اس نے اپنے ایمان کو کامل کر لیا، یعنی وہ پورا مومن ہو گیا۔

پہلے جو آیت میں نے آپ کے سامنے پیش کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنی بندگی کو اور اپنے جینے اور مرنے کو صرف اللہ کے لیے خالص کر لے اور اللہ کے سوا کسی کو اس میں شریک نہ کرے یعنی نہ تو اس کی بندگی اللہ کے علاوہ کسی اور کے لیے ہو اور نہ اس کا جینا اور مرنا۔ اس کی جو تشریح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے میں نے آپ کو سنائی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کی محبت اور دشمنی اور اپنی دنیوی زندگی کے معاملات میں اس کا لین دین خالصۃً خدا کے لیے ہونا عین تقاضائے ایمان ہے۔ اس کے بغیر ایمان ہی کی تکمیل نہیں ہوتی کجا کہ مراتب عالیہ کا دروازہ کھل سکے۔ جتنی کمی اس معاملے میں ہوگی

اتنا ہی نقص آدمی کے ایمان میں ہوگا اور جب اس حیثیت سے آدمی مکمل طور پر خدا کا ہو جائے تب کہیں اس کا ایمان مکمل ہوتا ہے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس قسم کی چیزیں صرف مراتب عالیہ کا دروازہ کھولتی ہیں ورنہ ایمان و اسلام کے لیے انسان کے اندر یہ کیفیت پیدا ہونا شرط نہیں ہے، یعنی بالفاظ دیگر اس کیفیت کے بغیر بھی انسان مومن و مسلم ہو سکتا ہے۔ مگر یہ ایک غلط فہمی ہے اور اس غلط فہمی کے پیدا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر لوگ فقہی اور قانونی اسلام اور اُس حقیقی اسلام میں جو خدا کے ہاں معتبر ہے، فرق نہیں کرتے۔ فقہی اور قانونی اسلام میں آدمی کے قلب کا حال نہیں دیکھا جاتا اور نہیں دیکھا جاسکتا، بلکہ صرف اس کے اقرار زبانی کو اور اس امر کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ اپنے اندر اُن لازمی علامات کو نمایاں کرتا ہے یا نہیں جو اقرار زبانی کی توثیق کے لیے ضروری ہیں۔ اگر کسی شخص نے زبان سے اللہ اور رسول اور قرآن اور آخرت اور دوسرے ایمانیات کو ماننے کا اقرار کر لیا اور اس کے بعد وہ ضروری شرائط بھی پوری کر دیں جن سے اُس کے ماننے کا ثبوت ملتا ہے تو وہ دائرہ اسلام میں لے لیا جائے گا اور سارے معاملات اس کے ساتھ مسلمان سمجھ کر کیے جائیں گے لیکن یہ چیز صرف دنیا کے لیے ہے اور دنیوی حیثیت سے وہ قانونی اور تمدنی بنیاد فراہم کرتی ہے جس پر مسلم سوسائٹی کی تعمیر کی گئی ہے۔ اس کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ایسے اقرار کے ساتھ جتنے لوگ مسلم سوسائٹی میں داخل ہوں ان کو ایک دوسرے پر شرعی اور قانونی اور اخلاقی اور معاشرتی حقوق حاصل ہو جائیں، ان کے درمیان شادی بیاہ کے تعلقات قائم ہوں، میراث تقسیم ہو اور دوسرے تمدنی روابط وجود میں آئیں۔ لیکن آخرت میں انسان کی نجات اور اس کا مسلم و مومن قرار دیا جانا اور اللہ کے مقبول بندوں میں شمار ہونا اس قانونی اقرار پر مبنی نہیں ہے، بلکہ وہاں اصل چیز آدمی کا قلبی اقرار، اس کے دل کا جھکاؤ اور اس کا برضا و رغبت اپنے آپ کو بالکلیہ خدا کے حوالے کر دینا ہے۔ دنیا میں جو زبانی اقرار کیا جاتا ہے وہ تو صرف قاضی شرع کے لیے اور عام انسانوں اور مسلمانوں کے لیے ہے کیونکہ وہ صرف ظاہر ہی کو دیکھ سکتے ہیں، مگر اللہ آدمی کے دل کو اور اس کے باطن کو دیکھتا ہے اور اس کے ایمان کو ناپتا ہے۔ اس کے ہاں آدمی کو جس حیثیت سے جانچا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ آیا اس کا جینا اور مرنا اور اس کی وفاداریاں اور اس کی اطاعت و بندگی اور اس کا پورا کارنامہ زندگی اللہ کے لیے ہے یا کسی اور کے لیے۔ اگر اللہ کے لیے ہے تو وہ مسلم اور مومن ہے اور اگر کسی اور کے لیے ہے تو نہ مسلم ہے نہ مومن۔ اس حیثیت سے جو جتنا خام ہے اتنا ہی اس کا ایمان اور اسلام خام ہے خواہ دنیا میں اس کا شمار کیسے ہی بڑے مسلمانوں میں ہوتا ہو اور اس کو کتنے ہی بڑے مراتب دیے جاتے ہوں۔ اللہ کے ہاں قدر صرف اس چیز کی ہے کہ جو کچھ اس نے آپ کو دیا ہے وہ سب کچھ آپ نے اس کی راہ میں لگا دیا یا نہیں۔ اگر آپ نے ایسا کر دیا تو آپ کو وہی حق دیا جائے گا جو وفاداروں کو اور حق بندگی ادا کرنے والوں کو دیا جاتا ہے، اور اگر آپ نے کسی چیز کو خدا کی بندگی سے مستثنیٰ کر کے رکھا تو آپ کا یہ اقرار کہ آپ مسلم ہوئے یعنی یہ کہ آپ نے اپنے آپ کو بالکل خدا کے حوالے کر دیا محض ایک جھوٹا اقرار ہے جس سے دنیا کے لوگ دھوکا کھا سکتے ہیں، جس سے فریب کھا کر مسلم سوسائٹی آپ کو اپنے اندر جگہ دے سکتی ہے، جس سے دنیا میں آپ کو مسلمانوں کے سے تمام حقوق مل سکتے ہیں، لیکن اس سے فریب کھا کر خدا اپنے ہاں آپ کو وفاداروں میں جگہ نہیں دے سکتا۔

یہ قانونی اور حقیقی اسلام کا فرق جو میں نے آپ کے سامنے بیان کیا ہے اگر آپ اس پر غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کے نتائج صرف آخرت ہی میں مختلف نہیں ہوں گے بلکہ دنیا میں بھی ایک بڑی حد تک مختلف ہیں۔ دنیا میں جو مسلمان

کے سوا اور کسی چیز کو اپنے مالی ایثار کا صلہ نہ سمجھے۔ یہ ہماری مستقل پالیسی ہے اور اس میں ہم کسی بڑے سے بڑے انسان کی خاطر یا کسی بڑی سے بڑی رقم کی خاطر بھی کوئی ترمیم نہیں کر سکتے۔

(۲) جو تعلیمی، تبلیغی، اصلاحی یا کسی اور قسم کے ادارے ملک میں قائم ہیں یا آئندہ قائم ہوں ان کے متعلق بھی میں جماعت کی پالیسی کی تشریح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں، کیونکہ اس معاملے میں بھی مجھے بعض ارکان جماعت کا طرز عمل قابل اصلاح نظر آیا ہے۔ اس قسم کے ادارے اگر بالکلیہ ہماری جماعت کے حوالے کر دیے جائیں اور ہماری پالیسی کے مطابق چل سکیں حتیٰ کہ اگر ہم ان کو غیر ضروری سمجھ کر یا غیر مفید پا کر توڑنا چاہیں تو توڑ بھی سکیں تب تو ہماری جماعت کا کوئی رکن ان کے چلانے کی ذمہ داری اپنے ہاتھ میں لے سکتا ہے لیکن اگر یہ صورت نہ ہو تو کسی رکن جماعت کو ان کے چلانے کی ذمہ داری قبول نہ کرنی چاہیے۔ وہ اگر معاشی حیثیت سے مجبور ہو تو اس قسم کے کسی ادارے میں ملازم کی حیثیت سے کام کر سکتا ہے لیکن ان کا ذمہ دار کارکن نہیں بن سکتا کیونکہ اس صورت میں وہ ادارہ خواہ مخواہ ہماری طرف منسوب ہوگا، اس کے کاموں کی جوابدہی جماعت پر عائد ہوگی اور ان اداروں کے چلانے میں جو نامناسب طریقے بالعموم اختیار کرنے پڑتے ہیں انھیں بادل نخواستہ ہمارے رکن جماعت کو بھی اختیار کرنا پڑے گا اور اس سے جماعت کی اخلاقی پوزیشن متاثر ہوگی۔

اس کے بعد اجلاس برخاست ہوا اور لوگ جمعہ اور کھانے کی تیاری میں مصروف ہوگئے۔

خطبہ جمعہ

ٹھیک ڈیڑھ بجے جمعہ کی دوسری اذان ہوئی اور امیر جماعت نے بعد حمد وثنا حسب ذیل خطبہ ارشاد فرمایا:۔

برادران دین! اللہ تعالیٰ اپنی کتاب پاک میں فرماتا ہے:۔ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ۔ یعنی اے محمدؐ! کہو میری نماز اور میرے تمام مراسم عبودیت اور میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ کے لیے ہے جو ساری کائنات کا مالک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے میں اس کی اطاعت میں سر تسلیم خم کرتا ہوں۔

اس آیت کی تشریح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہوتی ہے: من احب للہ وابغض للہ واعطی للہ ومنع للہ فقد استکمل الایمان۔ جس نے کسی سے دوستی ومحبت کی تو خدا کے لیے کی اور دشمنی کی تو خدا کے لیے کی اور کسی کو دیا تو خدا کے لیے دیا اور کسی سے روکا تو خدا کے لیے روکا اس نے اپنے ایمان کو کامل کر لیا۔ یعنی وہ پورا مومن ہوگیا۔

پہلے جو آیت میں نے آپ کے سامنے پیش کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنی بندگی کو اور اپنے جینے اور مرنے کو صرف اللہ کے لیے خالص کر لے اور اللہ کے سوا کسی کو اس میں شریک نہ کرے یعنی نہ تو اس کی بندگی اللہ کے علاوہ کسی اور کے لیے ہو اور نہ اس کا جینا اور مرنا۔ اس کی جو تشریح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے میں نے آپ کو سنائی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کی محبت اور دشمنی اور بھی دنیوی زندگی کے معاملات میں اس کا لین دین خالصۃً خدا کے لیے ہونا عین تقاضائے ایمان ہے۔ اس کے بغیر ایمان ہی کی تکمیل نہیں ہوتی کجا کہ مراتب عالیہ کا دروازہ کھل سکے۔ جتنی کمی اس معاملے میں ہوگی

قانع ہو گئے۔ خدا کو ایسے مسلمان ہرگز مطلوب نہ تھے۔ اس نے اپنے انبیاء کو دنیا میں اس لیے نہیں بھیجا تھا، نہ اپنی کتابیں اس لیے نازل کی تھیں کہ صرف اس طرز کے مسلمان دنیا میں بنا ڈالے جائیں۔ دنیا میں ایسے مسلمانوں کے نہ ہونے سے کسی حقیقی قدر و قیمت رکھنے والی چیز کی کمی نہ تھی جسے پورا کرنے کے لیے سلسلۂ وحی و نبوت کو جاری کرنے کی ضرورت پیش آتی۔ درحقیقت جو مسلمان خدا کو مطلوب ہیں، جنھیں تیار کرنے کے لیے انبیاء کی بعثت اور کتابوں کی تنزیل ہوئی اور جنھوں نے اسلامی نقطۂ نظر سے کبھی کوئی قابل قدر کام کیا ہے یا آج کر سکتے ہیں وہ صرف دوسری ہی قسم کے مسلمان ہیں۔

یہ چیز کچھ اسلام ہی کے لیے خاص نہیں ہے بلکہ دنیا میں کسی مسلک کا جھنڈا بھی ایسے پیروؤں کے ہاتھوں کبھی بلند نہیں ہوا ہے جنھوں نے اپنے مسلک کے اقرار اور اس کے اصولوں کی پابندی کو اپنی کل زندگی کے ساتھ صرف ضمیمہ بنا کر رکھا ہو اور جن کا جینا اور مرنا اپنے مسلک کے سوا کسی اور چیز کے لیے ہو۔ آج بھی آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ایک مسلک کے حقیقی اور سچے پیرو صرف وہی لوگ ہوتے ہیں جو دل و جان سے اس کے وفادار ہیں، جنھوں نے اپنی پوری شخصیت کو اس میں گم کر دیا ہے اور جو اپنی کسی چیز کو حتیٰ کہ اپنی جان اور اپنی اولاد تک کو اس کے مقابلے میں عزیز تر نہیں رکھتے۔ دنیا کا ہر مسلک ایسے ہی پیرو مانگتا ہے اور اگر کسی مسلک کو دنیا میں غلبہ نصیب ہو سکتا ہے تو وہ صرف ایسے ہی پیروؤں کی بدولت ہو سکتا ہے۔ البتہ اسلام میں اور دوسرے مسلکوں میں فرق یہ ہے کہ دوسرے مسلک اگر انسانوں سے اس طرز کی فنائیت اور فدائیت اور وفاداری مانگتے ہیں تو یہ فی الواقع انسان پر ان کا حق نہیں ہے بلکہ یہ ان کا انسان سے ایک بے جا مطالبہ ہے۔ اس کے برعکس اسلام اگر انسان سے اس کا مطالبہ کرتا ہے تو یہ اس کا عین حق ہے۔ وہ جن چیزوں کی خاطر انسان سے کہتے ہیں کہ تو اپنے آپ کو اور اپنی زندگی کو اور اپنی پوری شخصیت کو ان پر تج دے ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں ہے جس کا فی الواقع انسان پر یہ حق ہو کہ اُس کی خاطر انسان اپنی کسی شے کو قربان کرے۔ لیکن اسلام جس خدا کے لیے انسان سے یہ قربانی مانگتا ہے وہ حقیقت میں اس کا حق رکھتا ہے کہ اس پر سب کچھ قربان کر دیا جائے۔ آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ کا ہے۔ انسان خود اللہ کا ہے۔ جو کچھ انسان کے پاس ہے اور جو کچھ انسان کے اندر ہے سب اللہ کا ہے اور جن چیزوں سے انسان دنیا میں کام لیتا ہے وہ سب بھی اللہ کی ہیں۔ اس لیے عین تقاضائے عدل اور عین مقتضائے عقل ہے کہ جو کچھ اللہ کا ہے وہ اللہ ہی کے لیے ہو۔ دوسروں کے لیے یا خود اپنے مفاد اور اپنے نفس کے مرغوبات کے لیے انسان جو قربانی بھی کرتا ہے وہ دراصل ایک خیانت ہے الّا یہ کہ وہ خدا کی اجازت سے ہو۔ اور خدا کے لیے جو قربانی کرتا ہے فی الحقیقت وہ ادائے حق ہے۔ لیکن اس پہلو سے قطع نظر کرتے ہوئے مسلمانوں کے لیے اُن لوگوں کے طرز عمل میں ایک بڑا سبق ہے جو اپنے باطل مسلکوں کی خاطر اور اپنے نفس کے جھوٹے معبودوں کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر رہے ہیں اور اُس استقامت کا ثبوت دے رہے ہیں جس کی نظیر مشکل ہی سے تاریخ انسانی میں ملتی ہے۔ کس قدر عجیب بات ہوگی اگر باطل کے لیے انسانوں سے ایسی کچھ فدائیت اور فنائیت ظہور میں آسکے اور حق کے لیے اس کا ہزارواں حصہ بھی نہ ہو سکے۔

ایمان و اسلام کا یہ معیار جو اس آیت اور اس حدیث میں بیان ہوا ہے، میں چاہتا ہوں کہ ہم سب اپنے آپ کو اس پر پرکھ کر دیکھیں اور اس کی روشنی میں اپنا محاسبہ کریں۔ اگر آپ کہتے ہیں کہ آپ نے اسلام قبول کیا اور ایمان لے آئے تو دیکھیے کہ آیا فی الواقع آپ کا جینا اور مرنا خدا کے لیے ہے؟ کیا آپ اسی لیے جی رہے ہیں اور آپ کے دل اور دماغ کی ساری قابلیتیں

آپ کے جسم اور جان کی ساری قوتیں، آپ کے اوقات اور آپ کی محنتیں کیا اسی کوشش میں صرف ہو رہی ہیں کہ خدا کی مرضی آپ کے ہاتھوں پوری ہو اور آپکے ذریعہ وہ کام انجام پائے جو خدا اپنی مسلم امت سے لینا چاہتا ہے؟ پھر کیا آپ نے اپنی اطاعت اور بندگی کو خدا ہی کے لیے مخصوص کر دیا ہے؟ کیا نفس کی بندگی، خاندان کی، برادری کی، دوستوں کی، سوسائٹی کی اور حکومت کی بندگی آپ کی زندگی سے بالکل خارج ہو چکی ہے؟ کیا آپنے اپنی پسند اور ناپسند کو سراسر رضائے الٰہی کے تابع کر دیا ہے؟ پھر دیکھیے کہ واقعی آپ جس سے محبت کرتے ہیں خدا کے لیے کرتے ہیں؟ جس سے نفرت کرتے ہیں خدا کے لیے کرتے ہیں؟ اور اس نفرت اور محبت میں آپ کے اپنے نفس کے میلان کا کوئی حصہ شامل نہیں رہا ہے؟ پھر کیا آپ کا دینا اور روکنا بھی خدا کی خاطر ہو چکا ہے؟ اپنے پیٹ اور اپنے نفس سمیت دنیا میں آپ جس کو جو کچھ دے رہے ہیں اسی لیے دے رہے ہیں کہ خدا نے اس کا حق مقرر کیا ہے اور اس کو دینے سے صرف خدا کی رضا آپ کو مطلوب ہے؟ اور اسی طرح جس سے آپ جو کچھ روک رہے ہیں وہ بھی اسی لیے روک رہے ہیں کہ خدا نے اسے روکنے کا حکم دیا ہے اور اس کے روکنے میں آپ کو خدا کی خوشنودی حاصل ہونے کی تمنا ہے؟ اگر آپ یہ کیفیت اپنے اندر پاتے ہیں تو اللہ کا شکر کیجیے کہ اس نے آپ پر نعمت ایمان کا اتمام کر دیا۔ اور اگر اس حیثیت سے آپ اپنے اندر کمی محسوس کرتے ہیں تو ساری فکریں چھوڑ کر بس اسی کمی کو پورا کرنے کی فکر کیجیے اور اپنی تمام کوششوں اور محنتوں کو اسی پر مرکوز کر دیجیے، کیونکہ اسی کسر کے پورے ہونے پر دنیا میں آپ کی فلاح اور آخرت میں آپ کی نجات کا مدار ہے۔ آپ دنیا میں خواہ کچھ بھی حاصل کر لیں، اس کے حصول سے اُس نقصان کی تلافی نہیں ہو سکتی جو اس کسر کی بدولت آپ کو پہنچے گا۔ لیکن اگر یہ کسر آپ نے پوری کر لی تو خواہ آپ کو دنیا میں کچھ حاصل نہ ہو پھر بھی آپ خسارے میں نہ رہیں گے۔

اجلاس چہارم

(تاریخ ایضاً)

نماز جمعہ کے بعد پھر اجلاس منعقد ہوا۔ چونکہ امیر جماعت کی طبیعت خراب ہو گئی تھی، اس لیے اجلاس کی کاروائی کا آغاز مولانا امین احسن صاحب، اصلاحی کی قیادت میں ہوا: اور جنوبی ہند کی بقیہ رپورٹیں پیش کی گئیں۔ ان رپورٹوں پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا امین احسن صاحب نے فرمایا:۔

جو مشکلات جنوبی ہند کی جماعتوں نے بیان کی ہیں وہ کوئی بڑی اہمیت نہیں رکھتیں۔ نہ ان سے پریشان ہونے کی کوئی وجہ ہے، بلکہ فی الحقیقت ایسی رکاوٹوں کا تو خندہ پیشانی سے استقبال کرنا چاہیے۔ جو لوگ ہمارے لٹریچر سے دوسروں کو روکتے ہیں وہ تو ایک طرح سے اس کے پھیلنے میں مددگار بن رہے ہیں کیونکہ انسانی فطرت کا طبعی خاصہ یہ ہے کہ جس چیز سے اس کو روکا جاتا ہے اس کی طرف وہ اور زیادہ راغب ہوتا ہے۔

اس کے بعد ایک صاحب نے اپنے ایک انتہائی دوست کا خط پڑھ کر سنایا جس میں انھوں نے جماعت کے لٹریچر سے متاثر ہونے کے بعد اپنے خیالات کی تبدیلی کا حال تفصیل سے بیان کیا تھا۔ اسی دوران میں امیر جماعت تشریف لے آئے اور باقی کارروائی ان کی قیادت میں جاری رہی۔

اس کے بعد دہلی اور یوپی کی رپورٹیں پیش ہوئیں۔ ان رپورٹوں کے سلسلے میں بعض ممتاز علمائے کرام کے وہ فتوے بھی پڑھ کر سنائے گئے جو انھوں نے "رسالہ دینیات" کے متعلق تحریر فرمائے ہیں، اور جنھیں ایک گروہ اس غرض کے لیے استعمال کر رہا ہے کہ یہ رسالہ بعض مدارس کی تعلیم دینیات کے نصاب سے خارج کیا جائے۔

ان رپورٹوں پر تبصرہ کرتے ہوئے امیر جماعت نے فرمایا:-

(۱) جیسا کہ آپ حضرات نے اپنی رپورٹوں کے دوران میں بیان کیا ہے، اور میں بھی دیکھ رہا ہوں، بعض گروہ خواہ مخواہ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ہماری ان سے کوئی مخالفت ہے اور اس بنا پر جگہ جگہ انھوں نے ہمارے راستے میں روکاوٹیں ڈالنے اور ہمارے خلاف بدگمانیاں پھیلانے کا سلسلہ شروع کر دیا ہے، حالانکہ ہماری نہ ان سے کوئی لڑائی ہے اور نہ ہم نے کبھی ان کو اپنا حریف سمجھا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہم نے مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کے طریق کار اور ان کی سیاسی پالیسی پر اپنے لٹریچر میں تنقید کی ہے لیکن اس تنقید کی غرض لڑائی نہ تھی بلکہ صرف یہ تھی کہ یہ جماعتیں ہمارے نقطۂ نظر سے واقف ہوں اور اگر ان کا دل گواہی دے کہ ہمارا نقطۂ نظر صحیح ہے تو اس کو ملحوظ رکھ کر اپنے طرز عمل کی اصلاح کریں۔ اس قسم کی تنقید بہرحال اصلاح کے لیے ناگزیر ہوتی ہے اور اس کے بغیر دنیا میں کہیں بھی حالات کی اصلاح نہیں ہوا کرتی۔ ایسی تنقید کو ہمیشہ ترقی پسند اور معقولیت پسند جماعتیں برداشت کرتی ہیں بلکہ اس سے فائدہ اٹھانے کی بھی کوشش کرتی ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ ہندوستان میں تنقید کو ہمیشہ دشمنی ہی پر محمول کیا جاتا ہے۔ آپ خواہ کسی پر کتنی ہی مخلصانہ اور ہمدردانہ تنقید کریں اور آپ کی نیت خالص اصلاح طلبی ہی کی کیوں نہ ہو مگر کسی پر تنقید کرنے کے بعد مشکل ہی سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اس کے جواب میں آپ کو کاٹ کھانے پر آمادہ نہ ہو جائے گا۔

یہ سب ہندوستان کے اخلاقی اور عقلی تنزل کا نتیجہ ہے اور اگر اس کے اسباب کو ہم اچھی طرح سمجھ لیں تو اس قسم کے مظاہر کو دیکھ کر کبھی برافروختہ نہ ہوں بلکہ ان لوگوں کے ساتھ ہمدردانہ یا کم از کم صابرانہ رویہ اختیار کریں۔ میں دیکھتا ہوں کہ کہیں کہیں آپ حضرات کی رپورٹوں میں ان مخالفتوں پر غصے اور ناراضی کا رنگ پایا جاتا ہے۔ اس چیز کو اپنے اندر سے نکال دیجیے۔ جہاں جہاں آپ کو ان مخالفتوں سے سابقہ پیش آئے وہاں نہایت معقولیت اور ٹھنڈے طریقے سے مخالفین کو سمجھا دیجیے کہ ہماری اصل لڑائی تم سے نہیں بلکہ نظام باطل سے ہے۔ ہم اُسے غلط سمجھتے ہیں اور اسی پر چوٹ لگانا چاہتے ہیں۔ اگر تم نے اپنے آپ کو اس نظام سے وابستہ کر رکھا ہے تو جس حد تک تمھاری اس سے وابستگی ہے اسی حد تک ضمناً تم پر بھی چوٹ لگے گی لیکن ہمارے اصل ہدف تم نہ ہوگے بلکہ نظام باطل ہی ہوگا۔ لیکن اگر تمھارا اس نظام سے کوئی رشتہ نہیں ہے تو ہماری کسی سرگرمی سے تمھیں پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ جو تیر دوسری طرف چھوڑا جا رہا ہو اسے تم خواہ مخواہ اپنے سینے کی طرف کیوں کھینچنا چاہتے ہو؟ اس فہمائش کے بعد جو لوگ اپنی مخالفانہ باتوں سے باز نہ آئیں انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیجیے۔ ان کی باتوں کا نہ جواب دیجیے نہ ان پر مشتعل ہوجیے۔ خوب سمجھ لیجیے کہ ان کی مخالفانہ حرکات، ان کی اشتہار بازیاں، ان کے غلط الزامات اور ان کی تمام مخالفانہ تدبیریں خود انھیں کے لیے مضر ثابت ہوں گی، بشرطیکہ آپ کا رویہ غایت درجہ شریفانہ اور کریمانہ اور حلیمانہ ہو اور آپ بالکل راست باز انسانوں کی طرح سیدھے سیدھے اپنا کام کرتے چلے جائیں۔ جب ایک طرف آپ کی روش یہ ہوگی اور دوسری طرف

ان کا مخالفانہ رویہ اخلاق اور راستی سے دور ہوتا چلا جائے گا تو آپ دیکھیں گے کہ ملک کا ضمیر ان کی حرکات سے خود بخود بیزار ہونے لگے گا اور لوگ ان سے کٹ کر آپ کی طرف مائل ہو جائیں گے۔ لیکن اگر آپ نے مشتعل ہو کر ان کے جواب میں وہ روش شروع کر دی تو جیسے وہ ہیں ویسے ہی آپ ہو کر رہیں گے اور اس لڑائی میں ان کی طرح آپ بھی کھوئے جائیں گے۔ دراصل وہ شیطان ہے جو داعیانِ حق کو ان کے راستے سے ہٹانے کے لیے اشتعال دلاتا اور نفسانی لڑائی لڑنے پر آمادہ کرتا ہے۔ اس باب میں آپ حضرات میرے ان حواشی کو بغور پڑھیں جو میں نے تفہیم القرآن میں سورہ اعراف کے آخری رکوع پر لکھے ہیں۔ انشاء اللہ وہ بہت مفید ثابت ہوں گے۔

(۲) اس سے پہلے اکثر خطوط سے اور یہاں جو رپورٹیں پیش ہوئی ہیں ان سے بھی اندازہ ہوا کہ ہمارے رفقاء اور ہم خیال اصحاب کے حلقے میں اشتراکیت کے بڑھتے ہوئے طوفان سے ایک اضطراب پیدا ہو گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اشتراکی تحریک اب روس کی کامیابی کی بدولت بہت زور پکڑ گئی ہے اور حکومت نے اپنی مصلحتوں کی خاطر اسے قوت حاصل کرنے کا جو موقع دیا ہے وہ بھی اس کے لیے کافی مفید ثابت ہوا ہے۔ لیکن ان چیزوں سے مضطرب ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اور اضطراب کے ساتھ اگر کوئی قدم اٹھایا گیا تو وہ فائدہ مند ہونے کے بجائے الٹا مضر ثابت ہوگا۔ یہ صحیح ہے کہ اشتراکیت عوام کے سفلی جذبات اور ان کی خواہشاتِ نفس سے اپیل کرنے کی بنا پر آگ کی طرح پھیلنے کی خاصیت رکھتی ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ایک مدتِ دراز سے اس کا مسلسل پروپیگنڈا ہوتا رہا ہے، اس کے پاس ایک بہت طاقتور لٹریچر ہے اور کثیر التعداد کارکن موجود ہیں، دنیا کے مختلف ممالک میں اس کی بہت کامیاب اشاعت ہو چکی ہے، اور ایک عظیم الشان سلطنت اس کی علمبردار ہے جسے تازہ فتوحات نے غیر معمولی اثر اور رسوخ بخش دیا ہے۔ ان وجوہ سے یہ بہت زیادہ بعید از قیاس نہیں ہے کہ ایک مرتبہ یہ تحریک ایک سیلاب کی طرح ہمارے ملک اور دوسرے بہت سے ملکوں پر چھا جائے گی۔ لیکن ان پہلوؤں کے ساتھ بعض دوسرے پہلو بھی ہیں جنھیں ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ہندوستان میں اور اس طرز کے غلام ذہنیت رکھنے والے ملکوں میں اس تحریک کی ترقی کا انحصار تمام تر روس کی طاقت پر ہے۔ جس وقت روس جرمنی سے پٹ رہا تھا آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس وقت ہندوستان میں اشتراکیت بھی دم توڑ رہی تھی۔ جب روس ازسرِنو سنبھل گیا تھا اور جرمنی کے مقابلے میں کامیابی حاصل کرتا چلا گیا تو یہاں بھی اشتراکیت کے جسم میں روح دوڑنے لگی۔ اس لیے یہ نتیجہ نکالنا صحیح ہے کہ اشتراکیت کا گرنا اور اٹھنا روس کے دامن کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔

لیکن روس کا حال یہ ہے کہ اب وہ ایک بین الاقوامی اشتراکی تحریک کی پوزیشن سے ہٹتے ہٹتے ٹھیک اس مقام پر آ رہا ہے جہاں نازی جرمنی کھڑا تھا، یعنی اس کی اشتراکیت اب قوم پرستانہ اشتراکیت (National Socialism) ہے اور وہ بہت تیزی کے ساتھ قیصریت (Imperialism) کے میدان میں امریکہ اور انگلستان کا حریف بن رہا ہے۔ یہ چیز ممکن ہے کہ روس کی قیصریت کو اتنی طاقت دے بیٹھے لیکن ایک بین الاقوامی تحریک کی حیثیت سے اشتراکیت کو یقیناً لے بیٹھے گی۔ ایک بین الاقوامی تحریک کی کامیابی سراسر اس امر پر منحصر ہوتی ہے کہ اس کے علمبردار شخصی اور قومی اور طبقاتی اغراض سے بالاتر ہو کر، تمام انسانوں کو مساویانہ حیثیت سے، قومی امتیازات اور تعصبات کے بغیر اپنا شریک و سہیم بنائیں اور کامیابی کے دور میں جو کچھ فوائد ان کو حاصل ہوں ان سب میں اپنے تمام ہم خیالوں کو برابر کا حصہ دار ٹھہرائیں، حتیٰ کہ ان کے اندر اتنی

فراخ حوصلگی موجود ہو کہ جس سے کل ان کی لڑائی تھی وہ بھی اگر ان کا ہم مسلک ہو جائے تو وہ اس کے ساتھ اپنے انتقام اور دشمنی اور تعصبات کے سارے جذبات کو ختم کرکے بھائیوں کا سا سلوک کریں۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے بہت اعلیٰ درجے کے اخلاق درکار ہیں۔ مگر مادہ پرست اور وہ مادہ پرست جس کا سب سے بڑا اپیل معاشی اپیل ہو، ایسے بلند اخلاق لا کہاں سے سکتے ہیں؟ یہی وجہ ہے کہ روس جتنا جتنا دنیوی کامیابیوں کی منزلیں طے کرتا چلا گیا اتنا ہی زیادہ قوم پرست ہوتا چلا گیا اور آج کا روسی اشتراکی اپنے اندر اتنی بلند ہمتی نہیں پاتا کہ جو منافع اس کو اپنی فوجی کامیابیوں سے حاصل ہوئے ہیں ان میں وہ اپنی قوم کے ساتھ دوسروں کو برابر کا شریک کرے۔ اب وہ جو کچھ چاہتا ہے اپنی قوم کے لیے چاہتا ہے۔ البتہ اشتراکیت کے بین الاقوامی اپیل کو وہ صرف اپنے ایک قومی ہتھیار کی حیثیت سے استعمال کر رہا ہے تاکہ مختلف قوموں میں اس کے ذریعے سے ففتھ کالم پیدا کرے اور پھر اس ففتھ کالم کو آلۂ کار بنا کر اپنے قومی امپیریلزم کی جڑیں پھیلائے۔ گو آنکھوں والے اسے ابھی سے دیکھ رہے ہیں لیکن عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب روس کی سیاست اس معاملے میں بالکل برہنہ ہو جائے گی اور اس وقت غلام قوموں کے وہ لوگ جو آج اسے اپنا مقتدا و پیشوا بنائے ہوئے ہیں، اور اس کو مظلوموں کا حامی اور غلاموں کی آزادی کا علمبردار سمجھ رہے ہیں اس سے مایوس ہو جائیں گے۔

اس بیان سے میری یہ غرض نہیں ہے کہ آپ کو اشتراکی خطرے سے بالکل مطمئن ہو کر بیٹھ جانے کا مشورہ دوں بلکہ میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اشتراکی خطرے سے جتنا اضطراب آپ میں سے بعض لوگ محسوس کرتے ہیں اتنے زیادہ اضطراب کا کوئی موقع نہیں ہے۔ اس خطرے کو جو لوگ تیزی کے ساتھ قریب آتا دیکھتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ جلدی سے کوئی جوابی پروپیگنڈا شروع کر دیا جائے یا اشتراکیت کے خلاف مضامین اور کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ چھیڑ دیا جائے یا ہمارے کارکن جلدی سے کسانوں اور مزدوروں میں جا کر کوئی ایسا کام شروع کریں جو انھیں اشتراکیوں کی گود سے فوراً چھین لے۔ لیکن اس طرح کی جلد بازانہ تدبیریں کارگر نہیں ہو سکتیں۔ میں نے پچھلے سال تعلیم بالغان کی جو سکیم پیش کی تھی وہ اسی لیے تھی کہ ہمارے وہ ارکان جماعت جو عوام میں کام کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں مضبوط اور گہری بنیادوں پر ایک ایسی عوامی تحریک کی عمارت اٹھائیں جو نہ صرف یہ کہ محنت پیشہ طبقوں کی اخلاقی اور ذہنی اصلاح کرے بلکہ اس کے ساتھ ہی ان کو تمام معاشی، سیاسی، اور مذہبی فتنے پھیلانے والی تحریکوں سے بھی محفوظ کر دے، نیز جس سے بتدریج ہمارے پاس طبقۂ عوام کے ایسے قابلِ اعتماد کارکنوں کی ایک معتد بہ تعداد فراہم ہوتی چلی جائے جو وسیع پیمانے پر ہماری عوامی تحریک کو ملک میں پھیلا سکے۔ جیسا کہ میں اس سے پہلے اجتماع دارالاسلام اور اجتماع دہلی کی تقریروں میں کہہ چکا ہوں اس کام کا طریقہ یہ ہے کہ ہمارا ہر تعلیم یافتہ کارکن اپنے آس پاس کی آبادی میں سے طبقۂ عوام کے آٹھ دس آدمیوں کو تعلیم کا شوق دلائے اور اسے پڑھانے کے لیے بلا معاوضہ خود اپنی خدمات پیش کرے۔ اس تعلیم کے مصارف کا کوئی بار ان پر نہ ڈالا جائے۔ وقت مقرر کرنے میں بھی اپنی سہولت کی بہ نسبت ان کی سہولت کا زیادہ خیال رکھا جائے۔ جگہ بھی ان سے نہ مانگی جائے بلکہ خود فراہم کی جائے۔ پہلے کچھ مدت صرف کرکے ان کو نوشت و خواند کے قابل بنا دیا جائے۔ پھر خود اپنی جماعت کے لٹریچر میں سے آسان آسان چیزیں سبقاً سبقاً پڑھائی جائیں اور اس دوران میں نہ صرف اپنے خیالات سے ان کے ذہن کو متاثر کیا جائے بلکہ ان کے ساتھ مساوات، ہمدردی، اخوت اور عالی ظرفی کا ایسا برتاؤ کیا جائے جس سے ان کے دل مسخر

ہو جاتی ہیں۔ ان کے دکھ درد میں شریک ہونے کی کوشش کیجیے، ان کی ہر مصیبت اور تکلیف میں ممکن ہو تو عملاً کام آئیے ورنہ کم از کم ہمدردی کا اظہار کیجیے، اپنے طرزِ عمل سے ان پر ثابت کیجیے کہ آپ کسی قسم کے امتیازات کے قائل نہیں ہیں، پڑھے لکھے اور اونچے طبقوں میں جو چھوٹا فخر پایا جاتا ہے اس کا کوئی شائبہ آپ کے اندر نہ پایا جائے۔ اس کے ساتھ نہایت مخلصانہ طریقے سے ان کی اخلاقی کمزوریوں کو دور کرنے کی کوشش کیجیے۔ ان کے اندر جو "انسان" سو رہا ہے، جسے معاشی خستہ حالی نے، جہالت نے، سوسائٹی کی اخلاقی اور ذہنی پستی نے سلا دیا ہے اسے جگائیے اور ان کے اندر اس انسانی عظمت کا شعور پیدا کیجیے جس کی بنیاد اسلام اور ایمان پر قائم ہوتی ہے۔ پھر یہ بات بھی ان کے ذہن نشین کیجیے کہ ان کی تمام معاشی مشکلات اور ان کے ان تمام دکھوں کا جو موجودہ تمدن نے پیدا کر دیئے ہیں صرف ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ ہے کہ زندگی کا نظام خالص اسلامی بنیادوں پر قائم ہو۔ اس طرح جن آٹھ دس آدمیوں کو آپ تیار کریں گے وہ گویا عوام میں کام کرنے کے لیے آپ کے تربیت یافتہ کارکن بن جائیں گے اور پھر آپ ان کو انہی کے طبقے میں اپنے اخلاقی و ذہنی اثرات پھیلانے کا ذریعہ بنا سکیں گے۔ یہ طریق کار اپنے نتائج جلدی نہیں دکھا سکتا جس طرح ایک اشتراکی کارکن تھوڑی مدت کے اندر معاشی اپیل کر کے ایک مزدور سبھا یا کسان سبھا کھڑی کر لیتا ہے یا ٹریڈ یونین (Trade union) بنا ڈالتا ہے اس طرح جلدی سے آپ کوئی بھیڑ اپنے گرد جمع نہ کر سکیں گے۔ لیکن جو طریق کار میں آپ کو بتا رہا ہوں اس پر اگر آپ عمل کریں تو آپ دیکھ لیں گے کہ چند سال کے اندر ایک ایسی مضبوط عوامی تحریک اٹھ کھڑی ہو گی جس کا مقابلہ کرنا کسی دوسری تحریک کے لیے مشکل ہو گا۔ پیٹ کی اپیل پر جمع ہونے والی بھیڑ نہ کبھی وہ استقامت دکھا سکتی ہے جو اعلیٰ درجے کی اخلاقی بنیادوں پر اٹھنے والے چند مٹھی بھر لوگ دکھا سکتے ہیں، اور نہ عامۃ الناس میں معبودِ شکم کے پجاریوں کو وہ اخلاقی اثر کبھی حاصل ہو سکتا ہے جو سچے خدا پرستوں کو حاصل ہو سکتا ہے۔

(۳) بعض مقامات کی رپورٹوں سے یہ معلوم کر کے بہت افسوس ہوا کہ جب ہمارے کارکنوں نے کہیں مزدور طبقے کے اندر اشتراکی کارکنوں کے پھیلائے ہوئے زہر کو نکالنے کی کوشش کی تو اس طبقے کے مسلمانوں نے انھیں جواب دیا کہ علما تو ان اشتراکی کارکنوں کے ساتھ موافقت کر رہے ہیں اور انھوں نے ہمیں یقین دلایا ہے کہ اشتراکیت سے ہمارے مذہب پر کوئی آنچ نہیں آتی پھر آپ لوگ ہمیں کیوں ڈراتے ہیں کہ اشتراکیت ہم کو الحاد کی طرف لے جائے گی یا یہ کہ اشتراکیت اسلام کے خلاف ہے۔ درحقیقت ہمارے بعض علمائے کرام ہندوستان میں اسی قسم کی غلطی کر رہے ہیں جیسی اس سے پہلے روسی ترکستان کے علما کر چکے ہیں اور اس کا افسوسناک انجام دیکھ چکے ہیں۔ روسی ترکستان کا اشتراکی انقلاب کوئی بہت پرانی چیز نہیں ہے۔ اسی بیس پچیس سال کی مدت میں ہوا ہے اور وہاں اس کا یہ نتیجہ دنیا دیکھ چکی ہے کہ جو سرزمین ہزار بارہ سو سال سے اسلام کا مضبوط قلعہ بنی ہوئی تھی، جہاں سے بڑے بڑے ائمہ حدیث، ائمہ فقہ اور مشہور سلاسلِ صوفیہ (چشتیہ، نقشبندیہ اور سہروردیہ) کے پیشوا پیدا ہوئے، وہاں آج اسلام برائے نام بھی باقی نہیں ہے۔ مسجدیں اور خانقاہیں کلبوں اور رقص خانوں اور تعلیم دہریت کے مرکزوں میں تبدیل ہو چکی ہیں اور سابق مسلمانوں کی نسل سے پکے ملحد اشتراکی پیدا ہو رہے ہیں جن کے نزدیک محمد رسول اللہ محض سرمایہ داروں کے ایک ایجنٹ تھے اور انھوں نے اپنے وقت کے معاشی نظام کو مذہبی و اخلاقی بنیاد فراہم کرنے کے لیے وحی و رسالت کا ڈھونگ رچایا تھا۔ یہ عظیم الشان کامیابی اشتراکیت کو اس سرزمین میں حاصل ہوئی جہاں آج سے پچیس سال پہلے تک پرانے طرز کی مذہبیت

ہندوستان سے بہت زیادہ گہرا رنگ رکھتی تھی اور اسلام سے لوگوں کی عقیدت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ کوئی شخص یہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ بیس سال کے اندر اس سرزمین میں کوئی اسلام کا نام لینے والا بھی نہ پایا جائے گا۔ مگر آپ کو معلوم ہے کہ اشتراکی مبلغین کو یہ کامیابی حاصل کیسے ہوئی؟ اس کا ذریعہ صرف ایک تھا اور وہ یہ کہ اشتراکیت کے مبلغ معصوم صورتیں لیے ہوئے، دکھی انسانیت کے حامی بن کر علمائے کرام کے پاس پہنچے اور سب سے پہلے ان کا اعتماد حاصل کیا۔ ترکستان میں نئے زمانے کے تعلیم یافتہ مگر صحیح العقیدہ مسلمان جو تھوڑے بہت موجود تھے انھوں نے علمائے کرام کو آگاہ کرنے کی کوشش کی کہ یہ اشتراکیت کی تحریک فی الواقع اسلام کی نفی ہے۔ لیکن علما، اول تو بسم اللہ کے گنبد میں بیٹھے ہوئے تھے اور انھیں جدید زمانے کی تحریکات کا براہ راست کوئی علم نہ تھا۔ پھر مزید برآں وہ ان روشن خیال مسلمانوں سے اس بنا پر بھی سخت ناراض تھے کہ یہ لوگ شرح جامی اور مطول جیسی کتابوں کو نصاب سے خارج کرکے نیا تعلیمی نصاب بنانا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے شرح جامی کو منسوخ کرنے والے مسلمانوں کی بات ماننے کے بجائے اپنی ساری اخلاقی امداد ان ملاحدہ کے لیے وقف کردی جو قرآن کو منسوخ کرنے اٹھے تھے۔ پھر جب علما کے واسطے سے اشتراکیوں کو ترکستانی عوام میں اعتماد و اعتبار حاصل ہوگیا تو دیکھتے دیکھتے انھوں نے عام باشندوں کو مٹھی میں لے کر ملک کے سیاسی نظام پر کامل تسلط حاصل کرلیا اور اس کے بعد سب سے پہلے جس گروہ کی خبر لی وہ یہی علما، و مشائخ تھے جن کے اعتماد سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے اقتدار حاصل کیا تھا۔ اشتراکی انقلاب کی تکمیل کے بعد ترکستان کے طول و عرض میں جس طرح علماء اور صوفیہ کا قتل عام کیا گیا اور مذہبی طبقوں کو جیسے جیسے شدید مظالم کے ساتھ ختم کیا گیا اس کی داستان اتنی دردناک ہے کہ چنگیزی مظالم کی تاریخ بھی اس کے سامنے گرد ہوجاتی ہے۔ یہ سب کچھ اسی بیس پچیس سال کے دوران میں ہوا ہے اور اس سرزمین میں ہوا ہے جو سرحد ہندوستان سے پانچ سات سو میل سے زیادہ دور نہیں ہے۔ لیکن ہمارے مذہبی پیشواؤں کو اس کی کچھ بھی خبر نہیں اور وہ آج ہندوستان میں پھر وہی سمرقند و بخارا کی تاریخ دہرانے کے لیے تیار ہیں۔ ان کے بڑے بڑے اجتماعات میں اشتراکی لیڈروں اور اشتراکیت زدہ لوگوں کو استقبالیہ خطبے پڑھنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ ان کے ذمہ دار آدمی اشتراکی کارکنوں کے ساتھ عوام میں کام کرنے جاتے ہیں، اور اچھے اچھے مشہور علما، کی زبان سے یہ فقرے سننے میں آتے ہیں کہ اسلام اور اشتراکیت میں اس کے سوا کچھ فرق نہیں ہے کہ ایک میں خدا کا تصور ہے اور دوسرے میں نہیں ہے، ورنہ اشتراکی نظام بالکل اسلامی نظام کا ایک نیا ایڈیشن ہے۔ خدا نہ کرے کہ اس نادانی کا ہندوستان میں بھی وہی نتیجہ رونما ہو جو ترکستان میں ہوچکا ہے، لیکن خدا کے ہاں تو یہ لوگ اپنی ذمہ داری سے ہرگز بری نہ ہوسکیں گے خواہ ہندوستان ان کی غلطی کے نتائج سے بچ جائے۔

(۴) جن حضرات علما، نے میرے رسالۂ دینیات پر فتوے تحریر فرمائے ہیں میں شخصی طور پر بھی ان کا نیازمند ہوں اور ان کے علم و فضل کا بھی احترام میرے دل میں ہے۔ ان تک میری یہ گذارش پہنچا دی جائے کہ فتوے تحریر فرمانے اور انھیں اہل فتنہ کے ہاتھ میں دینے کے بجائے وہ براہ کرم میری کتابوں پر علمی تنقید فرمائیں۔ مجھے اپنی کسی غلطی کو غلطی ماننے میں اور اس کی اصلاح کرنے میں نہ پہلے کبھی تامل تھا اور نہ اب ہے۔ البتہ پہلے بھی یہ عرض کرتا رہا ہوں اور اب بھی اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ جس چیز کو غلطی کہا جاتا ہے اسے تعیّن کے ساتھ مجھے بتایا جائے تاکہ میں اس کی اصلاح کرسکوں۔ مبہم اعتراضات سے یہ معلوم کرنا مشکل ہوتا ہے کہ فی الواقع وہ چیز کیا ہے جس پر اعتراض ہے۔

اس کے بعد یہ اجلاس ختم ہوا اور نماز مغرب کے بعد پانچواں اجلاس شروع ہوا۔ عصر سے مغرب تک وقفہ دیا گیا۔

اجلاس پنجم

(بتاریخ ایضاً بعد نماز مغرب)

سب سے پہلے اعلان کیا گیا کہ بعد نماز عشا مجلس شوریٰ کا اجلاس ہوگا اور ارکان شوریٰ کے نام سنا دیے گئے۔ اس کے بعد علی گڑھ، شاہجہان پور، بنارس، سنگاہی، لکھنؤ، میرٹھ اور بارہ بنکی کی رپوٹیں پیش ہوئیں۔ شاہجہان پور کے مقامی امیر نے اپنی رپورٹ کے دوران میں یہ بھی اعلان کیا کہ ان کے ایک رفیق اپنی جان، مال، اور ہر چیز جماعت کے سپرد کرتے ہیں اور امیر جماعت کو حق ہے کہ جس طرح چاہیں انھیں استعمال فرمائیں۔

ان رپوٹوں پر تبصرہ کرتے ہوئے امیر جماعت نے فرمایا:۔

(۱) شاہجہانپور کے رفیق کی پیشکش بلاشبہ بہت مبارک ہے اور میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ کسی کی حوصلہ شکنی کروں یا کسی ایسے نیک اقدام سے کسی کو منع کروں، بلکہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس پیش کش کو قبول فرمائے اور انھیں اس پر ثابت قدم رکھے، لیکن میں چاہتا یہ ہوں کہ وہ اجتماع کے بعد گھر پہنچ کر اپنے تمام حالات کا جائزہ لے کر دو تین مہینہ کے اندر پھر ٹھنڈے دل سے فیصلہ کریں اور اگر ان کا ارادہ قائم رہے تو مجھ کو لکھیں۔ پھر میں بتاؤں گا کہ انھیں کیا کرنا چاہیے۔ یہ میں اس لیے کہتا ہوں کہ بعض مرتبہ خاص موقع پر انسان وقتی تاثر سے مغلوب ہو کر اپنی ہمت اور قوت برداشت کا صحیح اندازہ کیے بغیر ایک فیصلہ کر لیتا ہے اور بعد میں جب اصل حالات سے اس کو سابقہ پیش آتا ہے تو اس کے لیے اپنے فیصلے پر قائم رہنا محال ہو جاتا ہے۔

(۲) ایک صاحب نے اپنی رپورٹ میں بعض لوگوں کا یہ اعتراض نقل کیا ہے کہ پہلے انسان کو خود معیاری مسلمان بننا چاہیے پھر دوسروں کی اصلاح کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ یہ ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ اس خیال کے لیے نہ شرع میں کوئی بنا ہے اور نہ عقل میں۔ قرآن اور حدیث سے بھی ہمیں یہی معلوم ہوتا ہے کہ خود نیک بننا اور دوسروں کو نیکی کی طرف بلانا ساتھ ساتھ ہونا چاہیے اور عقل بھی یہی چاہتی ہے کہ جس وقت آدمی پر حق منکشف ہو اسی وقت سے وہ خود بھی حق پرست بننے کی کوشش کرے اور دوسروں کو بھی حق کی طرف دعوت دے۔ ظاہر بات ہے کہ جب آپ کے ساتھ بہت سے لوگ ایک ہی مکان میں رہتے ہوں اور آپ کو معلوم ہو جائے کہ اس مکان کو آگ لگ گئی ہے تو آپ کا فرض یہی نہیں ہے کہ خود اس سے نکلنے کی کوشش کریں بلکہ آپ کا یہ بھی فرض ہے کہ اپنے دوسرے بھائیوں کو بھی اس آگ سے آگاہ کرنے اور ان کو اس مکان سے باہر نکالنے کی پوری پوری کوشش کریں۔ جو لوگ پہلے خود معیاری مسلمان بننے کی شرط لگاتے ہیں ان سے دریافت کیجیے کہ کیا ان کے پیش نظر کوئی خاص حد ایسی ہے جس پر پہنچ کر آدمی اپنے متعلق یہ رائے قائم کر سکتا ہو کہ اب وہ معیاری مسلمان بن گیا ہے۔ شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ جس وقت آپ کے اندر اپنے متعلق یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ آپ کامل ہو گئے ہیں اسی وقت سے آپکے ناقص ہونے کی ابتدا ہو جائے گی اور دوسروں کی تکمیل کی کوشش کے لیے وہی وقت سب سے زیادہ غیر موزوں ہوگا۔

(۳) رپوٹوں کے سلسلے میں ایک اور بات مجھے خاص طور پر کھٹکی ہے۔ وہ یہ کہ جا بجا غیر ضروری کسر نفسی اور بے جا انکسار سے کام لیا گیا

ہے۔ جس طرح یہ بات صحیح نہیں کہ اپنی کارروائیوں اور سرگرمیوں کو بڑھا چڑھا کر اور مبالغے سے بیان کیا جائے اسی طرح یہ بات بھی ٹھیک نہیں ہے کہ انھیں خواہ مخواہ سکیڑ کر اور حقیر شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی جائے۔ جو کچھ ہوا ہے اور جو ہو رہا ہے اسے بلاکم وکاست ٹھیک ٹھیک بیان کر دینا چاہیے۔ اپنوں اور دوسروں کا جائزہ لینے میں قطعاً کسی کمی بیشی سے کام نہ لیا جائے۔ آپ کی رپورٹیں تو گویا ایک ایسا آئینہ ہونی چاہئیں جن میں آپ کی کارروائیوں، آپ کے ارکان، و ہمدردوں اور علاقہ کے دوسرے لوگوں اور حالات کا بے لاگ عکس موجود ہو۔

اس کے بعد اجلاس ختم ہوا اور عشاء کی اذان ہوئی۔

اجلاس مجلس شوریٰ

(بعد نماز عشا)

عشا کی نماز اور کھانے کے بعد امیر جماعت کے دفتر میں مجلس شوریٰ کا اجلاس منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں حسب ذیل اصحاب شریک ہوئے۔

(۱) امیر جماعت (سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی)	(۲) مولانا امین احسن صاحب اصلاحی۔
(۳) مولانا مسعود عالم صاحب ندوی۔	(۴) مولانا محمد اسماعیل صاحب مدراسی۔
(۵) غازی محمد عبدالجبار صاحب دہلی۔	(۶) مولوی حکیم محمد عبداللہ صاحب روڑی۔
(۷) ملک نصراللہ خاں صاحب عزیز (مدیر کوثر لاہور)۔	(۸) مولانا نذیر الحق صاحب میرٹھی۔
(۹) میاں طفیل محمد صاحب (قیم جماعت)۔	(۱۰) سید محمد حسنین صاحب جامعی (قیم جماعت صوبہ بہار)۔
(۱۱) قاضی حمید اللہ صاحب سیالکوٹ۔	(۱۲) چودھری محمد اکبر صاحب سیالکوٹ۔
(۱۳) مولوی محمد یونس صاحب حیدرآباد (دکن)۔	(۱۴) سید عبدالعزیز صاحب شرقی۔
(۱۵) حکیم محمد خالد صاحب الٰہ آباد۔	(۱۶) جے۔ محمد بشیر صاحب بمبئی۔

اس اجلاس میں مرکز کی تعمیر اور تعلیمی اسکیم کے مسائل پر غور کیا گیا اور تمام حالات کا جائزہ لینے کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ ابتدائی تعلیم کا کام شروع کرنے کے لیے حالات اس وقت سازگار نہیں ہیں لہٰذا سردست اپنی تمام توجہ عارضی ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کا کام شروع کر دینے پر مرکوز کر دینی چاہیے اور اس کے ساتھ ساتھ ابتدائی تعلیمی اسکیم کو شروع کرنے کے لیے بھی سعی جاری رہنی چاہیے۔

اجلاس ششم

(بتاریخ ۸ جمادی الاول ۱۳۶۴ھ بروز ہفتہ)

صبح ۸ بجے یہ اجلاس حسب پروگرام مسجد میں شروع ہوا۔ اس اجلاس میں سیالکوٹ، سرحد، گوجرانوالہ، لالہ موسیٰ، گجرات، لاہور (ضلع لاہور)، امرتسر، فیروزپور، شہر و چھاؤنی، راہوں، پھلور، جاجہ (ہوشیارپور) لدھیانہ، کپورتھلہ، کیتھل (کرنال)، حصار،

ضلع شاہ پور اور ضلع راولپنڈی کی رپورٹیں پیش ہوئیں۔ اگرچہ بعض اور علاقوں کی رپورٹیں بھی باقی تھیں لیکن وقت کی کمی کے باعث فیصلہ کیا گیا کہ باقی رپورٹوں کو اجتماع عام میں نہ پیش کیا جائے بلکہ وہ اجتماع کے بعد امیر جماعت کے سامنے پیش کر دی جائیں۔

ان رپورٹوں پر تبصرہ کرتے ہوئے امیر جماعت نے فرمایا:۔

بسا اوقات جسے انسان شر سمجھتا ہے، اللہ کی طرف سے اس میں خیر کا پہلو نکل آتا ہے۔ میں افسوس کر رہا تھا کہ وقت کی کمی اور اپنی خرابیٔ صحت کی وجہ سے مجھے اجتماع سے پہلے رپورٹوں کے دیکھ لینے کا موقع نہیں ملا۔ اگر یہ موقع مجھ کو مل جاتا تو بہت سی عبارتوں پر میں نشان لگا دیتا اور نشان زدہ عبارتوں کے متعلق ہدایت کر دیتا کہ اجتماع میں انھیں نہ پڑھا جائے۔ لیکن اب میں محسوس کرتا ہوں کہ اس کا موقع نہ ملنا کچھ اچھا ہی ہوا۔ پچھلے دو روز میں جو رپورٹیں یہاں پیش ہوئی ہیں ان میں آپ کے سامنے جماعت کی حالت اور ارکان کی حالت جیسی کچھ کہ فی الواقع وہ تھی ویسی ہی سامنے آگئی ہے۔ تمام اچھے اور برے پہلو بے نقاب ہو گئے۔ ہمارے کارکنوں کا مزاج، انداز فکر اور اخلاقی حال جیسا کچھ تھا وہ سب کے سامنے کھل گیا۔ اب جو تبصرہ میں کروں گا اور میرے بعد مولانا امین احسن صاحب جو تقریر کریں گے اس سے مجھے امید ہے کہ ارکان جماعت اپنے کمزور پہلوؤں کی طرف توجہ فرمائیں گے اور انھیں دور کرنے کی کوشش کریں گے۔

(۱) آج میرے پاس بہت سی شکایتیں آئی ہیں کہ مختلف مقامات کی رپورٹوں میں علما اور دوسرے گروہوں اور جماعتوں پر تنقید میں سختی کی گئی ہے۔ یہ شکایتیں ایک حد تک بالکل بجا ہیں۔ اختلافات اور مخالفتوں کی وجہ سے طبائع میں جھنجلاہٹ کا پیدا ہو جانا اگرچہ کسی حد تک فطری بات ہے، لیکن فی الواقع یہ ایک کمزوری ہے اور جن لوگوں کو کسی بلند اخلاقی مقصد کے لیے کام کرنا ہو انھیں اپنے اندر سے اس کمزوری کو دور کرنا چاہیے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ جو لوگ دانستگی میں یا نادانستگی میں، اس دعوت الی الخیر کی راہ روک رہے ہیں، ان کے اس طرز عمل کو آپ سراہیے یا اسے برا نہ جانیے۔ ان کی غلطیوں کو غلطی کہنے سے نہ میں خود رکتا ہوں نہ آپ کو روکتا ہوں۔ واقعات کے بیان کو بھی میں روکنا نہیں چاہتا اگر فی الواقع حالات کو سمجھنے کے لیے ان کا بیان ضروری ہو۔ جہاں کسی جماعت کے غلط طرز عمل پر تنقید کرنے کی واقعی ضرورت پائی جائے وہاں زبان بند کر لینے کا مشورہ بھی میں کسی کو نہیں دیتا۔ لیکن جس چیز کو میں روکنا چاہتا ہوں وہ صرف یہ ہے کہ اس قسم کی مخالفتوں سے آپ کے مزاج میں برافروختگی اور آپ کی زبان میں تلخی پیدا ہو اور اس کے جواب میں دوسری طرف سے بات اور بڑھے۔ یہی چیزیں فتنہ کی موجب ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے ارکان کو اس بات کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے کہ ہماری جماعت میں جو لوگ شریک ہیں وہ مختلف گروہوں سے نکل کر آئے ہیں اور اب تک ان کی عقیدتیں اور دلچسپیاں کچھ نہ کچھ اپنے سابق گروہوں اور ان کی شخصیتوں کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اس حالت میں اگر ایک طبقے کے لوگ دوسرے طبقے والوں پر کوئی چوٹ کریں گے تو صرف یہی نہیں کہ اس طبقے پر کوئی اچھا اثر نہیں پڑے گا بلکہ اس سے یہ بھی اندیشہ ہے کہ اس طبقے سے آئے ہوئے جو لوگ ہماری جماعت میں موجود ہیں ان کے دلوں میں بھی ناراضی پیدا ہو گی۔ آپ کے سامنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کی مثالیں موجود ہیں کہ انصار میں اسلام قبول کرنے کے بعد بھی کچھ مدت تک اوس اور خزرج کی پرانی عداوتوں کے آثار موجود رہے، اور یہودی فتنہ پرداز بسا اوقات ان عداوتوں کی یاد تازہ کر کے فتنہ برپا کر دیا کرتے تھے۔ ان مثالوں سے سبق لے کر

آپ لوگوں کو اپنی تنقیدوں اور شکایتوں میں بہت زیادہ احتیاط سے کام لینا چاہیے کہ گروہی عصبیتیں خود آپ کی اپنی جماعت میں بھڑک کر کوئی فتنہ برپا نہ کریں۔

اس کے ساتھ میں ان حضرات سے بھی جو بعض گروہوں اور اشخاص کی عقیدت میں مبتلا ہیں اور اس وجہ سے تنقیدوں کی سختی کا شکوہ کرتے ہیں یہ گذارش کروں گا کہ جب آپ اس جماعت میں آئے ہیں تو اپنے اندر انصاف کی صفت پیدا کیجیے اور تمام چیزوں سے بڑھ کر حق سے عقیدت رکھیے۔ آپ کو شکایت ہے کہ بعض بڑے لوگوں کی غلط باتوں کا جب یہاں ذکر ہوا تو لوگ ہنس دیے۔ بلا شبہ یہ ہنسنا اچھا نہ تھا۔ بلا شبہ ہم کو ہر شخص کا اتنا ہی احترام ملحوظ رکھنا چاہیے جتنا ہم خود چاہتے ہیں کہ ہمارا ملحوظ رکھا جائے۔ لیکن آپ غور کیجیے کہ جو لوگ واقعی ہنسی کے قابل باتیں کرتے ہوں آخر دنیا کب تک ان پر ہنسنے سے باز رکھی جا سکتی ہے۔ خواہ ہم ان پر نہ ہنسیں لیکن بہرحال مضحکے کے قابل باتیں کرنے کے بعد کوئی شخص ہنسے جانے سے بچ نہیں سکتا، نہ آپ کی عقیدت مندی انھیں اس نقصان سے بچا سکتی ہے جو انھوں نے خود اپنے احترام کو پہنچایا ہے۔ اسی طرح آپ شکایت کرتے ہیں کہ بعض اشخاص اور جماعتوں پر تنقید میں سختی برتی گئی ہے۔ اس سختی کو میں بھی پسند نہیں کرتا، لیکن اس کے ساتھ آپ کو بھی یہ سوچنا چاہیے کہ جن چیزوں کی شکایت کی گئی ہے کیا وہ واقعی نہیں ہیں؟ اگر وہ واقعی ہیں تو کیا وہ حضرات جنھوں نے اس دعوتِ حق کی راہ میں رکاوٹیں ڈالنے کی کوشش کی وہ اپنے اس طرزِ عمل میں واقعی حق بجانب ہیں؟ اور اگر وہ حق بجانب نہیں ہیں تو پھر جتنی توجہ آپ دنیا سے ان کا احترام کرانے پر صرف کرتے ہیں برائے خدا اس سے آدھی ہی توجہ اس کوشش پر صرف کریں کہ وہ حضرات اپنی اس روش کو بدلیں۔ جہاں ایک طرف حق ہو اور دوسری طرف بڑی بڑی شخصیتیں ہوں وہاں اگر آپ کا دل شخصیتوں کی طرف زیادہ کھنچتا ہے تو یہ ایک بڑی خطرناک حالت ہے جس سے آپ کی اپنی حق پرستی کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ ایک سچے مسلمان کو سب سے پہلے جس چیز کی فکر ہونی چاہیے وہ یہ ہے کہ اس کے اندر حق کی محبت ساری محبتوں پر غالب ہو جائے اور کوئی عقیدت اس کے دل میں ایسی باقی نہ رہے جو کسی وقت حق کی عقیدت کے مقابلے میں آ کھڑی ہو۔ جہاں تک اس دعوتِ خیر کا تعلق ہے مجھے یہ کامل یقین ہے کہ کسی کی مخالفت اس کو دبانے میں کامیاب نہیں ہو سکتی بلکہ جو اس کو نقصان پہنچانے کی سعی کرے گا وہ خود نقصان اٹھائے گا۔ اس لیے میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ اس بنا پر نہیں کہہ رہا ہوں کہ کسی بڑے سے بڑے آدمی کی مخالفت سے بھی مجھے اس کام کے برباد ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ میری غرض تو صرف یہ ہے کہ ایک طرف آپ خود اپنی حق پرستی کو ایسی عقیدتوں کے زہر سے بچانے کی فکر کریں جو مخالفتِ حق کے باوجود کسی کے ساتھ لگی رہتی ہیں اور دوسری طرف تو ان حضرات کو بھی جن سے آپ عقیدت و محبت رکھتے ہیں مناع للخیر بننے کے برے نتائج سے بچنے کا مشورہ دیں۔

(۲) میں نے ابھی جس چیز کی طرف اشارہ کیا ہے اس کا ایک افسوس ناک ثبوت ابھی ابھی مجھکو ایک عجیب شکایت کی صورت میں ملا ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ کل میں نے اشتراکیوں کے ساتھ بعض علماء کی موافقت پر اپنے دلی رنج کا اظہار کرتے ہوئے ان برے نتائج کا ذکر کیا تھا جو روسی ترکستان میں اشتراکی مبلغین کے ساتھ علماء کی موافقت سے نہ صرف علماء کے حق میں بلکہ خود اسلام کے حق میں رونما ہوئے۔ آج میری اس تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے مجھ سے شکایت کی گئی ہے کہ ایک طرف تو تم علماء پر سخت تنقید کرنے سے لوگوں کو روکتے ہو اور دوسری طرف خود ایسی تنقید کرتے ہو۔ اسی قسم کی باتیں ہیں جن کی بنا پر یہ

یہ سمجھتا ہوں کہ آپ میں سے بعض لوگ حق کی عقیدت سے کچھ بڑھ کر رجال کی عقیدت میں مبتلا ہیں۔ میں آپ کو ثابت شدہ واقعات سنا رہا ہوں کہ اشتراکی کارکنوں کے ساتھ روسی ترکستان کے علماء نے ابتداءً جو تعاون کیا تھا اس کا خمیازہ کس بری طرح سے انھوں نے بھگتا اور اس کے نتیجے میں کس طرح اسلام اس سرزمین سے بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا گیا جو بارہ سو برس تک قبۂ اسلام بنی رہی تھی۔ اس کے ساتھ میں آپ کے سامنے یہ بھی واقعات پیش کر رہا ہوں کہ بعض اچھے خاصے ذمہ دار علماء ہندوستان میں کس طرح اسی غلطی کا اعادہ کر رہے ہیں۔ آپ میری ان دونوں باتوں میں سے کسی کی بھی تردید نہیں کرتے اور نہیں کر سکتے، لیکن پھر بھی آپ کو شکایت ان حضرات سے نہیں ہے جو اسلام کے لیے اپنی نادانی سے یہ خطرہ پیدا کر رہے ہیں بلکہ آپ کو الٹی شکایت اس شخص سے ہے جو اس نادانی پر ان کو خبردار کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کی جڑوں پر تیشہ چل جانے سے آپ کو اتنی تکلیف نہیں ہوتی جتنی اپنی عقیدت کے بتوں کو ٹھیس لگنے سے ہوتی ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اگر یہ آپ کی حالت ہے تو کس نے آپ کو مشورہ دیا کہ آپ ہماری اس جماعت میں تشریف لائیں؟ یہ جماعت تو بنی ہی اس اصول پر ہے کہ سب عقیدتوں کو ختم کر کے صرف ایک خدا اور اس کے رسول اور اس کے دین کی عقیدت باقی رکھی جائے۔ اور اس کے بعد اگر کوئی عقیدت ہو تو وہ اس اصلی عقیدت کے تابع ہونی چاہیے نہ کہ اس کی مدمقابل۔ لیکن اگر آپ ابھی تک ان عقیدت مندیوں میں مبتلا ہیں جو اس اصلی اور حقیقی عقیدت کی مدمقابل بن سکتی ہیں تو آپ کا مقام ہماری جماعت کے اندر نہیں بلکہ اس کے باہر ہے۔

(۳) میں نے آپ کی کارروائیوں کی رپوٹوں میں تعلیم بالغان کا ذکر بہت کم سنا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس کی اہمیت آپ پر کس طرح واضح کروں۔ اول تو میرے پاس کوئی زور نہیں ہے، اور اگر زور ہو بھی تو یہ کام ایسا نہیں ہے کہ بزور کسی سے لیا جاسکے۔ یہ تو ایک رضاکارانہ خدمت ہے اور صرف اسی طرح یہ ہو سکتی ہے کہ آپ خود اس کی پوری اہمیت کو محسوس کریں اور اپنے دلی جذبے کے ساتھ اسے کرنے کی کوشش کریں۔ اس کی مصلحتوں اور فائدوں کا ذکر میں اس سے پہلے کر چکا ہوں۔ اس کی ضرورت بھی میں نے آپکے سامنے واضح کر دی ہے۔ اب آپ میں سے جو لوگ تعلیم یافتہ ہیں وہ اس طرح سوچنا شروع کریں کہ انھوں نے اپنا کتنا وقت اور اپنی دماغی قابلیتوں اور جسمانی قوتوں کا کتنا حصہ اپنے نفس کی پرورش میں لگا رکھا ہے اور کتنا خدا کے کام کے لیے دیا ہے۔ اس کا حساب لگا کر اگر آپ دیکھیں گے تو جلدی ہی آپ پر منکشف ہو جائے گا کہ آپ نے سب سے کم حصہ خدا کو دے رکھا ہے حالانکہ عقیدہ آپ کا یہ ہے کہ سب کچھ اسی کا ہے۔ اس کے بعد اگر واقعی آپ کا دل اس بات پر آمادہ ہو کہ خدا کا حق بھی کچھ ادا کرنا چاہیے تو اس کا حق ادا کرنے کی کم سے کم صورت یہ ہے کہ اس کے جو بندے غفلت اور جہالت اور اخلاقی پستی میں پڑے ہوئے ہیں ان کو سدھارنے کے لیے آپ اپنے وقت کا ایک حصہ مستقل طور پر وقف کر دیں۔

(۴) بعض لوگوں نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ ہمارے مسلک کو سمجھنا عوام کے لیے مشکل ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس دین کو ابتدا میں عرب کے صحرا نشین بدوؤں نے اور ان پڑھ لوگوں نے سمجھا تھا جو کسی کتاب کا علم نہ رکھتے تھے۔ انھوں نے اس کو صرف سمجھا ہی نہیں بلکہ وہ اس کی گہرائیوں تک میں اتر گئے اور ان سے جن لوگوں نے اس کی تعلیم حاصل کی وہ دنیا کے معلم بن کر رہے۔ پھر یہ شبہ آپ کو کیسے ہوتا ہے کہ آج ہندوستان کے کسان اور مزدور اور عام باشندے اسے نہ سمجھ سکیں گے؟ میرا اپنا تجربہ تو یہ ہے کہ جن لوگوں نے کتابی علوم پڑھے ہیں ان کے دماغوں میں تو ضرور ایسے پیچ پڑ جاتے ہیں، جن کی وجہ سے

اس دین کی سیدھی سادی باتیں بھی ان کے اندر اتر تی مشکل ہوتی ہیں اور اسی وجہ سے ان کو سمجھانے کے لیے ہمیں لمبی چوڑی علمی بحثیں کرنی پڑتی ہیں، لیکن عامۃ الناس جن کے دماغ ایک بڑی حد تک اپنی فطری حالت پر ہیں اس دین کو بڑی آسانی سے سمجھ لیتے ہیں بشرطیکہ سمجھانے والا عام فہم اندازِ بیان اختیار کرے اور اس کے ساتھ اس کی اپنی زندگی اس بات کی شہادت دے کہ وہ جن چیزوں کو پیش کر رہا ہے فی الواقع وہ خود بھی ان پر ایمان رکھتا ہے۔ عوام کو آپ کی بات سمجھنے میں اگر کوئی الجھن پیش آسکتی ہے تو وہ صرف دو وجوہ سے پیش آسکتی ہے۔ ایک یہ کہ آپ ان کے سامنے اس طرح کی باتیں کریں جیسی کسی عربی مدرسے کے طالب علم یا کسی کالج کے لڑکوں کے سامنے کی جاتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ آپ خود کچھ اور ہوں اور باتیں کچھ اور کریں۔ ان دو خامیوں سے اگر آپ کی تبلیغ پاک ہو جائے تو آپ دیکھ لیں گے کہ عوام اس دین کو کس طرح آسانی سے سمجھتے ہیں۔

(۵) بعض لوگوں نے شکایت کی ہے کہ جب ہم عام لوگوں میں اصلاح و تبلیغ کی کوشش کرتے ہیں تو کوئی فتنہ پرداز شخص اٹھ کر کہہ دیتا ہے کہ یہ لوگ "وہابی" ہیں اور اس کے بعد کوئی ہماری بات سننے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ یہ شکایت جن حضرات نے پیش کی ہے وہ غالباً اس چیز کو اپنی راہ میں بڑی رکاوٹ سمجھ رہے ہیں۔ حالانکہ اگر اس لفظ وہابی کی تاریخ اور پروپیگنڈے کے اُس ہتھکنڈے کو سمجھ لیا جائے جس سے یہ لفظ پیدا ہوا ہے تو بڑی آسانی سے اس کا توڑ معلوم کیا جا سکتا ہے۔ دراصل انیسویں صدی میں کچھ سیاسی اسباب سے مصر اور ترکی کی مسلمان اور ہندوستان کی غیر مسلم حکومت نے اُن اصلاحی تحریکوں کو جو ہندوستان اور عرب میں اٹھی تھیں دبانے کے لیے یہ وہابی کا لفظ ایجاد کیا تھا۔ پروپیگنڈا کے کارگر نسخوں میں سے ایک یہ ہے کہ جس گروہ کو آپ زک پہنچانا چاہیں اسے پہلے ایک نام دیجیے، اور تمام برائیاں جو اس کی طرف منسوب کرنا چاہتے ہوں ان سب کے معنی اس خاص نام میں پیدا کر دیجیے۔ پھر اس نام کا اتنا اشتہار کیجیے کہ جہاں وہ نام لیا گیا اور فوراً سننے والوں کے سامنے ان ساری برائیوں کی تصویر آجائے جو آپ نے اس نام کے ساتھ وابستہ کر دی ہیں۔ اس طرح لمبی چوڑی تقریروں اور تحریروں کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی بلکہ ان سب کی جگہ صرف ایک لفظ زبان سے نکال دینے سے کام چل جاتا ہے۔ موجودہ زمانے میں مختلف جماعتوں نے اپنے پروپیگنڈا کے لیے اس طریقے کو استعمال کیا ہے۔ مُلّا، ٹوڈی، رجعت پسند، بورژوا اور اسی طرح کے دوسرے الفاظ اسی غرض کے لیے وضع کیے گئے ہیں، اور ان سے خوب کام لیا گیا ہے۔ ایسا ہی ایک ہتھیار لفظ وہابی بھی ہے جسے ابتدا میں بعض خود غرض حکومتوں نے سیاسی مقاصد کے لیے ایجاد کیا اور پھر مسلمانوں کے ان تمام گروہوں نے اس سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا جو عوام میں کسی قسم کی دینی بیداری پیدا ہونے کو اپنی دنیوی اغراض کے لیے نقصان دہ سمجھتے ہیں۔ اب اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ آپ اپنے وہابی ہونے کی تردید کرتے پھریں اور نہ یہی درست ہے کہ جہاں آپ کے خلاف یہ ہتھیار استعمال کیا جائے وہاں سے آپ شکست کھا کر پسپائی اختیار کر لیں، بلکہ اس کا علاج صرف یہ ہے کہ آپ سیدھے سیدھے ایک مسلمان کی سی زندگی بسر کرتے رہیں اور خلق خدا کو توحید خالص اور قرآن و سنت کے اتباع کی دعوت دیتے رہیں اور جو لوگ آپ کو وہابی کہتے ہیں ان کو چھوڑ دیں کہ وہ اسی نام کی تسبیح پڑھتے رہیں۔ اس کا نتیجہ بالآخر یہ ہوگا کہ رفتہ رفتہ آپ کے طرز عمل اور ان لوگوں کے اشتہار وہابیت سے مل جل کر لفظ وہابی میں ایک اور معنی پیدا ہو جائیں گے اور وہ یہ کہ وہابی اسے کہتے ہیں جو سیدھی سادی مسلمان کی سی زندگی بسر کرتا ہو، کسی سے جھگڑا اور بحث و مناظرہ نہ کرتا ہو، پاکیزہ اخلاق اور نیک معاملات رکھتا ہو، اور عقیدۂ توحید اور اتباع

قرآن و سنت کی دعوت دیتا ہو۔ اس کے بعد جو شخص فی الواقع انہی چیزوں کا طالب ہوگا جو آپ کے پاس اسے ملتی ہیں اس کو تو وہابیت کا نام آپ کی طرف آنے سے روکے گا نہیں بلکہ الٹا آپ کی طرف کھینچے گا، اور وہ زمین میں "وہابیوں" ہی کو ڈھونڈتا پھرے گا، رہے وہ لوگ جو بجائے خود اسلام ہی کو اس کی حقیقی صورت میں پسند نہیں کرتے تو وہ ضرور آپ سے دور بھاگیں گے لیکن آپ کو افسوس نہ کرنا چاہیے اگر ایسے حق سے پھرے ہوئے لوگ آپ سے دور بھاگیں۔

تجاویز

اس کے بعد وہ تجاویز پیش ہوئیں جو مختلف جماعتوں اور ارکان کی طرف سے آئی تھیں۔ امیر جماعت نے خود ہر تجویز کو پڑھ کر سنایا، اس کے بعد مختصر الفاظ میں اس کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا اور مجوزین کو موقع دیا کہ اگر وہ ان کے جواب سے مطمئن نہ ہوں تو اپنی تجویز کے متعلق خود اپنا نقطۂ نظر پیش کریں لیکن اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کسی نے ضرورت محسوس نہیں کی۔ ذیل میں تجاویز کا خلاصہ نمبروار درج کیا جاتا ہے اور ہر تجویز کے بعد جس رائے کا اظہار امیر جماعت نے کیا وہ بھی ساتھ ساتھ درج ہے:

تجویز نمبر۱: مجوزہ تعلیمی درسگاہ کا جلدی سے جلدی اجرا کیا جائے۔ اگر جنگی حالات کی وجہ سے مستقل عمارات نہ بن سکتی ہوں تو عارضی عمارات ہی بنا کر کام شروع کر دیا جائے۔

امیر جماعت: رات مجلس شوریٰ میں اس پر غور کیا گیا ہے۔ چونکہ عارضی ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے زیادہ عمارات کی ضرورت نہیں ہے اور موجودہ عمارات ہی تھوڑے تغیر اور اضافے سے اس کے لیے کافی ہو سکتی ہیں اس لیے فیصلہ کیا گیا ہے کہ اس کام کو جلدی سے جلدی شروع کر دیا جائے۔ رہی ابتدائی تعلیم تو اس کی تیاری کی جاتی رہے گی، لیکن شاید اس کے شروع کرنے میں ابھی دیر لگے گی۔ عارضی عمارات بنانے میں بھی جو دقتیں ہیں وہ بآسانی دور نہیں کی جا سکتیں۔

تجویز نمبر۲: تعلیم یافتہ ارکانِ جماعت کے لیے ایک تربیت گاہ کا انتظام کیا جائے۔

امیر جماعت: جس ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کا انتظام اب ہم شروع کرنے والے ہیں اس کے پروگرام میں تربیت گاہ بھی شامل ہے۔

تجویز نمبر۳: ائمۂ مساجد اور دیہاتی پرائمری مدارس کے لیے مدرسین اور دیہات میں کام کرنے والے مبلغین کا انتظام کیا جائے۔

امیر جماعت: جہاں تک نفس اُس ضرورت کا تعلق ہے جس کا اظہار آپ کی اس تجویز سے ہو رہا ہے، اس کو ہماری ثانوی اور اعلیٰ تعلیم پورا کر دے گی۔ لیکن میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ اس تجویز کے پیچھے کچھ اُس شور و شغب کے اثرات بھی کام کر رہے ہیں جو "ائمۂ مساجد کی ٹریننگ" اور "مبلغین کی تیاری" اور "مدرسین دینیات کی تربیت" اور اسی قسم کے دوسرے عنوانات پر پچھلے چند سال سے برپا ہے۔ ہمارے ملک میں ایک اچھا خاصا گروہ ایسے لوگوں کا بھی پایا جاتا ہے جو اصلاح احوال کی ضرورت کا احساس تو رکھتے ہیں مگر اتنی بصیرت نہیں رکھتے کہ احوال کی اصل خرابی کو سمجھ سکیں اور انھیں درست کرنے کی صحیح تدابیر معلوم کر سکیں۔ یہ لوگ سطحی طور پر چند خرابیوں کو دیکھ کر سمجھتے ہیں کہ بس یہی اصل بیماریاں ہیں اور ان کے علاج کے لیے چند سستے نسخے تجویز کرکے ان کا اشتہار دینا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر جب کچھ مدت تک یہ اشتہارات فضا میں گونجتے رہتے ہیں تو دماغوں پر ان کا کچھ ایسا تسلط ہو جاتا ہے کہ جہاں کسی نے اصلاح احوال کا تصور کیا اور بے ساختہ اس کی زبان پر "ائمۂ مساجد کی ٹریننگ" اور "مبلغین کی تیاری" اور ایسے ہی

کچھ دوسرے فقرے جاری ہونے لگتے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ شاید آپ حضرات بھی وقت کے ان چلتے ہوئے اشتہارات سے متاثر ہو گئے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو ذہن کو "اشتہار پروف" بنانے کی کوشش کیجیے۔ سوچیے تو سہی کہ آخر ائمۂ مساجد کس لیے تیار کیے جائیں؟ کیا آپ کا گمان ہے کہ مسجدوں پر نالائق پیش نمازوں کا قبضہ صرف اس وجہ سے ہے کہ لائق امام نہیں ملتے ورنہ اگر اچھے اماموں کی فراہمی کا انتظام ہو جائے تو سارے ملک کی مسجدیں ہاتھوں ہاتھ ان کو لیں گی اور دیکھتے دیکھتے ہر مسجد مسلم سوسائٹی کا دھڑکتا ہوا دل بن جائے گی؟ اگر بات صرف اتنی ہی ہوتی تو پھر رونا کاہے کا تھا۔ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ نالائق امام مسجدوں میں خود نہیں آئے ہیں بلکہ مسلمان ان کو لائے ہیں۔ مسلمانوں کو دراصل وہ لوگ مطلوب ہی نہیں ہیں جو بستیوں میں ان کے واقعی امام بن کر رہیں اور مسجدوں کو اسلامی زندگی کا مرکز بنا کر رکھیں۔ ان کا بگڑا ہوا مذاق، ان کی دینی بے حسی ان کی اخلاقی پستی، ان کا دنیا میں استغراق اور خدا کے ساتھ ان کا منافقانہ رویہ صرف ایسے امام پسند کرتا ہے جو بستیوں کے پیشہ ور "کمینوں" کی طرح ایک قسم کے "کمین" بن کر ان کی مسجدوں میں رہیں اور ان کی دی ہوئی روٹیاں کھا کر پیش نمازی کا کام بس اس طرح انجام دیا کریں جس طرح وہ ان سے لینا چاہتے ہیں۔ پس خرابی یہ نہیں ہے کہ جسم (یعنی مسلم سوسائٹی) زندہ ہے مگر کسی حادثہ سے اس کے دل (یعنی مسجد) پر جمود و سکون طاری ہو گیا ہے۔ بلکہ حقیقی خرابی یہ ہے کہ جسم خود ٹھنڈا ہو گیا ہے اور اس نے بالآخر دل کو ٹھنڈا کر کے چھوڑا ہے۔ اب اگر آپ کے پیش نظر یہ ہے کہ جیسے تنخواہ دار امام و خطیب یہ بگڑی... ہوئی سوسائٹی مانگتی ہے ویسے ہی آپ تیار کرنا شروع کر دیں اور جہاں جہاں سے ان کی مانگ آئے وہاں نان و نفقہ کا معاملہ طے کر کے ان کو بھیج دیا کریں تو "پیشۂ امامت" کا سکھلانا اور اس کے لیے کچھ اہل حرفہ کو تیار کرنا ہمارے بس کا کام نہیں ہے۔ اور اگر آپ وہ حقیقی امام بنانا چاہتے ہیں جو ایک زندہ مسلم سوسائٹی کو درکار ہوتے ہیں تو جب وہ زندہ سوسائٹی موجود نہ ہو اس کے لیے امام تیار کرنا ایسا ہے جیسے دولہا کو تیار کر لیا جائے درانحالیکہ دلہن ابھی بطن مادر میں بھی نہ آئی ہو۔ ہم اپنی درسگاہ میں جن لوگوں کو تیار کریں گے ان کا اصل کام ایک زندہ مسلم سوسائٹی کو پیدا کرنا ہوگا، پھر جیسے جیسے ان کی دعوت سے ایسی سوسائٹی وجود میں آتی جائے گی، یہی داعی فطری طور پر اس کے لیڈر (امام) بنتے جائیں گے اور جن مسجدوں کو وہ اپنا قلب متحرک بنائے گی ان کے امام اور پوری بستی کے دینی، اخلاقی اور اجتماعی اور سیاسی پیشوا یہی لوگ قرار پائیں گے۔

ایسی ہی کچھ غلط فہمی مدرسین کی تیاری کے معاملہ میں بھی آپ کو ہوئی ہے۔ واقعہ یہ نہیں ہے کہ لوگ حقیقی اسلامی تعلیم کے خواہشمند ہیں اور کمی صرف مدرسین کی ہے، بلکہ اصل مصیبت یہ ہے کہ لوگوں کے اندر حقیقی اسلامی تعلیم کی طلب ہی نہیں ہے۔ وہ جس چیز کی طلب رکھتے ہیں اگر اسی کو اجرت پر فراہم کرنے کے لیے آپ تعلیمی مزدور تیار کرنا چاہتے ہیں تو یہ خدمت انجام دینا ہمارا کام نہیں ہے، اور اگر آپ کے پیش نظر وہ تعلیم تیار کرنا ہے جو اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق آئندہ نسلوں کو ڈھال سکتے ہوں تو اس جنس کی فراہمی کا انتظام کرنے سے پہلے منڈی میں اصلی مانگ پیدا کیجیے۔ اسی طرح مبلغین کی تیاری کا مفہوم بھی غالباً آپ کے ذہن میں واضح نہیں ہے۔ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ کچھ لوگوں کو تبلیغ کا فن اس لیے سکھایا جائے کہ ملک کے مختلف انجمنوں کو جس قسم کے پیشہ ور تنخواہ دار مبلغ درکار ہیں وہ یہاں سے فراہم کیے جائیں؟ اگر یہ آپ کا مقصد نہیں ہے تو مبلغین کی تیاری کے لیے ایک مستقل تجویز کی کیا ضرورت ہے؟ ہماری درسگاہ میں جو تعلیم لوگوں کو دی جائے گی اور جو دینی روح ان کے اندر پھونکی جائے گی وہ اس غرض کے لیے بالکل کافی ہوگی کہ یہ لوگ جہاں بھی آ بیٹھیں

اور جو کام بھی کریں اپنے اخلاق سے، اپنے معاملات سے، اپنی گفتار سے، اپنی رفتار سے، ہر چیز سے دینِ حق کی تبلیغ کرتے رہیں۔

تجویز نمبر ۴: ارکان اپنی اور اپنے بچوں کی شادیاں صرف دیندار لڑکی یا لڑکے سے کریں۔

امیرِ جماعت: یہ ایسی چیز نہیں ہے جسے تجویز کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ یہ تو حقیقی دینی شعور پیدا ہو جانے کا لازمی اور اس کا فطری نتیجہ ہے۔ جب آدمی میں بھی یہ شعور پیدا ہو جائے گا وہ لازماً دین سے پھرے ہوئے اور اخلاقی حیثیت سے گرے ہوئے لوگوں کو شادی بیاہ کے تعلق کے لیے تو درکنار دوستی و ہم نشینی کے لیے بھی پسند نہ کرے گا۔ اور اگر کوئی شخص ایسا ہے جو دینی شعور رکھنے کا دعویٰ کرتا ہے مگر شادی بیاہ کے لیے دین و اخلاق کو دیکھنے کے بجائے مال و دولت اور دنیوی وجاہت کا لحاظ کرتا ہے تو اس کا دعویٰ یا تو فریب ہے یا پھر ایک غلط فہمی ہے جو اسے اپنی نسبت ہو گئی ہے۔ ایسے لوگ اگر خدانخواستہ ہماری جماعت میں پائے جائیں تو انھیں ضرور مطلع کر دینا چاہیے کہ آپ کے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے کیونکہ آپ کی یہ حرکت اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ آپ کے اندر شعور کی کمی ہے۔ اور آپ کا معیارِ قدر و قیمت ابھی تک دنیا پرستانہ ہی ہے۔ پس جو چیز بجائے خود دینی حس کی مقیاس ہے اسے یہاں ایک تجویز کی شکل میں پیش کرنا اور پھر ایک جماعتی فیصلے کی صورت میں نافذ کرنا میرے نزدیک ٹھیک ایسا ہے جیسے کل ہم اپنے اجتماع میں یہ تجویز پاس کریں کہ سب ارکانِ جماعت نماز پڑھیں۔ جس طرح ہم ارکانِ جماعت کے دینی شعور سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ خود اپنے احساسِ فرض کی بنا پر نماز پڑھیں گے نہ کہ کسی جماعتی تجویز کی بنا پر اسی طرح ہم ان سے یہی توقع رکھتے ہیں کہ ان کے نزدیک رشتہ داریوں اور دوستیوں اور تمام تعلقات میں دینداری و طہارتِ اخلاق کا لحاظ دوسرے سب ملحوظات پر مقدم ہوگا۔

تجویز نمبر ۵: ہر رکن کو جسمانی مشقتیں برداشت کرنے کا خوگر بنانے کے لیے ضروری ہدایات دی جائیں۔

امیرِ جماعت: اگر اس کا منشا یہ ہے کہ جماعت میں پریڈ اور ورزش کا انتظام کیا جائے اور فنونِ سپہ گری سکھانے کے لیے اکھاڑے قائم کیے جائیں تو یہ ہمارے طریقِ کار کے بالکل خلاف ہے۔ اور اگر اس سے مقصود یہ ہے کہ لوگوں کو مصنوعی طور پر کچھ جفاکشی کے طریقے اختیار کرنے کا حکم دیا جائے تو یہ ایک فضول بات ہے۔ اس اصولی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ زندگی میں بے شمار چیزیں ایسی ہیں جن کی ضرورت پیش آتی ہے لیکن اگر ان میں سے ہر ایک کو لے کر مقصود بالذات بنایا جائے اور ایک ایک کے لیے لوگوں کو اکسا کر جدا جدا انتظامات کیے جائیں تو اس طرح نہ صرف یہ کہ کوششیں منتشر ہو جائیں گی بلکہ فی الواقع ان بے شمار چھوٹے چھوٹے مقاصد سے بھی کسی مقصد کے ساتھ لوگوں کی دلچسپی اور وابستگی زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکے گی۔ برعکس اس کے اگر لوگوں کی نظریں کسی ایک بلند نصب العین پر جما دی جائیں اور اس کا عشق لوگوں کے دلوں میں بھڑکا دیا جائے تو پھر لوگ ہر اس چیز کے لیے کام کرنے لگیں گے جس کی اس نصب العین کے لیے ان کو ضرورت محسوس ہوگی اور مختلف کاموں کے لیے ان کو الگ الگ اکسانے کی کوئی ضرورت نہ رہے گی۔ جو نصب العین اس وقت ہم نے بندگانِ خدا کے سامنے پیش کیا ہے اور جس کی کشش سے آپ لوگ کھنچ کر آئے ہیں بس ساری کوشش اسی کا عشق اپنے دلوں میں اور دوسرے لوگوں کے دلوں میں بھڑکانے پر صرف کر دیجیے۔ پھر اگر اس کے لیے جسمانی قوت بہم پہنچانے کی ضرورت محسوس ہوگی تو اس کا انتظام اپنے وقت پر خود بخود ہوگا۔ اگر وہ جفاکشی کا طالب ہوگا تو نازوں کے پالے ہوئے لوگ آپ سے آپ اس کے عشق میں مشقتیں سہنے لگیں گے۔ اور اگر کسی صنعت کے اجراء

یا کسی فن کی تحصیل کا مطالبہ کرے گا تو لوگ دلی شوق کے ساتھ اس کی طرف دوڑیں گے۔ ان میں سے کسی کام کے لیے بھی کسی مستقل تحریک کی حاجت پیش نہ آئے گی بلکہ تحریک کا ارتقاء فطری طور پر ہر مرحلے میں اپنی ضروریات آپ پر خود ہی واضح بھی کر دے گا اور خود ہی آپ کو مجبور کر کے انھیں پورا بھی کرے گا۔ لیکن اگر ہم کسی چیز کا وقت آنے سے پہلے، تحریک کے اندر اس کی مانگ پیدا ہونے اور اس کی ضرورت کا احساس ابھرنے سے پہلے مصنوعی طور پر اس کے لیے تحریک کریں گے تو نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہو گا کہ محض ایک کام شروع کیا جائے گا، چند دنوں تک اسے نیم دلی اور بد دلی کے ساتھ کیا جاتا رہے گا اور پھر رفتہ رفتہ وہ ختم ہو جائے گا۔

تجویز نمبر ۵ : ہندوستان کے تمام اطراف میں تحریک کی اشاعت کے لیے ترجمان اور مکتبہ جماعت کے رجسٹروں سے ان لوگوں کی ضلع وار فہرستیں بنائی جائیں جن تک لٹریچر پہنچ چکا ہے اور پھر ہر مقام کی جماعت کو اس کے ضلع کی یا آس پاس کے اضلاع کی فہرست بہم پہنچانے کا انتظام کیا جائے۔

امیر جماعت : ایک عرصہ سے میں خود اس ضرورت کو محسوس کر رہا ہوں لیکن مکتبے اور ترجمان کا سٹاف اتنا کم ہے کہ اس پر فہرست بنانے کا بار نہیں ڈالا جا سکتا۔ اگر ارکان جماعت میں سے دو تین حضرات چند روز کے لیے یہاں ٹھہر جائیں تو یہ ضرورت بآسانی پوری ہو سکتی ہے۔

نوٹ :۔ اس اپیل پر چند صاحبوں نے اپنی خدمات پیش کیں جن میں سے دو صاحبوں کو یہاں روک لیا گیا۔ شمالی ہند کی فہرست تقریباً تیار ہو چکی ہے۔

تجویز ۷ : لٹریچر کا انگریزی اور دوسری ملکی زبانوں میں ترجمہ ہونا چاہیے۔ نیز ترجمان کا ایک حصہ یا ایک مستقل رسالہ انگریزی میں نکالا جائے۔

امیر جماعت : بلاشبہ یہ ضرورت اہم ہے مگر انگریزی زبان کے لیے اب تک ہمیں کوئی موزوں آدمی نہیں ملا ہے۔ دوسری زبانوں کے لیے کچھ نہ کچھ انتظام ہو رہا ہے جس کی کیفیت آپ کو قیم جماعت کی رپورٹ سے معلوم ہو چکی ہے۔

تجویز نمبر ۸ : عورتوں اور بچوں کے لیے آسان لٹریچر تیار کیا جائے۔

امیر جماعت : جہاں تک بچوں کے لٹریچر کا تعلق ہے یہ ضرورت ایک بڑی حد تک ہمارے ابتدائی تعلیم کے نصاب سے پوری ہو جائے گی۔ البتہ عورتوں کا سوال خاص اہمیت رکھتا ہے اور اس کے لیے ہمیں خود عورتوں ہی کا تعاون حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ ارکان جماعت کو خاص طور پر اس طرف توجہ کرنی چاہیے کہ خود اپنے خاندان کی خواتین کو ہم خیال بنائیں۔ ان شاء اللہ انہی میں سے کچھ اس قابلیت کی خواتین نکل آئیں گی جو اپنی ہم جنسوں میں اس دعوت کو پھیلانے کے لیے مفید کام کر سکیں گی۔

تجویز نمبر ۹ : صحیح اسلامی تاریخ کی ترتیب۔

امیر جماعت : یہ ہماری مجلسِ تحقیقاتِ علمیہ (Accadamy) کے پروگرام میں شامل ہے جسے اپنی درسگاہ کی اسکیم کو شروع کرنے کے بعد ہی ان شاء اللہ ہم عملی جامہ پہنائیں گے۔

تجویز نمبر ۱۰ : عوام اور غیر مسلموں میں اشاعت کے لیے آسان لٹریچر کی فراہمی نیز ہندو بیاتیوں سے ربط پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

امیر جماعت :۔ بلاشبہ عوام اور غیر مسلموں کے لیے ہمارے لٹریچر میں اب تک بہت کم چیزیں ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت تک لٹریچر تیار کرنے کا سارا کام ایک ہی شخص کر رہا ہے جو مخصوص تعلیم یافتہ طبقوں کے لیے ہی لکھنے کی

صلاحیت رکھتا ہے۔ اب ضرورت ہے کہ جماعت میں جو لوگ انشاء پردازی کی قابلیت رکھتے ہیں وہ اپنا جائزہ لے کر خود اندازہ کریں کہ وہ کس طبقے کے لوگوں کے لیے کس قسم کی چیزیں لکھ سکتے ہیں، اور عملاً اپنی قوتوں کو اس کام میں استعمال کرنا شروع کر دیں۔ جہاں تک اشاعت کا تعلق ہے ایسی چیزوں کو تو ہمارا مکتبہ خود شائع کر سکتا ہے جو براہ راست جماعتی لٹریچر قرار پا سکتی ہوں، رہیں وہ ضمنی چیزیں جو ہماری دعوت سے کسی نہ کسی طرح کا قریبی تعلق رکھتی ہوں تو ان کی اشاعت کے لیے ارکان جماعت آپس میں مل کر مختلف مقامات پر اپنے دارالاشاعت قائم کر سکتے ہیں یا ان دارالاشاعتوں سے تعلق پیدا کر سکتے ہیں جو پہلے سے بعض ارکان نے قائم کر رکھے ہیں۔

عوام سے ربط قائم کرنے کے لیے بہترین صورت وہی ہے جو میں نے تعلیم بالغاں کی شکل میں پیش کی ہے۔ رہا دیہات میں کام کرنے کا سوال تو اس کے متعلق میں اس سے پہلے کئی مواقع پر کہہ بھی چکا ہوں اور لکھ بھی چکا ہوں کہ یہ کام صرف ان لوگوں کو کرنا چاہیے جو اس کی صلاحیت رکھتے ہوں اور اس سے زیادہ قیمتی کام نہ کر سکتے ہوں۔ ہر کس و ناکس کا اٹھ کر سیدھا دیہات کا رخ کرنا محض ایک نادانی ہے اور وقت کی چلتی ہوئی رو کے پیچھے دوڑنا۔ اسی طرح جو شخص دیہات میں چکر لگانے سے بدرجہا قیمتی کام کسی دوسری شکل میں کر سکتا ہو اس کا محض اس لیے دیہات کی طرف رخ کرنا کہ آجکل اس کام نے کچھ قبولیت عام حاصل کر لی ہے اپنی قوتوں کا بے جا استعمال ہے اور اس پر خدا کے ہاں اجر ملنے کے بجائے باز پرس ہونے کا خطرہ ہے۔ البتہ جو لوگ دیہاتی آبادی سے خطاب کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں اور جن کو اس کام سے پیدائشی مناسبت ہے انھیں اس طرف ضرور توجہ کرنی چاہیے۔ لیکن اس کے لیے صحیح طریقہ یہ نہیں ہے کہ ایک پارٹی اٹھے اور چند روز کے اندر ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک بہت سے دیہات کا چکر لگا آئے۔ بلکہ اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ایک گاؤں کو انتخاب کیجیے اور اس میں ایک کافی مدت تک مسلسل کام کرتے رہیے یہاں تک کہ چند آدمی وہاں آپ کے پختہ ہم خیال، اخلاقی حیثیت سے کافی حد تک تبدیل شدہ اور ہماری تحریک کے کارکن بننے کے لیے موزوں تیار ہو جائیں، پھر ان کو خود ان کی بستی میں اصلاح و دعوت کا کام اسی طریقے پر کرنے کے لیے استعمال کیجیے۔

نوٹ:- تعلیم بالغاں کے لیے نصاب مرتب کرنے اور ملک کے دوسرے اداروں کے مرتب کردہ نصابوں میں سے مفید چیزیں انتخاب کرنے کی خدمت محمد شفیع صاحب (مدرسہ ابتدائی رجبن بازار میرٹھ) اور سید نقی علی صاحب (صدر مدرس کورنمنٹ براؤ ڈچ بی این ۔ ایس، آر دکن) نے اپنے ذمہ لی ہے۔ اب جو لوگ اس سلسلے میں کام کرنا چاہیں وہ ان حضرات سے براہ راست مراسلت کر کے مشورہ حاصل کریں۔

تجویز نمبر ۱۱: بعض مقامات پر ذیلی مراکز قائم کرنے کی تجویزیں۔

امیر جماعت: اگر ابھی کچھ مدت ذیلی مرکزوں کو ملتوی رکھا جائے تو زیادہ بہتر رہے گا، اس لیے کہ سردست ہمیں اپنی جماعت کی تمام قوت اور اپنے سارے وسائل اور مردان کار جمع کر کے اصل مرکز کو طاقتور بنا لینا چاہیے، پھر جتنے بھی ذیلی مرکز ملک کے مختلف گوشوں میں بنیں گے انشاء اللہ وہ ہمارے لیے مفید ثابت ہوں گے اور ان سے مرکز کو اور مرکز سے ان کو تقویت پہنچے گی۔ لیکن اگر اس وقت ہمارے ارکان اور ہماری بیرونی جماعتیں ذیلی مراکز بنانے کی طرف توجہ کریں گی تو اس کا نتیجہ ہوگا کہ ہماری قوتیں منتشر ہو جائیں گی، نہ اصل مرکز ہی بن سکے گا اور نہ ذیلی مراکز ہی کوئی مفید صورت اختیار کر سکیں گے۔ اس سے میرا یہ مدعا نہیں ہے کہ آپ لوگ جہاں جہاں ذیلی مراکز قائم کرنے کے امکانات اور مواقع پاتے ہیں ان پر غور کرنا بھی چھوڑ دیں۔ بہتر ہے کہ تمام پہلو آپ کے سامنے

رہیں اور جب ذیلی مراکز قائم کرنے کا موقع آئے تو سوچی سمجھی سکیمیں آپ کے پاس تیار رہوں۔

تجویز نمبر ۱۲: مرکز کسی مرکزی جگہ پر ہونا چاہیے۔

امیر جماعت: مرکزی جگہ تو وہی ہوتی ہے جہاں مرکز ہو۔ اب اس سوال کو چھوڑ ہی دیا جائے تو بہتر ہے۔ جب ایک مرتبہ سر جوڑ کر ہم فیصلہ کر چکے ہیں کہ ہمیں یہیں بیٹھ کر کام کرنا ہے تو اس سوال کو بار بار اٹھانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اس کے علاوہ ہمیں تجربے سے یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ اکثر اس قسم کی تجویزیں محض خواہش کی شکل میں آتی ہیں حالانکہ خواہش میں نہ آدمی رہ سکتے ہیں نہ بک ڈپو رکھا جا سکتا ہے اور نہ پریس نصب کیا جا سکتا ہے۔ ان چیزوں کے لیے تو جگہ اور مکانات چاہییں۔ وہ یہاں کسی نہ کسی حد تک موجود تو ہیں۔

تجویز نمبر ۱۳: عورتوں میں ترقی تحریک کی عملی اسکیم بنائی جائے اور اس کے لیے ہدایات دی جائیں۔

امیر جماعت: فی الواقع ہمارے لیے یہ سوال بہت اہم ہے کہ عورتوں کو کس طرح اپنے ساتھ لیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ جب تک عورتیں ہمارے ساتھ نہ ہوں پچاس فی صدی آبادی مستقل طور پر ہم سے غیر متعلق رہے گی اور وہ پچاس فی صدی آبادی بھی وہ ہوگی جس کی گود میں بقیہ پچاس فی صدی آبادی تیار ہوتی ہے۔ لہٰذا ہماری تحریک کی ترقی کے لیے عورتوں کا اس میں شامل ہونا اتنا ہی ضروری ہے جتنا مردوں کا شامل ہونا۔ لیکن ہمارے لیے یہ کام اتنا سہل نہیں ہے جتنا دوسری تحریکوں کے لیے ہے۔ دوسری تحریکیں تو عورتوں کو آزادی کا سبق پڑھا کر گھروں سے باہر نکال لاتی ہیں اور انھیں مردوں کے دوش بدوش دوڑ دھوپ کرنے کے لیے تیار کر لیتی ہیں۔ لیکن ہمیں جو کچھ کرنا ہے اسلامی اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے ان حدود کے اندر کرنا ہے جو شریعت نے مقرر کیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کو بحالت موجودہ اس معاملے میں مشکلات سے سابقہ پیش آ رہا ہے۔ سردست میرے نزدیک عورتوں میں اس تحریک کو پھیلانے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے کہ ہمارے رفقا، اور ہمدرد خود اپنی ماؤں، اور بہنوں بیٹیوں، اور اپنے خاندان کی دوسری خواتین میں اپنے خیالات پھیلائیں، اپنے عملی اخلاق سے ان کو متاثر کریں، ان میں جو تعلیم یافتہ ہوں ان کو لٹریچر پڑھوائیں، اور جو تعلیم یافتہ نہ ہوں ان کو خود تعلیم دیں۔ اس طرح جب ایک کافی مدت تک کوشش کی جائے گی اور اس کے نتیجے میں جب عورتوں کی ایک کافی تعداد ہماری ہم خیال بن جائے گی تب یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ خود عورتوں ہی میں ایسی کارکن خواتین ہمیں مل جائیں گی جو دوسرے گھروں تک ہمارے خیالات اور اخلاقی اثرات پھیلا سکیں گی۔ لیکن اس معاملے میں خاص طور پر یہ احتیاط ملحوظ رکھی جائے۔ کہ ارکان جماعت اپنی بیویوں کو صرف اس وجہ سے جماعت میں داخل نہ کریں کہ وہ ان کی بیویاں ہیں۔ اس تحریک کے معاملہ میں شوہرانہ قوامیت کا استعمال صحیح نہیں ہے ورنہ اس طرح بہت سی بیویاں محض اپنے شوہروں کی تابع فعل بنی ہوئی جماعت میں آجائیں گی بغیر اس کے کہ ان کے خیالات اور ان کی زندگی میں کوئی واقعی تبدیلی ہو۔ آپ اپنے گھروں میں اسی طرح تبلیغ کیجیے جس طرح باہر کرتے ہیں، اور صبر کے ساتھ مسلسل کوشش کرتے رہیے کہ آپ کی بیویاں، اور آپ کے خاندان کی دوسری خواتین کے خیالات، انداز فکر، نقطۂ نظر اور اخلاق میں وہ حقیقی تبدیلی رونما ہو جو اس جماعت کا کام کرنے کے لیے ضروری ہے۔ جس طرح ہم اس تبدیلی کے بغیر اور پختگی کا ثبوت ملے بغیر مردوں کو جماعت میں شامل نہیں کر سکتے اسی طرح عورتوں کو بھی شامل نہیں کرنا چاہیے۔

تجویز نمبر ۱۴: طاغوتی نظام اور غیر شرعی وسائل معاش سے علیحدہ ہونے والے اشخاص کی اعانت کا انتظام۔

امیر جماعت: اس میں شک نہیں کہ جو لوگ ہمارے عقیدہ و مسلک کو قبول کر کے ان وسائل معاش کو چھوڑتے ہیں جو دین کے خلاف ہیں، انھیں دوسرے مناسب تر وسائل فراہم کرنے میں جس حد تک بھی ہم مدد دے سکتے ہیں ہمیں دینی چاہیے لیکن یہ اعانت صرف شخصی طور پر ہمارے اخلاقی فرائض میں داخل ہے۔ اسے کوئی جماعتی پروگرام بنانا اور جماعت کے اوپر یہ ذمہ داری عائد کرنا کہ اس کا انتظام کرے اصولاً صحیح نہیں ہے۔ جماعت اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتی کہ لوگوں کے سامنے حق اور باطل کا فرق واضح کر دے اور ان کے اندر حرام و حلال کی تمیز پیدا کر دے۔ اس کے بعد جو لوگ حق کو حق تسلیم کریں اور باطل سے علیحدہ ہونا چاہیں اور حرام کو حرام جان کر اسے چھوڑنا اور حلال کو اختیار کرنا چاہیں، ان کا خود یہ اپنا کام ہے کہ وہ اپنے لیے جائز طریق معاش تلاش کریں اور اپنی زندگی کو ناجائز آلائشوں سے پاک کریں۔ اگر کوئی اخلاق صالحہ کی دعوت دینے والی جماعت لوگوں کو بدکاری چھوڑ کر نکاح کا مشورہ دیتی ہے تو اس کے اوپر یہ ذمہ داری عائد نہیں ہوتی کہ وہ ایک شادی ایجنسی کھولے۔ اسی طرح کوئی وجہ نہیں کہ دین حق کی دعوت دینے والی جماعت پر صرف اس لیے معیشت کے انتظام کی ذمہ داری ڈالی جائے کہ وہ لوگوں کو حرام ذرائع چھوڑنے اور حلال ذرائع اختیار کرنے کی ہدایت کرتی ہے۔ البتہ ایسی جماعت کے افراد پر یہ اخلاقی فرض ضرور عائد ہوتا ہے کہ جہاں وہ خود حرام ذرائع سے بچنے اور حلال ذرائع اپنے لیے فراہم کرنے کی سعی کرتے ہیں اس کے ساتھ دوسرے ایسے لوگوں کی مدد بھی کریں جو انہی کی طرح اس غرض کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہوں۔ جماعتی حیثیت سے جو کچھ زیادہ سے زیادہ ہم کر سکتے ہیں وہ صرف اتنا ہے کہ چھوٹی چھوٹی صنعتوں اور مختلف تجارتی کاموں کے متعلق اگر کچھ معلومات ہمارے پاس موجود ہوں تو وہ ہم ایسے لوگوں کو فراہم کر دیں جو موجودہ ناپاک نظام معاشی میں کوئی نسبتاً پاک کام کرنا چاہتے ہوں۔ اسی طرح ہم یہ بھی کر سکتے ہیں کہ مختلف ارکان جماعت جو کسی صنعتی یا تجارتی سکیم کو چلانا چاہتے ہوں وہ اگر ہمیں اپنی تجویزوں سے باخبر رکھیں تو ہم دوسرے ارکان کے ساتھ ان کا تعلق قائم کرنے کی کوشش کریں۔

تجویز نمبر ۱۵: سجادہ نشینوں اور پیروں کو اس تحریک کی طرف دعوت دینے کے لیے کوئی خاص قدم اٹھایا جائے کیونکہ ان میں سے کسی ایک شخص کی شرکت بھی کئی ہزار آدمی کی شرکت کی ہم معنی ہے۔

امیر جماعت: اس میں شک نہیں کہ ہمارے ملک میں یہ طبقہ بہت زیادہ با اثر ہے اور لاکھوں کروڑوں آدمی اس سے وابستہ ہیں لیکن اس میں بہت کم آدمی ایسے ہیں جو واقعی صاحب خیر، خدا ترس اور حق پسند ہیں۔ اکثریت اس طبقے میں ایسے لوگوں کی ہے جن سے زیادہ خدا سے پھرے ہوئے لوگ غالباً دنیا میں نہیں ملیں گے۔ انھوں نے حق کے لیے صرف اپنے ہی کان نہیں بند کر رکھے ہیں بلکہ اپنے مریدوں اور معتقدوں کے کانوں اور دلوں پر بھی مہریں لگا رکھی ہیں۔ انھیں دعوت دینے کا فائدہ یہ تو نہ ہوگا کہ وہ حق کی آواز پر لبیک کہیں گے اور اپنی نیم خدائی کو چھوڑنے پر آمادہ ہو جائیں گے البتہ اس کا یہ نتیجہ ضرور ہوگا کہ ہم بھڑوں کے چھتے میں خود پتھر پھینک پھینک کر ان کو کاٹنے پر اکسائیں گے۔ بجائے اس کے کہ آپ ان حضرات کو خطاب کریں آپ کو کوشش کرنی چاہیے کہ ان کے معتقدین کے حلقوں میں صحیح دینی خیالات پھیلائیں اور ان کی کمزوریوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی تبلیغ میں احتیاط سے کام لیں۔ ان پیروں کا طلسم تو بہر حال ٹوٹنا چاہیے، ہمارے ہاتھ سے نہ ٹوٹے گا تو اشتراکیت کے

ہاتھوں ٹوٹ کر رہے گا، مگر ہماری دعا یہ ہے کہ یہ ہمارے ہاتھ سے ٹوٹے کیونکہ اگر اشتراکیت کے ہاتھ سے یہ ٹوٹا تو ان پیریوں کے ساتھ ساتھ دین بھی ٹوٹ جائے گا۔

تجویز نمبر ۱۶: امیر جماعت ایک وفد لے کر ملک میں تبلیغی دورہ کریں۔

امیر جماعت: یہ تجویز بہت پہلے سے زیرِ غور بھی لیکن اول تو مرکز کے کاموں کا بار مجھ پر بہت زیادہ ہے پھر کچھ عرصے سے میری صحت بھی مسلسل خراب رہی ہے اس لیے اب تک اس پر عمل نہ ہو سکا۔ میں اس کا منتظر ہوں کہ مرکز کا کام اس حد تک منظم ہو جائے کہ میرے بغیر بھی چلتا رہ سکے اور میری صحت بھی کچھ درست ہو جائے تو انشاء اللہ ملک کے مختلف حصوں میں جانے کی کوشش کروں گا۔

تجویز نمبر ۱۷: عوام میں کام کرنے کے لیے مولانا محمد الیاس صاحب مرحوم کے طریقِ تبلیغ کو اختیار کیا جائے۔

امیر جماعت: اس کے متعلق میں اپنے خیالات ابتدائی تقریروں میں پیش کر چکا ہوں۔ میں مولانا مرحوم کے طریق کار کی مذمت نہیں کرنا چاہتا۔ جو لوگ ان کے طریق کار پر مطمئن ہوں وہ ان کے کارکنوں میں شامل ہو کر کام کر سکتے ہیں، اور بہر حال یہ بھی ایک کارِ خیر ہوگا۔ مگر میں اس کو صحیح نہیں سمجھتا کہ اس جماعت کے لیے کام کا جو طرز میں نے اختیار کیا ہے اس کے ساتھ دوسرے طریقوں کا جوڑ لگانے کی کوشش کی جائے۔ میں نے جس حد تک ان کے طرزِ تبلیغ سے واقفیت بہم پہنچائی ہے میں اس پر مطمئن نہیں ہوں اور جس قسم کا کلی انقلاب ہمارے پیشِ نظر ہے اس کے لیے وہ طریقہ کچھ بھی مددگار نہیں ہو سکتا۔

تجویز نمبر ۱۸: تمام علمائے ہند کو جمع کر کے ان کے سامنے یہ دعوت پیش کی جائے۔

امیر جماعت: یہ ایک خیالی تجویز ہے جسے کوئی ایسا شخص قابلِ عمل نہیں سمجھ سکتا جس کو ان معاملات کے متعلق کوئی عملی تجربہ ہو۔ آپ لوگوں میں سے کوئی شخص بطور خود یہ تجربہ کرنا چاہے تو میں اسے روکتا نہیں، لیکن میں خود اس قسم کا کوئی اقدام نہیں کر سکتا۔ یہ بات کسی نفسانیت پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں اس کو لاحاصل سمجھتا ہوں اور اس سے کسی مفید نتیجے کی مجھے توقع نہیں ہے۔ جہاں تک دعوت کے پہنچنے کا تعلق ہے مجھے یہ معلوم ہے کہ اس ملک کے علماء اور تعلیم یافتہ طبقہ کے بیشتر لوگوں تک یہ پہنچ چکی ہے۔ اگر کوئی اسے صحیح و برحق ہونے پر مطمئن ہو جائے تو وہ بغیر اس کے بھی اس پر لبیک کہہ سکتا ہے کہ کوئی اس کے پاس جا کر بالمشافہ دعوت دے۔ اہلِ حق سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ کہیں سے حق کی پکار سنتے اور یہ اطمینان ہو جانے کے بعد کہ یہ واقعی حق کی پکار ہے، صرف اس لیے اپنی جگہ بیٹھے رہیں گے کہ خاص طور سے ان کے در دولت پر حاضر ہو کر صدا نہیں لگائی گئی ہے۔

تجویز نمبر ۱۹: جماعت میں جو علماء ہیں وہ اپنے گرد و پیش کے علاقے کی مقامی جماعتوں میں دورہ کر کے انھیں زندہ رکھنے کی کوشش کریں۔

امیر جماعت: یہ فی الواقع ایک قابلِ توجہ تجویز ہے۔ جو علماء اس جماعت میں شامل ہوئے ہیں انھیں خود اپنی ذمہ داری کو محسوس کرنا چاہیے اور اپنے وقت کا کچھ حصہ اس کام کے لیے ہمیشہ نکالتے رہنا چاہیے کہ اپنے آس پاس کے علاقوں میں دورہ کر کے مقامی جماعتوں کو حرکت بھی دیتے رہیں، اور ارکان کی اخلاقی اور دینی حالت کو بھی بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کریں۔ لیکن میں اس قسم کے کام حکم سے کرانے کے بجائے رضا کارانہ کرانا چاہتا ہوں۔ بہترین خدمت وہی ہوتی ہے جو انسان اپنے

دلی جذبہ اور احساس ذمہ داری کی تحریک سے کرتا ہے۔ میری تمام تر کوشش یہی ہے کہ لوگوں کو رضا کارانہ خدمت پر اکساؤں اور ان میں اتنا احساس ذمہ داری پیدا کروں کہ وہ اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کا خود جائزہ لیں اور خود ان کو اللہ کے دین کے کام میں زیادہ سے زیادہ بہتر طریقے سے استعمال کرنے کی کوشش کریں۔

تجویز نمبر ۲۰: دعوت و تبلیغ کے کام کو بیرونِ ہند تک وسیع کرنے کی کوشش کی جائے۔

امیر جماعت: یہ چیز بھی ابتداء سے ہمارے پیش نظر تھی اور اگر جنگی موانع پیش نہ آجاتے تو اب تک اس سلسلے میں بھی ہم کچھ نہ کچھ ضرور پیش قدمی کرتے۔ سردست ہم نے دار العروبہ اسی غرض کے لیے قائم کیا ہے کہ عربی زبان میں لٹریچر تیار کریں اور اسے عربی ممالک میں پہنچانے کی کوشش کریں۔ جنگی رکاوٹیں ختم ہو جانے کے بعد ان شاء اللہ ہم عربی لٹریچر کی اشاعت کا سلسلہ شروع کر دیں گے اور عربی میں ایک ماہوار رسالہ بھی جاری کریں گے۔ پھر میرا ارادہ یہ بھی ہے کہ جب عربی میں کچھ لٹریچر تیار ہو جائے تو جماعت کا ایک وفد لے کر خود حج کو جاؤں اور وہاں مختلف ممالک کے آئے ہوئے زائرین تک اس دعوت کو پہنچانے کی کوشش کروں۔ اس طرح توقع ہے کہ ہمیں بیرونی ممالک کے کچھ اچھے آدمیوں سے شخصی تعلقات قائم کرنے کا موقع بھی مل جائے گا اور زیادہ وسیع پیمانے پر کام کرنے کی راہ کھل سکے گی۔ اس کے علاوہ ہم انگریزی کو بھی ذریعہ اشاعت بنانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں تاکہ ایک بین الاقوامی زبان ہماری دعوت کا آلہ بن سکے۔

تجویز نمبر ۲۱: جماعت کے مکتبے میں خود جماعتی لٹریچر کے علاوہ دوسرا صالح لٹریچر بھی بہم پہنچایا جائے۔

امیر جماعت: یہ تجویز دہلی کے اجتماع میں ہمارے سامنے آئی تھی اور اس وقت مولانا مسعود عالم صاحب کے سپرد یہ کام کیا گیا تھا کہ وہ اردو لٹریچر میں سے ایسی کتابوں کو چھانٹنے کی کوشش کریں جن میں صحیح دینی نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہو اور جو ہمارے مقصد کے لحاظ سے صالح لٹریچر کی تعریف میں آتی ہوں۔ اس سلسلے میں انھوں نے کافی محنت کی اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اردو زبان اس لحاظ سے بہت غریب ہے۔ ایک مدت سے صحیح دینی تصور ناپید ہے اس لیے جو بہتر سے بہتر لٹریچر بھی موجود ہے اس میں غیر محسوس طور پر ایسی چیزیں آگئی ہیں جو پڑھنے والوں کی غلط رہنمائی کرتی ہیں۔ اسی وجہ سے ہم دوسری کتابوں کی اشاعت اپنے مکتبے کے ذریعے سے کرنے میں بہت زیادہ احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ جب تک ہماری دعوت و تبلیغ کا اثر اتنا وسیع نہیں ہو جاتا کہ ملک کے اہل علم اور اہل قلم عام طور پر اس سے متاثر ہو جائیں، یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ صحیح قسم کا اسلامی لٹریچر بہم پہنچ سکے گا۔ تاہم جو ایک مختصر سی فہرست مولانا مسعود عالم صاحب نے بتائی ہے اس کے مطابق کتابیں فراہم کرنے کی ہم کوشش کریں گے۔

تجویز نمبر ۲۲: ہماری درسگاہوں کے لیے جو نصاب تیار ہو اسے جلدی سے جلدی شائع کرنے کی طرف توجہ کی جائے۔

امیر جماعت: یہ تجویز ہمارے پیش نظر ہے لیکن نصاب تیار ہونے کے بعد یہ فیصلہ کرنا کہ وہ اشاعت کے قابل کب ہو سکے گا ہماری دونوں درسگاہوں کے منتظمین، یعنی مولانا امین احسن صاحب اور غازی محمد عبد الجبار صاحب کا کام ہے۔ سردست یہ رائے قائم کی گئی ہے کہ نصاب تیار ہوتے ہی فوراً اسے شائع نہ کیا جائے بلکہ عملاً جب ہم اس کا تجربہ کر کے دیکھ لیں کہ جو نتائج ہمیں اس سے مطلوب ہیں وہ حاصل ہو رہے ہیں اس وقت اسے پبلک میں پیش کیا جائے۔

تجویز نمبر ۲۳: زیر تجویز درسگاہوں کے داخلے میں یہ شرط جو عائد کی گئی ہے کہ طلباء کے والدین ہمارے مقصد اور نقطۂ نظر

سے نہ صرف متفق ہوں بلکہ اپنے بچوں کو اس نصب العین کے لیے دیدینے کا وعدہ کریں جو ہمارے پیش نظر ہے، اسے آزاد دیا جائے اور داخلے کو عام طلبا کے لیے کھلا رکھا جائے تاکہ ایک کثیر تعداد ہماری درسگاہوں میں آسکے اور ہمیں ان کے ذہن اور اخلاق پر اثر ڈالنے کا موقع مل سکے۔

امیر جماعت: یہ شرط بہت غور و خوض کے بعد عائد کی گئی ہے اور اسے طے کرتے وقت تمام پہلوؤں پر اچھی طرح نظر ڈالی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بظاہر یہ بات بہت وزنی معلوم ہوتی ہے کہ ہر قسم کے طلباء کو ہم اپنی درسگاہ میں آنے دیں اور اپنی تعلیم و تربیت کے اثر سے ان کو اس حد تک متاثر کرلیں کہ وہ اعتقاداً و عملاً ہمارے ہی ہم مسلک ہوجائیں، لیکن اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس طریقے سے ہم کچھ زیادہ فائدہ نہ اٹھا سکیں گے اور جتنا فائدہ اٹھا سکیں گے اس کی بہ نسبت ہمیں اپنے وقت اور قوتوں کے ضیاع کا نقصان زیادہ پہنچے گا۔ آجکل عام طور پر لوگ جس غرض کے لیے اپنے بچوں کو پڑھواتے ہیں وہ صرف معاشی غرض ہوتی ہے۔ ان کو دین سے اگر کوئی دلچسپی ہوتی بھی ہے تو وہ صرف اس قدر کہ ان کے بچے نماز روزے کے بھی کچھ پابند ہوجائیں اور دینیات سے کچھ واقفیت بھی بہم پہنچالیں۔ اس سے آگے بڑھ کر وہ ایسی کسی دینداری کے متحمل ہی سے قائل ہوتے ہیں جو ان کے بچوں کی دنیا بنانے میں، خواہ وہ دنیا کیسے ہی ناپاک طریقوں سے بنا کرتی ہو، مانع ہوجائے۔ اس قسم کے لوگ اگر اپنے بچوں کو ہماری درسگاہ میں بھیجیں گے تو ان کے پیش نظر یہ ہوگا کہ یہاں ہماری محنتوں سے فائدہ اٹھا کر وہ انھیں ابتدائی چند جماعتوں تک عام مدارس سے کچھ بہتر تعلیم دلوالیں۔ اس کے بعد وہ انھیں یہاں سے نکال کر سرکاری درسگاہوں میں داخل کریں گے، امتحان دلوائیں گے اور کم یا زیادہ تنخواہوں کے عوض طاغوت کے ہاتھ بیچ ڈالیں گے۔ طلبہ کا ایک بڑا حصہ ہماری تعلیم و تربیت سے متاثر ہونے کے باوجود والدین کے دباؤ سے مجبور ہو کر اسی راہ پر چلا جائے گا اور بہت کم طالب علم شاید بمشکل پانچ فی صدی ایسے مضبوط نکلیں گے کہ ہمارے نصب العین کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیں اور والدین کے دباؤ کو قبول کرکے کسی غلط راہ پر نہ جائیں۔ سوال یہ ہے کہ ان پانچ فیصدی کو حاصل کرنے کی خاطر ہم ایسے پچانوے فیصدی لڑکوں پر اپنی قوت اور اپنی محنت کیوں صرف کریں جو دین کے کام نہیں بلکہ طاغوت کے کام آنے کے لیے پرورش کیے جا رہے ہوں۔ پھر عملاً جس جس طریقے سے ان پچانوے فی صدی طلبہ کو راہ راست سے ہٹانے کی کوششیں کی جائیں گی، جس طرح ان پر دباؤ ڈالے جائیں گے، ان کو گھر سے نکالنے اور ان کے خرچ بند کرنے کی دھمکیاں دی جائیں گی، خود ان کے اپنے بھائی بند اور ان کے والدین جس طرح انھیں تنگ کریں گے اور ستائیں گے، اور پھر اچھے اچھے نیک طبع اور بلند ارادے رکھنے والے طلبا بالآخر جس طرح شکست کھا کھا کر پسپا ہوں گے اور اپنے پاکیزہ ارادوں کو طلاق دیں گے، اس کا بہت برا اثر دوسرے طلباء پر پڑے گا اور ان مسلسل پسپائیوں کی بری مثالیں دوسرے طلبا کی اخلاقی قوت کو بھی کمزور کردیں گی۔ پس ہم اپنی درسگاہ کو اور اس کے ماحول کو اس دائمی خطرے میں مبتلا نہیں رکھنا چاہتے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ابتدا ہی سے صرف وہ لوگ اپنے بچوں کو ہمارے ہاں بھیجیں جنھیں معلوم ہو کہ ہم کس غرض کے لیے ان لڑکوں کو تیار کرنا چاہتے ہیں اور جو خود بھی اسی غرض کے لیے ان کو تیار کرانا چاہتے ہوں۔ ایسے لوگوں کے بچے خواہ وہ کتنی ہی کم تعداد میں کیوں نہ ہوں پوری طرح ہمارے مطلب کے ہوں گے اور ہمارے مقصد کے لیے زیادہ مفید ثابت ہوں گے۔ ممکن ہے کہ اس طرح ہمیں طلبا کی کوئی بہت بڑی تعداد نہ مل سکے، لیکن ہمیں اس کی پروا

نہیں ہے۔ اگر پانچ ایکڑ زمین آپ کو ایسی ملے جو پورے اطمینان کے ساتھ آپ کی ہو تو اس میں کاشت کرنا اس سے زیادہ بہتر ہے کہ ہزاروں ایکڑ زمین آپ کو ملے مگر ہر وقت اندیشہ ہو کہ اس کا بہت بڑا حصہ آپ کی تیار کی ہوئی ہری بھری فصل سمیت آپ سے چھین لیا جائے گا۔ لیکن یہ گمان نہ کرنا چاہیے کہ ہندوستان میں اس غرض کے لیے اپنے بچوں کو دینے والے بہت کم ہوں گے، اتنے کم کہ کوئی درسگاہ ان سے نہ چلائی جا سکے گی۔ میرا اندازہ ہے کہ اس گئی گذری حالت میں بھی اس ملک میں ایسے لوگ کافی تعداد میں موجود ہیں جو اپنے بچوں کو خدا کے لیے وقف کرنے پر تیار ہوں گے اور اس کی پروا نہ کریں گے کہ ان بچوں کی دنیا بنے گی یا نہیں۔

ہماری اس شرط سے ایسے طلبا مستثنیٰ ہوں گے جو دین کے معاملہ میں اپنے والدین سے بغاوت کر کے آئیں اور اپنی عاقبت کو والدین کی مرضی کے مطابق خراب کرنے پر تیار نہ ہوں۔ صرف یہی ایک معاملہ ایسا ہے جس میں والدین سے بغاوت کرنا جائز ہی نہیں، بعض اوقات فرض ہو جاتا ہے۔ اور ایسے طلبا پر ہم یہ لازم نہ کریں گے کہ وہ اپنے والدین کی رضامندی حاصل کر کے آئیں۔

تجویز نمبر ۲۴: ترجمان القرآن اور کوثر کو ہر رکن لازماً خریدے۔

امیر جماعت: شاید یہ بات آپ کے پیش نظر نہیں ہے کہ آپ ہندوستان میں رہتے ہیں جہاں کی اخلاقی حالت یہ ہے کہ انتہائی بے غرضانہ کام کرنے کے بعد بھی کوئی شخص غرض مندی کے الزامات اور بدگمانیوں سے معاف نہیں رکھا جاتا۔ اس وقت تک جس احتیاط کے ساتھ ہم کام کرتے رہے ہیں اس کے باوجود ہم کو کتب فروش اور تاجر کے الفاظ سے اکثر نوازا جاتا رہتا ہے محض اس لیے کہ کتابیں تو بہرحال ہمارے بک ڈپو میں بکتی ہی ہیں۔ اب کیا آپ ان الزامات کو واقعی ہم پر چسپاں ہی کر دینا چاہتے ہیں؟ براہ کرم اس قسم کی تجویزیں نہ زبان پر لائیے نہ دل میں سوچیے۔ ترجمان القرآن اور کوثر دونوں کے معاملے میں جماعت کے لوگوں کو بالکل آزادی رہنی چاہیے کہ چاہیں ان کو خریدیں یا نہ خریدیں۔ خریداری کو لازماً کر دینے کی کوئی وجہ نہیں۔ البتہ جماعت کے کاموں سے اور جماعتی افکار سے باخبر رہنے کے لیے ان کا مطالعہ ضروری ہے، مگر اس کے لیے کسی خریدار سے لے کر پڑھ لینا بھی کافی ہو سکتا ہے۔

تجویز نمبر ۲۵: ہر رکن اپنی زکوٰۃ بیت المال ہی میں داخل کیا کرے۔

امیر جماعت: اس کے متعلق میں رپورٹوں پر تبصرے کے سلسلے میں ہدایات دے چکا ہوں اور مجھے امید ہے کہ اب اس سلسلے میں احکام کی پوری پابندی کی جائے گی۔

تجویز نمبر ۲۶: ہر رکن اپنی آمد و خرچ کا حساب اپنی مقامی جماعت کے امیر کے سامنے پیش کیا کرے۔

امیر جماعت: یہ مطالبہ ہم از روئے شرع اپنے ارکان سے نہیں کر سکتے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں کیا ہے۔

تجویز نمبر ۲۷: ہر رکن یومیہ چار آنے بیت المال کے لیے بچائے۔

امیر جماعت: چونکہ از روئے شریعت ہمیں ایسی پابندیاں عائد کرنے کا حق نہیں ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں زکوٰۃ اور صدقات واجبہ کے سوا کسی قسم کے انفاق کو لازم نہیں کیا گیا ہے، اس لیے ہم بھی ایسی کوئی پابندی اپنی جماعت میں عائد نہیں کر سکتے۔ درحقیقت انفاق فی سبیل اللہ کا اصل فائدہ ہی ضائع ہو جاتا ہے اگر اسے لازم کر دیا جائے۔ جس حد تک اجتماعی ضروریات کے لیے ناگزیر تھا، اللہ تعالیٰ نے ہر صاحب استطاعت آدمی پر خود ہی انفاق لازم کر دیا۔ اس کے بعد یہ بات ہر شخص کے

تعلق باللہ اور اس کی طلب خیرات و حسنات اور دین حق کے ساتھ اس کے قلبی لگاؤ پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ جتنا وہ قوی ہو اتنا ہی زیادہ آدمی اپنے دلی جذبے سے انفاق کرے، جتنا وہ کمزور ہو اسی قدر اس سے انفاق کا بھی کم ظہور ہو۔ یہ بات اس شریعت کے اصول میں سے ہے کہ بہت کم نیکیوں کا مطالبہ از روئے قانون آدمی سے کیا گیا ہے اور بہت زیادہ نیکیاں قانونی مطالبے کی حدود سے باہر رکھی گئی ہیں تاکہ انسان رضاکارانہ طریق پر انھیں اختیار کرے۔ دنیا میں انسان کی اخلاقی اور روحانی ترقی اور آخرت میں اللہ کے ہاں اس کی مقبولیت کا تو سارا انحصار ہی رضاکارانہ نیکی پر ہے۔ اس نکتے کو اگر آپ لوگ ذہن نشین رکھیں تو ایسی تجویزیں سوچنے کے بجائے اپنی توجہ خود اپنے اندر بھی اور اپنے رفقا کے اندر بھی اس جذبے کو ابھارنے اور نشوونما دینے پر صرف کریں گے جس کی تحریک سے انسان خدا کے لیے اور اس کے دین کے لیے اپنے وقت، مال اور قوتوں کی قربانی کیا کرتا ہے۔

تجویز نمبر ۲۸: جماعت میں جو لوگ اہل ہنر ہیں وہ اپنے دوسرے رفقا کو ہنر سکھائیں اور جو ذی استطاعت ارکان ہیں وہ غریب ارکان کو اپنے ہاں ملازم رکھیں۔

امیر جماعت: اس قسم کی چیزوں کو مستقل تجاویز بنانے سے ہمیں خطرہ یہ ہے کہ ہم اپنے اصل نصب العین اور اس کی جدوجہد سے ہٹ کر چھوٹی چھوٹی چیزوں میں لگ جائیں گے اور یہ چیزیں ہمارا اصل پروگرام بنتی چلی جائیں گی۔ اس لیے بجائے اس کے ایسی تجویزوں کو اجتماعات میں لایا جائے اس امر کی کوشش ہونی چاہیے کہ ارکان جماعت میں خود یہ اسپرٹ پیدا ہو جائے کہ جو شخص جس جس طرح اپنے بھائیوں کے کام آسکتا ہو اس میں ذرہ برابر دریغ نہ کرے۔

تجویز نمبر ۲۹: لٹریچر کی اشاعت کے لیے اخبارات و رسائل میں اشتہارات دیا جائے اور ملک میں جو مختلف سیاسی و مذہبی جماعتوں کے اجتماعات ہوتے ہیں ان میں اپنی کتابوں کے سٹال لگائے جائیں۔

امیر جماعت: اشتہارات کے متعلق ہمارا تجربہ یہ ہے کہ جس اخبار یا رسالے نے اپنے مخصوص طرز خیال کا ایک حلقہ پیدا کر لیا ہے اس کے حلقہ اشاعت میں انہی چیزوں کی مانگ پیدا ہو سکتی ہے جو اس کے طرز خیال سے کچھ نہ کچھ مناسبت رکھتی ہوں۔ اگر ہم اپنی مطبوعات کا اشتہار ایسے اخبارات اور رسائل میں دیں جو پبلک کے ذہن سے کسی اور ہی طرح کا اپیل کر رہے ہوں تو ان کے حلقوں میں سے اتنی مانگ آنے کی امید نہیں ہے جس سے اشتہار کا خرچ بھی نکل سکے۔ اس لیے ہم کو صبر کے ساتھ اپنی ہی کوشش سے اپنے حلقۂ اشاعت کو وسیع کرنے پر اکتفا کرنا چاہیے۔ ہمارا لٹریچر اللہ کے فضل سے خود اپنی جگہ پیدا کر رہا ہے اور اپنی ذاتی کشش سے روز بروز زیادہ آدمیوں کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ اس کے ساتھ اگر ہمارے ارکان اور ہمارے خیالات سے دلچسپی اور ہمدردی رکھنے والے لوگ بھی مسلسل سعی کرتے رہیں تو ان شاء اللہ ہمیں اشتہار کی ضرورت کبھی محسوس نہ ہوگی۔

کانفرنسوں میں اسٹال لگانے کے لیے زیادہ مناسب یہ ہے کہ جس علاقے میں کوئی کانفرنس منعقد ہو رہی ہو اسی حلقے یا اس کے قریب کے حلقے کی کوئی مقامی جماعت وہاں اسٹال لگا لیا کرے۔ مرکزی مکتبے کے وقار سے یہ بات فروتر ہے کہ یہاں سے ہمارے آدمی ہر جلسے میں کتابیں لے کر پہنچ جایا کریں۔

تجویز نمبر ۳۰: ترجمان القرآن کے وہ بہت سے سابق مضامین جو ابھی تک کتابی شکل میں شائع نہیں ہوئے ہیں ان کی اشاعت کی طرف توجہ کی جائے۔ نیز اب تک جو اعتراضات اور سوالات اس تحریک پر کیے گئے ہیں اور ان کے جو جوابات

ترجمان القرآن میں دیے جاتے رہے ہیں، ان کو بھی یکجا کرکے شائع کر دیا جائے۔

امیر جماعت: تجویز کے حصہ اول کے متعلق یہ گذارش ہے کہ اگر جنگی حالات کی وجہ سے اشاعت کی راہ میں مشکلات نہ پیدا ہوجاتیں تو یہ کام بہت پہلے ہوچکا ہوتا۔ ہم منتظر ہیں کہ کاغذ پر سے پابندیاں کچھ کم ہوجائیں تو جلدی سے جلدی وہ تمام چیزیں شائع کر دی جائیں جو اس وقت تک رُکی ہوئی ہیں۔

دوسرے حصے کے متعلق میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ بہت دنوں سے مجھے خود اس کی ضرورت کا احساس ہے، مگر کارکنوں کی کمی کی وجہ سے مطلوبہ مجموعہ مرتب نہیں کیا جاسکا۔ اگر کوئی صاحب ہمت کرکے پچھلے چار پانچ سال کے رسالوں میں سے اعتراضات و جوابات کو چھانٹ لیں اور انھیں یکجا نقل کرکے میرے پاس بھیج دیں تو اس کو ترتیب دینا میرے لیے آسان ہوجائے گا اور میں کوشش کروں گا کہ اب تک جو اعتراضات مجھ تک زبانی پہنچے ہیں اور ان کے جو جوابات میں نے دیے ہیں انھیں بھی قلمبند کردوں۔ توقع ہے کہ یہ چیز ہماری تحریک کے لیے بہت مفید ثابت ہوگی۔

تجویز نمبر ۳۱: تفہیم القرآن کی الگ الگ سورتوں کو رسالوں کی شکل میں شائع کر دیا جائے۔

امیر جماعت: اس وقت تک رسالے میں تفہیم القرآن کے جو حصے شائع کیے جاتے رہے ہیں وہ صرف اہل علم سے مشورے کے لیے ہیں۔ جب تک میں نظر ثانی کرکے یہ اطمینان نہ کرلوں کہ وہ کتابی شکل میں شائع کرنے کے قابل ہے اس وقت تک اس کا کوئی حصہ اشاعت عام کے لیے نہ پیش کیا جائے گا۔ سردست اگر اس سے کوئی فائدہ اٹھانا چاہے تو ترجمان القرآن میں شائع شدہ صفحات پر قناعت کرے۔

تجویز نمبر ۳۲: علوم اسلامیہ کی تدوین جدید اور ممالک اسلامیہ کے حالات کے مطابق اسلامی لٹریچر کی تیاری۔

امیر جماعت: تجویز کا حصہ اول ہماری اس اسکیم میں شامل ہے جو ایک اکیڈیمی کے قیام کے متعلق ہمارے پیش نظر ہے۔ حصہ دوم کو کسی حد تک ہمارا دارالعروبہ انشاء اللہ عمل میں لائے گا، لیکن یہ بہت مشکل ہے کہ ہم باہر کے مختلف ملکوں کی سیاسی، تمدنی، اخلاقی اور ذہنی حالت کو پیش نظر رکھ کر ہر ایک کے لیے الگ الگ لٹریچر تیار کریں۔ دنیا میں جتنی بھی عالمگیر تحریکیں اٹھتی ہیں، ہر ایک کی ابتدا کسی ایک علاقے سے ہوتی ہے اور آغاز میں اسی علاقے کے حالات کو سامنے رکھ کر ان اصولوں کو تنقید و تشریح اور عملی انطباق کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے جن پر وہ تحریک مبنی ہوتی ہے۔ پھر جب دوسرے ملکوں تک اس تحریک کے اثرات پہنچتے ہیں اور مقامی لوگ ان سے متاثر ہوتے ہیں تو وہ خود ہی اپنے اپنے علاقوں کے حالات کی مناسبت سے لٹریچر تیار کرنے لگتے ہیں۔ خود قرآن مجید میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ اس لیے بجائے اس کے کہ ہم بیرونی ممالک کے لیے ان کے حالات کے لحاظ سے الگ الگ لٹریچر تیار کریں یہ زیادہ مناسب اور زیادہ قابل عمل ہے کہ ہمارے مرکز سے اسی ملک کے حالات کو جنھیں ہم زیادہ بہتر جانتے ہیں ملحوظ رکھتے ہوئے لٹریچر تیار ہو اور اسی کو دوسری زبانوں میں منتقل کر دیا جائے۔

تجویز نمبر ۳۳: ارکان کو فروعی بحثوں سے بچنے اور جزئیات کے غیر معتدل اہتمام سے اجتناب کرنے کی ہدایات دی جائیں۔

امیر جماعت: یہ کام قیام جماعت کی ابتدا سے کیا جارہا ہے۔ خود دستور میں اس کے متعلق ہدایات موجود ہیں اور میں ہمیشہ اپنی تقریروں اور تحریروں میں اس پر زور دیتا رہتا ہوں لیکن باقاعدہ احکام دے کر اس چیز کو روکنے سے فائدے کی نسبت

نقصان کا زیادہ اندیشہ ہے۔ جوں جوں لوگوں کی ذہنیت بدلتی جائے گی اور ان کا پرانا اندازِ فکر نئے اندازِ فکر کے لیے جگہ چھوڑتا جائے گا یہ مرض آپ سے آپ بتدریج کم ہوتا چلا جائے گا۔

تجویز ۳۴: دستور کی دفعہ ۸ پر سختی سے عمل ہونا چاہیے اور اس کی خلاف ورزی کرنے والے رکن کو جماعت سے خارج کر دینا چاہیے۔

امیر جماعت: اس پر ابتدائے قیام جماعت سے عمل ہو رہا ہے۔ بیچ کے دور میں اگر اس معاملے میں کچھ ڈھیل رہی بھی ہے تو وہ صرف شعبۂ تنظیم کے نہ ہونے کی وجہ سے رہی ہے کیونکہ ہمارے پاس ارکان کی اخلاقی اور عملی حالت جانچنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ لیکن اب تنظیمی کام باقاعدہ شروع ہو جانے کے بعد سے ہم دستور کو پوری قوت سے نافذ کر رہے ہیں اور جو چیزیں دستور میں لازم نہیں ان کے معاملے میں کسی کے ساتھ رعایت نہیں کرتے۔ مقامی جماعتوں کے امراء کو بھی اس معاملے میں ہمارے ساتھ پورا تعاون کرنا چاہیے تاکہ جماعت کے نظام میں کوئی کمزوری نہ رہنے پائے۔

تجویز ۳۵: ہر مقامی جماعت اپنے شہر کے طلبہ اور عوام کو ہر ماہ ایک بار ضرور مخاطب کرے۔

امیر جماعت: یہ تجویز اگرچہ مفید ضرور ہے لیکن سردست ہم اس کو اس لیے منظور نہیں کر سکتے کہ متعدد مقامات پر ہماری جماعتوں میں ایسے کارکن موجود نہیں ہیں جن پر عام خطاب کی ذمہ داری ڈالی جا سکے۔ جہاں ایسے ارکان موجود ہوں وہاں کے مقامی امیروں کو اس طرف توجہ کرنی چاہیے۔ لیکن عمل شروع کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ جن لوگوں کو وہ عام خطاب کے لیے موزوں پاتے ہوں ان کی اہلیت کا خود بھی پوری طرح امتحان کر لیں اور ہمیں بھی ان کے متعلق ضروری معلومات بہم پہنچا کر یہ اطمینان دلا دیں کہ خطاب عام کی ذمہ داری ان پر ڈالنے سے جماعت کی غلط نمائندگی تو نہ ہوگی۔

ان تجاویز کا سلسلہ ساتویں اجلاس تک چلتا رہا۔ اس کے بعد امیر جماعت نے مولانا امین احسن صاحب کو جماعت سے خطاب کرنے کے لیے کہا۔

اجلاس ہفتم

(بتاریخ ایضاً بعد نماز ظہر)

مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کی تقریر

حاضرین!

آپ کے اس اجتماع میں میرا فرض ایک ناخوشگوار فرض ہے۔ مجھے آپ کی پیش کی ہوئی رپورٹوں پر تبصرہ کرنا، ان کی خامیوں پر متنبہ کرنا اور آئندہ کے لیے آپ کو آپ کی غلطیوں سے ہوشیار کرنا ہے۔ مجھے ان رپورٹوں کے اچھے اور مفید پہلوؤں کو نظر انداز کرنا ہے اور صرف عیوب پر نظر ڈالنی ہے۔ یہ عیب چینی ممکن ہے آپ میں سے بہتوں کو ناگوار گذرے لیکن مجھے بہرحال یہی فرض ادا کرنا ہے۔ اگرچہ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ امیر جماعت نے مناسب مواقع پر آپ کے کاموں پر تبصرہ بھی کر دیا ہے اور آپ کو ضروری ہدایات بھی دے دی ہیں جس سے میرا کام ایک حد تک ہلکا ہو گیا ہے تاہم بعض باتوں کی طرف مجھے بھی آپ کو متوجہ کرنا ہے۔

رپورٹوں کی ترتیب میں سب سے پہلے آپ کو رپورٹوں کی ترتیب کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ رپورٹوں میں غیر متعلق باتیں بالکل نہیں ہونی چاہئیں۔ ان کو مرتب کرتے وقت اس امر کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ ان سے مقصود صرف یہ معلوم کرنا ہوتا ہے کہ آپ کس مقام پر ہیں، وہاں کے حالات کیا ہیں، جماعت کے مقاصد کے پھیلنے کے امکانات وہاں کس حد تک ہیں، اب تک آپ نے کیا کیا ہے، آئندہ کیا کر سکنے کی توقع ہے، آپکے رفقاء کا کیا حال ہے، ہمدردوں کی ہمدردی کی نوعیت کیا ہے، اور مزاحمتیں اور رکاوٹیں وغیرہ کس درجہ اور کس قسم کی ہیں۔ یہ اور اس طرح کے ضروری سوالات ہیں جن پر آپ کی ساری توجہ مرکوز ہونی چاہیے۔ اسی طرح کی باتیں مرکز بھی آپ سے معلوم کرنا چاہتا ہے اور یہی باتیں ہیں جن کے جماعت کے ارکین بھی جاننے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ غیر متعلق باتیں جو آپ اپنی رپورٹوں میں لکھتے ہیں ان سے وقت بھی ضائع ہوتا ہے، اور بہت سے مفید مصالح کا نقصان بھی ہوتا ہے۔ بالخصوص ذاتی حالات اور افراد و اشخاص کی مدحت و منقصت کا تو کوئی شائبہ بھی ان رپورٹوں میں نہیں ہونا چاہیے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس طرح کی رپورٹ مرتب کرنا جو تمام ضروری باتوں پر حاوی اور ساری غیر ضروری باتوں سے خالی ہو کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ بڑی مہارت کا کام ہے لیکن اگر آپ میں صرف کار آمد باتوں کا اہتمام پیدا ہو جائے اور دل خود ستائی کی خواہش، اور دوسروں کی تحقیر کے جذبہ اور مبالغہ اور آرائشِ بیان سے خالی ہو جائے تو آپ کا کام بھی نہایت سہل ہو جائے گا اور ان رپورٹوں سے ہمارا جو اصل مقصود ہے وہ بھی بہتر طریق پر حاصل ہو سکے گا۔

اعترافِ تقصیر کا فتنہ ایک خاص چیز جو میں نے آپ کی رپورٹوں میں اس مرتبہ محسوس کی ہے وہ یہ ہے کہ آپ پر اعترافِ تقصیر بہت غالب ہوتا جاتا ہے۔ ایک آدمی اگر سچائی کے ساتھ اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کر رہا ہے تو یہ ایک مستحسن عادت ہے لیکن اس کا ایک پہلو خطرناک بھی ہے جس سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ اس سے ایک اندیشہ تو یہ ہے کہ مبادا یہ چیز آپ کی عادت بن جائے اور اس کے نیچے ادائے فرض کا شعور دب کے رہ جائے اور دوسرا اندیشہ یہ ہے کہ اس سے بسا اوقات آدمی میں منکسرانہ کبر پیدا ہو جاتا ہے جس کا پیدا ہونا ایک سخت و شدید فتنہ ہے اور ہماری دلی آرزو ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے ہر مسلمان کو محفوظ رکھے۔ ایک آدمی اگر ایک امر کو حق سمجھ گیا ہے تو اس کا فرض ہے کہ اس حق کے لیے ہر طرح کی زحمتیں اٹھائے اور ساری صعوبتیں جھیلے۔ جو شخص حق کو پامال ہوتے دیکھتا ہے اور اس کے لیے اس کے دل میں حمیت نہیں پیدا ہوتی وہ دو حالتوں سے خالی نہیں یا تو اس پر حق کی اصلی قدر و قیمت واضح نہیں ہوئی ہے، اور یہ علم و معرفت کی خامی ہے یا اس کے اندر باطل کا رعب بیٹھا ہوا ہے اور یہ دل کا فساد ہے۔ ایک عاقل اور سلیم الطبع انسان سے سب سے پہلے جس بات کی توقع ہونی چاہیے وہ یہی ہے کہ وہ کبھی کسی حق کو مظلوم اور پامال دیکھنے پر راضی نہ ہو۔ جو شخص حق کی مظلومیت پر راضی ہے وہ انسانیت کے جوہر سے خالی ہے اور جو شخص انسانیت کے جوہر سے خالی ہے افسوس ہے اگر وہ پیدا ہوا اور اس سے بڑھ کر افسوس اس بات کا ہے کہ وہ زندہ ہے۔ اگر آدمی میں علم کی کمی ہے تو اس کا فرض ہے کہ اللہ کی کتاب کے ذریعہ سے اپنے علم کو بڑھائے اور اگر ہمت کی کمی ہے تو چاہیے کہ اللہ سے دعا کرے کہ خدا اس کو توفیقِ عمل دے اور پست ہمتی اور بزدلی کی بیماریوں سے نجات بخشے۔

جماعتِ اسلامی کا قیام بالکل بے سود ہوگا اگر اس کے بعد بھی ہمارا علم صحیح نہ ہو، اور ہمارے دلوں میں بزدلی کا شیطان بیٹھا ہی رہے اور ہم محض اعترافِ تقصیر کے پردہ میں اپنی کمزوریوں کو چھپاتے رہیں۔ ہم جو لٹریچر شائع کر رہے ہیں اس کا مقصود یہی ہے کہ

لوگوں پر حق واضح ہو اور جماعتی زندگی کا نظام اسی لیے اختیار کیا ہے کہ ایک کی مضبوطی دوسرے کی کمزوری کا ازالہ کرنے میں معین ہو اور باہمی تعاون سے وہ سرگرمی اور جدوجہد وجود میں آسکے جو اس وقت حق کی خدمت کے لیے مطلوب ہے۔ اب یہ آپ کا کام ہے کہ آپ میں طلب علم کی رغبت پیدا ہو اور جماعتی زندگی کی برکتیں حاصل کرنے کی کوشش کریں لیکن ہم کو سخت حیرت ہوتی ہے کہ لوگ خود اپنی ذمہ داریوں کی نسبت بھی یہی خواہش رکھتے ہیں کہ مرکز ہی ان کو بھی پورا کرے۔ لٹریچر شائع کرکے لوگوں میں علم پیدا کرے اور پھر ہاتھ پاؤں بن کر ان کے ذمہ کے عمل کو بھی پورا کرے۔ جو لوگ اس طرح کی خواہشیں اپنے دل کے اندر رکھتے ہیں ان کو اس امر سے آگاہ ہونا چاہیے کہ جو کام ان کے کرنے کے ہیں انہی کو کرنے ہوں گے۔ اور وہ کام صرف تمنائیں کرنے سے نہیں بلکہ کرنے سے پورے ہوں گے۔ ہم کو کوئی ایسا افسوں نہیں معلوم ہے جو ہم یہاں سے بیٹھے بیٹھے پھونک دیں اور سارے کام بن جائیں۔ ہم حق کو واضح کرسکتے ہیں اور اس کی خدمت کے لیے اپنا حصہ پورا کرسکتے ہیں، لیکن دوسروں کے اندر اس کے لیے ہمت پیدا کرنا ہمارے اختیار سے باہر ہے۔

بعض لوگوں کے اندر یہ خواہش بھی پائی جاتی ہے کہ جماعت کے کاموں کی رفتار تیز کرنے کے لیے کسی تیز رو جماعت کے ساتھ تعاون کرلیا جائے اگرچہ اس کی تیز روی کسی سمت میں ہو۔ جن لوگوں کے دماغوں میں اس طرح کی باتیں آتی ہیں وہ لوگ ابھی جماعت اسلامی کے مزاج سے بہت دور ہیں ان کو چاہیے کہ وہ جماعت کے لٹریچر کا اچھی طرح مطالعہ کریں تاکہ ان کے دماغ کی الجھنیں دور ہوں۔ ہم کو صرف تیز روی مطلوب نہیں ہے بلکہ صحیح سمت میں تیز روی مطلوب ہے۔ کسی غلط سمت میں تیز روی سے ہمارے نزدیک یہ بہتر ہے کہ آدمی صحیح سمت کی طرف رخ کرکے کھڑا رہے۔ جو شخص کسی غلط راہ پر تیزی کے ساتھ بھاگا جارہا ہے اس کی حالت پر رشک کرنا حماقت اور اس کو لائق تقلید جاننا ہلاکت ہے۔ جن لوگوں کے دماغوں میں اس طرح کے خیالات گزرتے ہیں ان کے لیے جماعت اسلامی میں داخل ہونے سے زیادہ بہتر یہ تھا کہ ابھی وہ تیز رو جماعتوں کی تیز روی کا کچھ دنوں اور تجربہ کرتے۔ اس کے بعد اگر وہ ہمارے ساتھ آتے تو شاید ہمارے لیے زیادہ زحمت کا سبب نہ بنتے۔

مخالفتوں کا خیر مقدم یہ نہایت خوشی کی بات ہے کہ ہمارے ارکان میں مخالفتوں سے جو مرعوبیت تھی وہ بہت کم ہو رہی ہے۔ اب لوگوں میں مزاحمتوں کا مقابلہ کرکے آگے بڑھنے کی ہمت پیدا ہو رہی ہے۔ یہ جماعتی زندگی کی برکت ہے اور اس برکت کا ظاہر ہونا اس بات کی شہادت ہے کہ ہماری جماعتی زندگی کا ارتقاء صحیح رخ پر ہو رہا ہے۔ لیکن یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہم جس راہ پر چلنے کے لیے اٹھے ہیں اس راہ میں صرف یہ کافی نہیں ہے کہ مخالفتوں سے مرعوبیت کم ہوجائے یہ تو اس راہ کا پہلا مطالبہ ہے۔ اس کے بغیر تو آپ اس راستہ میں ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتے۔ اس راہ کا اصل مطالبہ اس سے بہت زیادہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم میں مخالفتوں کے خیر مقدم کا جذبہ پیدا ہوجائے۔ حق کا راستہ ہو یا باطل کا، اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ جو شخص جس راہ کو اختیار کرتا ہے اس راہ میں اس کی آزمائش ہوتی ہے اور راہ حق کا تو امتیازی نشان ہی یہی ہے کہ وہ شروع سے آخر تک آزمائشوں سے بھری ہوتی ہے۔ جس طرح ریاضی کا ایک ذہین طالب علم کسی مشکل سوال سے خوش ہوتا ہے کہ اس کو اپنی جودت طبع کے آزمانے کا ایک اور موقع ہاتھ آیا اسی طرح ایک صادق العزم مومن کو کسی نئی آزمائش سے مقابلہ کرکے خوشی ہوتی ہے کہ اس کو حق کے ساتھ اپنی وفاداری کے ثبوت دینے کا ایک اور موقع بہم پہنچا۔ ٹمٹماتے ہوئے دیے بے شک ہوا کے جھونکوں سے گل ہوجاتے ہیں لیکن بھڑکتے ہوئے تنور کو ہواؤں کے جھونکے اور زیادہ بھڑکا دیتے ہیں۔ اب اپنے اندر یہ صلاحیت پیدا کیجیے کہ جس طرح ایک بھڑکتا ہوا تنور گیلی لکڑیوں سے بجھنے کے بجائے ان کو اپنی غذا

بنالیتا ہے اسی طرح آپ مخالفتوں سے دبنے کے بجائے ان سے غذا اور قوت حاصل کریں۔ جب تک ہم میں یہ قابلیت نہ پیدا ہو جائے امید نہیں کہ ہم خدا کے دین کی کوئی اچھی خدمت کرسکیں۔

آپ نے جن مخالفتوں کا ذکر کیا ہے وہ مختلف قسم کی ہیں لیکن ان میں سے ڈرنے کی چیز ایک بھی نہیں۔ دنیا میں حق کی خدمت کے لیے جو جدوجہد بھی کبھی ظہور میں آئی ہے اس کے ساتھ یہ مخالفتیں بھی آپ سے آپ پیدا ہوئی ہیں اور قرآن نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ ان کا پیدا ہونا عین حکمت الٰہی کے مطابق ہے۔ یہی مومن صادق اور بوالہوس کے درمیان امتیاز کی کسوٹی ہیں اور انہی سے پیرووں کے اندر انسان کے اختیار کی آزمائش ہوتی ہے۔ پس ان مخالفتوں سے ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں ہے البتہ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرنی چاہیے کہ وہ ہر مرحلہ میں ہمیں ثابت قدم رکھے اور ہمارے عزم و ایمان کی محافظت فرمائے۔

ایک سوال کا جواب جماعت کے ارکان میں ایک عام سوال یہ بھی پایا جاتا ہے کہ جب جماعت اسلامی کی دعوت تمام تر اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کی طرف ہے ، خود ہے بالکل سرتاسر کتاب وسنت کی پیروی ہی کی دعوت ہے اور مخالفین بھی باوجود انتہائی سعی کے اب تک اس کی کوئی بات کتاب وسنت کے خلاف نہیں ثابت کرسکے ہیں تو آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ مسلمان اس کو قبول کرنے میں اتنی دیر لگا رہے ہیں۔ یہ سوال ہم میں سے بہتوں کو حیرانی میں ڈالے ہوئے ہے اور بسا اوقات دوسروں کی اس بے پروائی کی وجہ سے ہم میں سے بعضوں کی نظر میں وہ حق بے وقعت ہو جاتا ہے جو خود ان پر منکشف ہو چکا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس سوال پر غور کیا جائے۔ ہم نے جہاں تک غور کیا ہے اس خالص دینی دعوت سے مسلمانوں کی بے پروائی کے اسباب نہایت گہرے ہیں۔ مسلمان اپنی موجودہ حالت تک ایک دو دن میں نہیں پہنچے ہیں۔ ان کو درجہ بدرجہ اس حالت تک لایا گیا ہے اور ہر منزل میں ان کو از روئے کتاب وسنت یہ اطمینان دلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہی حالت آج اسلام و ایمان کا تقاضا ہے۔ ان کے حق سے انحراف پر ایک طویل زمانہ گذر چکا ہے اور اس غلط راہ کے ہر موڑ پر انھوں نے دوتوں یہ سمجھ کر قیام کیا ہے کہ یہ عین دین و شریعت کی صراط مستقیم ہے اور ان کی اس غلط فہمی کے راسخ کرنے میں ارباب دین نے حصہ لیا ہے اور اس بے راہ روی کے نہ صرف جواز بلکہ استحسان پر ضخیم فقہی اور کلامی تصنیفات مرتب کر دی گئی ہیں یہاں تک کہ ان کو یقین ہے کہ ان کا جو قدم بھی اٹھا ہے وہ شریعت کے دائرہ کے اندر اٹھا ہے اور آج بھی جہاں وہ ہیں شریعت ہی کا ایک مقام ہے اس سے الگ نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ جس جماعت کو اس طرح درجہ بدرجہ گرایا گیا ہو جس کا گرنا اس طرح مخفی ہو، جس کے زوال کی تاریخ اتنی لمبی ہو جس کو یہ یقین دلایا گیا ہو کہ اس کا یہ گرنا گرنا نہیں بلکہ اچھلنا ہے، جو اس غلط فہمی میں ہو کہ وہ اپنی موجودہ حالت میں بھی شریعت سے الگ نہیں بلکہ عین شریعت کے مطابق ہے وہ آپ کی دعوت کو کس طرح آسانی کے ساتھ قبول کرسکتی ہے جو ان سے کسی جزئی ترمیم و اصلاح کا مطالبہ نہیں کرتی بلکہ ان سے سچی توبہ اور کامل اصلاح کا مطالبہ کرتی ہے۔ جب آپ ان سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ یایھا الذین آمنوا آمنوا اے وہ لوگو جو ایمان کے مدعی ہو حقیقی ایمان لاؤ، اور ان کے اعمال سے لے کر ان کے عقائد تک میں رخنے بتاتے ہیں تو قدرتی طور پر ان کو اس بات سے چوٹ لگتی ہے اور ان کی دینداری کا دیرینہ پندار اس سے مجروح ہوتا ہے۔ وہ یہ بات آسانی کے ساتھ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوسکتے کہ وہ آج تک ایک بالکل غلط راہ پر بھاگ رہے تھے۔ انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ الاؤنس کا مستحق سمجھتا ہے اور مسلمانوں کو تو یہ غلط فہمی بھی ہے کہ اسلام ایک آسان دین ہے جس کو ہر حالت کے مطابق کیا جاسکتا ہے اس وجہ سے وہ تنگ راہ جو آپ

ان کے سامنے پیش کرتے ہیں اس پر اُن سے بچھڑ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب موجودہ حالت بھی دینداری ہے اگر یہ نہیں ہے جو انھوں نے اختیار کر رکھی ہے تو بلاوجہ زندگی کو قیدوں میں گھیرنے سے کیا فائدہ۔ پس جب تک کہ آپ ان پر یہ حقیقت پوری طرح واضح نہ کر دیں کہ ان کی موجودہ زندگی اسلام سے بالکل بے ربط ہو گئی ہے اور اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے ان کے دلوں کو اپنے دلائل سے کھول نہ دیں اس وقت تک توقع نہیں کہ وہ ہماری دعوت قبول کرنے پر آمادہ ہوں۔ لیکن یہ کام آسان نہیں ہے۔ اس کو ہر شخص انجام نہیں دے سکتا۔ ہماری دعوت کے اسی پہلو سے لوگ گھبراتے ہیں اور اسی کے تحت غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں اور مخالفین کو بھی یہیں سے لوگوں کو ہمارے خلاف بھڑکانے کا مواد ہاتھ آتا ہے۔ اس وجہ سے نہایت ضروری ہے کہ کم از کم ہماری جماعت کے ارکان دعوت کے اس پہلو کو اچھی طرح سمجھ لیں اور جو لوگ اس کو اچھی طرح نہ سمجھے ہوں وہ کم از کم اس پہلو پر لوگوں سے زبانی گفتگو کرنے میں احتیاط برتیں تاکہ بلاوجہ ہمارے کام میں رکاوٹیں نہ پیدا ہوں۔

علماء کی بے پروائی ہماری دعوت سے عام مسلمانوں کی بے پروائی کی وجہ یہ ہے۔ رہے علماء، تو ان کی نسبت ہر شخص جانتا ہے کہ یہی حضرات ہیں جنھوں نے مسلمانوں کی ان کی موجودہ [illegible] دینداری اور تقویٰ، اسلام و ایمان اور توحید و رسالت کا موجودہ مفہوم جو عوام کے ذہنوں میں ہے، اس کے سب سے زیادہ پیدا کیے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ نیک نیتی کے ساتھ یہ سمجھتے ہیں کہ انھی کے دم سے اتنا کہ تمام آفات و مصائب کے اندر سے وہ اسلام کو بچا لائے اور آج بھی اس کو بچائے ہوئے ہیں۔ ایسے لوگوں سے جو اتنی بڑی خوش گمانیوں میں مبتلا ہوں آپ یہ کیسے توقع کر سکتے ہیں کہ آج وہ کھلے دل سے اس بات کا اقرار کریں گے کہ آج تک انھوں نے جو رہنمائی کی ہے وہ غلط تھی اور صحیح راہ وہ ہے جس کی دعوت فلاں جماعت دے رہی ہے۔ بلاشبہ حق پرستی کا تقاضا یہی ہے کہ اس طرح کی حقیقت کے اقرار سے ان کو شرم نہ آئے۔ قرآن نے اہل حق کی سب سے بڑی خوبی یہی بتائی ہے کہ وہ حق کے اعتراف و اعلان میں ملامت کرنے والوں کی ملامت کی پروا نہیں کرتے لیکن انسانی فطرت کی کمزوریاں جس طرح عوام کے اندر پائی جاتی ہیں اسی طرح خواص کے اندر بھی پائی جاتی ہیں۔ جس طرح ہمارے عوام کا پندار دینداری ان کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ تجدید ایمان کے ننگ کو گوارا کریں اسی طرح ہمارے خواص کا غرور سیادت ان کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنے منہ سے خود اپنی غلط رہبری کا اقرار کریں۔ وہ ایک غلط سمت میں اتنی دور تک نکل گئے ہیں کہ ان کے لیے وہاں سے پلٹنا آسان نہیں رہا ہے۔ یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ احساس دینداری کا فتنہ دنیا داری کے فتنہ سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ جو لوگ کسی نفس پرستی میں دنیا داری کی راہ سے مبتلا ہوتے ہیں جونہی ان کے دل پر حق کی تجلی پرتو فگن ہوتی ہے ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور صحیح راہ ان پر آشکارا ہو جاتی ہے۔ ان کی رکاوٹیں زیادہ تر سستی اور پست ہمتی کی قسم کی ہوتی ہیں جو دل کی معمولی بیداری سے بھی دور ہو جاتی ہیں لیکن جو حضرات اپنی غلطیوں کو دین و تقویٰ بنا کر ان کی پرستش کرتے اور کراتے رہتے ہیں ان کے لیے اپنے بتوں کو توڑ پھوڑ کر ایک نیا دین اختیار کر لینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہی تو وہ حجاب اکبر ہے جس کے اٹھانے میں بہت کم [illegible] اس بات پر تعجب نہیں کرنا چاہیے کہ اس کمزوری میں ہمارے علماء بھی مبتلا ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کے لیے آزمائشیں رکھی ہیں [illegible] ان کے لیے یہ فتنہ [illegible] ایک اہم آزمائش ہے۔

[illegible] حضرات میں سے [illegible] بلکہ [illegible]

کا اقرار ہے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں اسلام کا اصلی مطالبہ یہی ہے لیکن چونکہ ان کا دل اس کو ماننے پر راضی نہیں ہے اس وجہ سے اس کے خلاف کچھ باتیں بتکلف بناتے ہیں۔ اور پڑھے لکھے لوگ اگر کسی آفتاب سے زیادہ روشن حق کے خلاف بھی کچھ کہنے پر آمادہ ہو جائیں تو کچھ نہ کچھ اس میں رخنہ نکال ہی دیں گے۔ چنانچہ یہ حضرات بھی کچھ نہ کچھ باتیں پیدا ہی کر لیتے ہیں۔ اگر اصلی دعوت کے خلاف ان کو کوئی بات نہیں ملتی تو داعی کے اندر ہی کچھ عیب ڈھونڈھ نکالتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہر چند دعوت عین کتاب و سنت کی دعوت ہے لیکن داعیوں پر چونکہ بھروسہ نہیں ہے اس وجہ سے ان کے پیچھے چلنے کے بجائے فلاں اور فلاں کے پیچھے چلو جن کی دعوت میں اگرچہ غلطی ہو لیکن وہ خود مستحق اور بھروسہ کے قابل ہیں۔ یہ کتنی دردانگیز اور دل شکن بات ہے کہ ان لوگوں نے اشخاص کو حق کی جگہ دے رکھی ہے۔ جہاں وہ جاتے ہیں حق ان کے ہمرکاب ہوتا ہے اگرچہ وہ کعبہ کی جگہ کنشت ہی کی راہ اختیار کریں۔ عصبیت جاہلیت کی اس سے زیادہ گھنونی مثال اور کیا ہو سکتی ہے! حق پرستی کا تقاضا تو یہ تھا کہ اگر حق یہی ہے جو ہم کہہ رہے ہیں اور اس کے قبول کرنے میں محض ہماری کمزوریاں ان کے لیے رکاوٹ بنی ہوئی ہیں تو یہ خود اس کے داعی بنتے اور آگے چلتے۔ ہم انشاء اللہ ان کے پیچھے چلنے میں کوئی عار نہ محسوس کرتے لیکن یہ عجیب و غریب منطق ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ دیدہ و دانستہ ایک غلط راہ پر چل سکتے ہیں بشرطیکہ اس کا داعی ان کے خیال کے مطابق دیندار ہو اور ایک صحیح راہ پر جس کی صحت کا ان کو خود اقرار ہے وہ نہیں چل سکتے کیونکہ اس کے داعی پر اصطلاحی دینداری کا لیبل نہیں چسپاں ہوا ہے۔ یہ حضرات کیتھولک چرچ کی طرح اپنے حلقہ سے باہر دینداری کا وجود شاید تسلیم نہیں کرتے ورنہ ظاہر ہے کہ اپنی اس منطق کی حمایت میں وہ کوئی دلیل نہیں پیش کر سکتے اور ہمیں یقین ہے کہ وہ اپنی اس پوزیشن پر خود بھی مطمئن نہیں ہیں اور جلد ان پر ان کی غلطی واضح ہو جائے گی۔ اگر آج نہیں تو کل کو وہ دیکھ لیں گے کہ حقیقت شخصی اور گروہی عصبیتوں سے کتنی بے نیاز ہے اور انسان حق کی جگہ اشخاص کو اپنا قبلہ و کعبہ بنا کر صرف اپنا نقصان کرتا ہے نہ کہ حق کا۔

سیاسی جماعتوں کی طرف سے مشکلات عوام کی بے پروائی اور علماء کی بے نیازانہ روش کے ساتھ ساتھ بعض سیاسی جماعتوں کا بھی آپ نے گلہ کیا ہے۔ ان جماعتوں کی مخالفت آپ کے ساتھ بالکل قدرتی ہے۔ ہمارے مقاصد اور ان کے مقاصد ایک دوسرے کے بالکل ضد واقع ہوئے ہیں۔ ہماری کامیابی اور ترقی میں درحقیقت ان کی موت مضمر ہے اس وجہ سے اگر وہ ہم کو اچھی طرح سمجھتی ہیں اور ساتھ ہی اپنے آپ کو بھی سمجھتی ہیں تو ان کو ہمارا دوست نہیں دشمن ہی ہونا چاہیے اور ہمیں ان کی طرف سے سب کچھ برداشت کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ وقت کی سیاسی جماعتوں میں سے کوئی جماعت ایسی نہیں ہے جس پر ہمارے لٹریچر اور ہماری دعوت کی زد براہ راست نہ پڑتی ہو۔ آپ نے ان میں سے ہر ایک کے کام کو غلط کہا ہے اور ہر ایک کے وجود کو باطل قرار دیا ہے پھر آپ کیوں توقع رکھتے ہیں کہ وہ آپ کو پیار کریں گی۔ سیاسی جماعتیں زندگی کے کارزار میں جدوجہد کرتی ہیں۔ اپنے حریفوں کو توڑ دینا یا اپنا لینا ان کی فطرت ہے۔ ان سے کسی مرنجان مرنج پالیسی کی امید کرنا بالکل غلط ہے۔ لیکن اس بات کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ آپ ان کی مخالفانہ روش سے اندیشہ ناک ہوں۔ ہر مخالفت ڈرنے کی چیز نہیں ہوتی۔ مخالفت صرف وہ وزنی اور قابل لحاظ ہوتی ہے جو کسی اصول کے ساتھ کسی با اصول جماعت کی طرف سے ظاہر ہو۔ مجھے مسلمانوں میں کسی ایسی جماعت کا پتہ نہیں جس کا کوئی اصول ہو۔ ان کی حیثیت سیلاب میں بہنے والے تنکوں سے زیادہ نہیں ہے۔ باطل بھی، اگر اس کی پشت پر شجاعت و عزیمت ہو اور اس کے قول و فعل میں مطابقت ہو تو ایک طاقت بن جاتا ہے لیکن یہ حق نما باطل تو ایک لمحہ بھی میدان

میں نہیں ٹک سکتے جو ہماری سیاسی جماعتیں لے کر چلی ہیں۔ ان کی کمزوریاں خود ان پر واضح ہیں اور اگر ابھی حقیقت کے واضح ہونے میں کچھ کسر رہ گئی ہے تو میں پیشنگوئی کرتا ہوں کہ زمانہ جلد یہ کسر بھی پوری کر دے گا۔ اور وہ دن دور نہیں ہے جب یہ ساری جماعتیں اپنی ہستی باقی رکھنے کے لیے اس بات پر مجبور ہوں گی کہ ہماری سکھائی ہوئی بولیوں میں سے کسی نہ کسی بولی کو اختیار کر لیں۔ اور اپنے کھوٹے سکوں کو ہمارے کھرے سکوں کے ساتھ ملا کر چلانے کی کوشش کریں۔ آپ حضرات میں سے جو لوگ وقت کے حالات پر نظر رکھتے ہیں وہ میری اس پیشنگوئی کی تصدیق کریں گے کیونکہ ہمارے بہت سے الفاظ اب مختلف جماعتوں نے استعمال کرنے شروع کر دیے ہیں اور ان الفاظ کی ذہنی کشش سے وہ اپنی گرتی ہوئی پوزیشن سنبھالنا چاہتی ہیں۔ ہمارے بعض ارکان اس صورت حال کو تشویش کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر ہماری اصطلاحات ان جماعتوں نے اختیار کر لیں تو بہت جلد عوام کے ذہنوں میں ان اصطلاحات کا ایسا غلط مفہوم راسخ ہو جائے گا کہ اس کی اصلاح کے لیے ہم کو علیحدہ جدوجہد کرنی پڑے گی نیز لوگوں میں یہ خیال پھیل جائے گا کہ ہم بھی وہی کچھ چاہتے ہیں جو یہ جماعتیں چاہتی ہیں لیکن مجھے اس بات سے کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ میں اس میں جماعت کے لیے کوئی خطرہ نہیں دیکھتا۔ البتہ یہ جماعتیں، اگر ان اصطلاحات کے استعمال میں نیک نیت نہیں ہیں بلکہ محض عوام فریبی کے لیے استعمال کر رہی ہیں تو مجھے خود ان کی موت اس میں نظر آتی ہے۔ اس وقت جب کہ ہمارا کام جاری ہے، ہمارا لٹریچر پوری تیزی کے ساتھ پھیل رہا ہے اور ہم خواص سے گزر کر عوام کے ذہنوں کے قریب بھی آنے کی کوشش کر رہے ہیں ہمیں اس کا ڈر نہیں ہے کہ لوگ ہماری اصطلاحات کی آڑ میں پناہ لے لیں گے۔ زیادہ زمانہ نہیں گذرے گا کہ ہماری باتیں کوچوں سے گونجیں گی اور گلیوں میں پکاری جائیں گی اور عامی سے عامی بھی ان کا وہی مفہوم سمجھے گا جو ہم سمجھانا چاہیں گے۔ اس وقت کسی کے لیے بھی یہ ممکن نہ ہوگا کہ ان پردوں میں چھپ سکے۔ یا تو لوگوں کو اس حقیقت کا صاف صاف اقرار کرنا پڑے گا جو ہم پیش کر رہے ہیں یا میدان سے ہٹنا پڑے گا۔ ابھی ہم یا تو اپنی پوری بات کہہ نہیں سکے ہیں یا لوگ سمجھ نہیں سکے ہیں اس وجہ سے دھوکا کھانے اور دھوکا دینے دونوں کا امکان ہے لیکن ان سارے امکانات کے سدباب کی تدبیریں ہم کر رہے ہیں۔ اور ہم کو یقین ہے کہ انشاء اللہ ہم ہی فتحمند رہیں گے۔ سنت اللہ یہ ہے کہ جب تک حق میدان میں نہیں آتا باطل کو جینے کی مہلت ملتی ہے لیکن جب وہ میدان میں اتر آتا ہے تو اللہ تعالیٰ غلبہ اسی کو دیتا ہے۔ میں مسلمانوں کی موجودہ سیاسی اور مذہبی جماعتوں میں سے کسی میں یہ صلاحیت نہیں دیکھتا کہ وہ ہماری بنائی ہوئی گولیوں کو ہضم کر سکے۔ ان میں سے کسی جماعت کا نہ کوئی سیاسی فکر ہے نہ کوئی اصولی کام، اور نہ ان میں سے کسی کے پاس وہ کیرکٹر ہے جو جماعتوں کو فتح دلاتا ہے۔ اہل باطل میں وہ قابلیتیں موجود رہیں جن کا مظاہرہ نازیوں، اشتراکیوں اور جمہوریت کے علمبرداروں نے کیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ حق کے ان مدعیوں میں، جو اسلام جیسے عظیم الشان حق کا نام لیتے ہیں، آج کوئی قوت و قابلیت موجود نہیں ہے۔ ان کی ہستی تمام تر دوسروں کے مستعار بلکہ سرقہ الفاظ پر قائم ہے۔

خلافت راشدہ کے متعلق ایک عام غلط فہمی

حضرات! آپ میں سے بعضوں نے یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ جماعت اسلامی کے پیش نظر جو نصب العین ہے وہ بہترین ہاتھوں میں بھی ۳۰ سال سے زیادہ قائم نہ رہ سکا تو آج وہ لوگ کہاں سے آئیں گے جو اس نظام کو قائم کر سکیں گے اور ان کے ہاتھوں میں یہ زیادہ عرصہ تک قائم رہ سکے گا۔ اگرچہ آپ میں سے چند ہی حضرات نے یہ سوال

دکھایا ہے لیکن یہ ایک عام شبہ ہے جو بہت سے دلوں میں موجود ہے اور اس کی وجہ بہتوں کو یہ یقین ہے کہ اب دوبارہ اسلامی نظام کا قیام ناممکن ہے اور اگر ممکن ہے بھی تو یہ ایک سعی لاحاصل ہے کیونکہ جب بہترین انسانوں کے ہاتھوں اس کی عمر ایک قلیل زمانہ تک قائم رہ سکا تو آج اس کے قیام و بقا کے متعلق کیا توقعات کی جا سکتی ہیں۔

ہمیں نہایت افسوس ہے کہ یہ باتیں آج وہ لوگ بھی کہتے ہیں جو کلمہ پڑھتے ہیں [illegible] شامل ہیں۔ انہیں شاید اس بات کی خبر نہیں ہے کہ ان کا یہ کہنا درحقیقت اسلام کے خلاف ووٹ دینا ہے۔ اگر اسلامی نظام سے یہ نظری کمزوری موجود ہے تو وہ بہترین انسانوں کے ہاتھوں بھی چند دنوں سے زیادہ قائم نہیں رہ سکتا تو نہ صرف اسلامی نظام کے تصور سے استعفیٰ دینا چاہئے بلکہ نفس اسلام سے بھی مایوس ہو جانا چاہئے کیونکہ اسلام کی زندگی دراصل اسی کے نظام سے باہر تصور نہیں کی جا سکتی۔ ایک اچھے سچے مسلمان کے دل میں تو کبھی اس فاسد خیال کا گذر بھی نہیں ہونا چاہئے لیکن آج یہ ظاہر ہے کہ یہ شبہ عام طور پر لوگوں کے دلوں میں موجود ہے اور اس کی وجہ سے اسلامی نظام کے قیام کی طرف سے لوگوں میں ایک عام افسردگی اور بددلی پائی جاتی ہے [illegible] اس لئے ضروری ہے کہ اس غلط فہمی کا ازالہ کیا جائے۔

حضرات! آپ کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم سے یہ مطالبہ نہیں کیا ہے کہ تم ایک ایسی [illegible] کی حکومت کی طرز پر ایک حکومت قائم کر دیں۔ نہ بندوں کو اس بات کی طاقت دی [illegible] البتہ یہ مطالبہ ضرور کیا ہے کہ تم اقامت دین کی جدوجہد کریں اور اس جدوجہد میں اپنا سب کچھ یعنی اپنی زندگی بھی اور مال بھی اور اپنی تمام مرغوبات و محبوبات [illegible] اور دین سے مراد [illegible] کوئی جزو [illegible] خواہ وہ کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو بلکہ دین بحیثیت مجموعی مراد ہے۔ اس کے کلیات بھی اور جزئیات بھی [illegible] جدوجہد پورے عشق اور پورے [illegible] کے ساتھ مطلوب ہے اور اللہ کے نزدیک یہی چیز ہمارے ایمان اور وفاداری کی کسوٹی ہے۔ لوگ جو اس ولولہ سے خالی ہو ایمان یہ [illegible] نہیں بن سکتا اور کوئی دل جو اس درد سے ناآشنا ہو خدا کا گھر نہیں ہو سکتا۔ کتنی ہی تسبیحیں گردانی جائیں، کتنے ہی وظیفے پڑھے جائیں اور کتنی ہی ضربیں لگائی جائیں اس عشق کے بدل نہیں ہو سکتے۔ ساری دینداری کی روح یہی ہے اور خدا کے ہاں ہمارے دلوں کے اندر سب سے پہلے یہی چیز ڈھونڈی جائے گی اور یہ بھی ایک ضروری شرط ہے کہ یہ جدوجہد جماعتی شکل میں ہو، انفرادی شکل میں نہ ہو۔ ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اپنے اندر اس کی گرمی پیدا کرے اور پھر یہ کوشش کرے کہ اس آگ سے سارے دل بھڑک اٹھیں۔ یہ سوال بحث سے خارج ہے کہ یہ جدوجہد کس حد تک ختم ہو گی۔ ہو سکتا ہے کہ ہم آروں سے چیر ڈالے جائیں، گلیوں میں گھسیٹے جائیں، انگاروں پر لٹائے جائیں اور ہمارے جسموں کو بوٹی بوٹی کر کے نوچیں اور ان ساری باتوں کے بعد بھی ہمیں یہ سعادت حاصل نہ ہو سکے کہ ہم موجودہ نظام باطل کو ایک نظام حق سے بدل دیں لیکن نہ تو یہ ناکامی ناکامی ہے اور نہ اس کا اندیشہ بلکہ اس کا یقین بھی ہم کو اس مطالبہ سے سبکدوش [illegible] جو اقامت دین کے لئے ہم سے کیا ہے۔ وہ تو ایک حکم ہے اور اٹل فرض ہے۔ ہم ہر قیمت پر اور ہر حال میں یہ حکم بجا لانا ہے۔ اگر ہندوستان کی تمام [illegible] بھی آپ کو یہ اطمینان دلانے کی کوشش کریں کہ فلاں فلاں اور فلاں وجوہ سے آپ کو یہ ذمہ داری سبکدوش [illegible] تو آپ کہتے [illegible]

کے دین کی عمارت کی ایک ایک اینٹ بھی اپنی جگہ سے ہٹی ہوئی ہے اور خدا کی زمین کا ایک ٹکڑا بھی غیر اللہ کی اطاعت کے نیچے دبا ہوا ہے اس وقت تک آپ کے لیے چین کی نیند حرام ہے۔

اس جدوجہد کے انجام کی بابت ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ کیا ہوگا۔ انجام کا حال صرف اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے۔ اگر اس جدوجہد کا نتیجہ یہ ہو کہ ہم ایک صالح نظام قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو یہ اللہ تعالیٰ کا انعام ہوگا۔ بعض لوگ طنز سے یہ کہتے ہیں کہ ہماری ساری جدوجہد حکومت کے لیے ہے اور خدا کی رضا کی طلب جو خلاصۂ دین ہے ہمارے سامنے نہیں ہے۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ ہماری ساری جدوجہد اللہ کے دین کے قیام اور ایک صالح اور خدائی نظام کی اقامت کے لیے ہے اور یہ جدوجہد کوئی جرم نہیں ہے جس پر ہمیں شرمانے کی ضرورت ہو اور ہم جب کبھی حکومت الٰہیہ کا نام لیتے ہیں تو اس سے ہماری مراد یہی نظام ہوتا ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ اس کے مطلوب و محبوب ہونے میں کس پہلو سے بحث کی جا سکتی ہے اور آخر یہ خدا کی رضا طلبی سے الگ چیز کیوں ہے؟ خدا کی رضا اس سے بڑھ کر کس بات میں ہو سکتی ہے کہ اس کی زمین پر اس کے احکام چلیں اور ان لوگوں سے بڑھ کر رضائے الٰہی کا طالب کون ہو سکتا ہے جو اس بات کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیں کہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو خدا کی زمین پر غیر اللہ کے اقتدار کا کوئی دھبہ نہ رہنے دیں گے۔ اگر یہ جدوجہد دنیاداری ہے تو کیا دینداری یہ ہے کہ راتوں میں جنگل کر اللہ ہو کی ضربیں لگائی جائیں اور دن میں خدا کی زمین پر شیطان کا تخت بچھانے کی کوشش کی جائے۔ جو لوگ اس طرح کی باتیں کہتے ہیں ان کے ذہنوں میں دین کا نہایت ناقص تصور ہے اور بہتر ہے کہ انہیں ابھی اس بات کے لیے مہلت دی جائے کہ وہ دین کی اصل حقیقت سمجھ سکیں۔

اگر صحیح اسلامی نظام صرف ۳۰ سال ہی قائم رہا جب بھی یہ ایسی چیز ہے جس کے لیے اگر ہم اپنی زندگیاں مٹا دیں تو یہ مہنگا سودا نہیں ہے بلکہ اس نظام خیر و برکت کی ایک شب بھی جس میں خدا کا بندہ صرف خدا کا محکوم رہتا ہے ان ہزار ہا سال اور مہینوں سے افضل ہے جن میں خدا کے بندوں کو خدا کے سوا دوسروں کی غلامی کرنی پڑتی ہے۔ آپ ۳۰ سال کہتے ہیں میں تو اس کے ۳۰ منٹ بھی بہت سمجھتا ہوں اور اپنی اور اپنی جیسی لاکھوں زندگیوں کو اس کی قیمت نہیں سمجھتا۔ ذرا غور تو کیجیے، دنیا کی تمام سیاسی تنظیمات میں سب سے افضل جمہوریت کو سمجھا جاتا ہے لیکن اس کی نسبت قطعیت کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ محض ایک امکان ہے نہ واقعہ کی صورت میں ایک لمحہ کے لیے بھی اس کا وجود ہوا، نہ کبھی اس کا تصور کیا جا سکتا ہے تاہم آپ دیکھتے ہیں کہ اس کے لیے دنیا نے کتنی شاندار قربانیاں دی ہیں۔ پھر ایک ایسے نظام کے قیام کی طرف سے آپ کیوں بددل ہوتے ہیں جو عملاً دنیا میں خود آپ کے اقرار کے مطابق ۳۰ سال تک قائم رہ چکا ہو اور جس کے امن و عدل اور خیر و برکت پر مومن و منکر دونوں کی شہادت موجود ہے۔

لیکن یہ تاریخ کے نہایت ناقص مطالعہ کا نتیجہ ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ صحیح اسلامی نظام صرف ۳۰ سال ہی قائم رہا، بلکہ سیرت کی کمی کی وجہ سے اشخاص کی تبدیلی اور نظام کی تبدیلی میں لوگ فرق نہیں کرتے حالانکہ دونوں باتوں میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ خلافتِ راشدہ کے خاتمہ کے بعد جو تبدیلی واقع ہوئی وہ کانسٹی ٹیوشن کی تبدیلی نہیں تھی بلکہ اشخاص اور افراد کی تبدیلی تھی۔ ملک کا قانون وہی رہا، حکومت کا دستور وہی رہا، تعزیرات خدا کی قائم کی ہوئی تھیں، حدود اللہ کے مقرر کیے ہوئے تھے

جائدادیں قرآن کے بتائے ہوئے قانون کے مطابق تقسیم ہوتی تھیں۔ صرف اس نظام کے چلانے والے افراد میں یہ تبدیلی ضرور ہو گئی تھی کہ وہ صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کی طرح متقی اور خدا ترس نہ تھے۔ تاہم ان میں سے کسی کے لیے بھی یہ ممکن نہ تھا کہ وہ خدا کے قانون کی جگہ اپنا قانون چلا دے۔ ان میں سے اگر کوئی شخص خدا کے کسی حکم کی ذمہ داریوں سے بچنا چاہتا تھا تو اس کو طرح طرح کے مذہبی حیلوں سے کام لینا پڑتا تھا۔ خدا سے علانیہ بغاوت ان میں سے بدسے بدتر آدمی بھی کرنے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ بعد کے زمانوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ جب مسند خلافت پر کوئی خدا ترس اور متقی انسان آگیا تو دفعۃً شبُ روز کے اندر دنیا میں وہ بہار آگئی جو فاروق اعظمؓ کے زمانہ میں آئی تھی اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ گویا نظام حکومت میں سرے سے کوئی خرابی پیدا ہی نہیں ہوئی تھی۔ اور یہ واقعہ بھی ہے کہ دراصل نظام کے اندر کوئی بنیادی خرابی، جس کی اصلاح دیر طلب ہو، پیدا بھی نہیں ہوئی تھی۔ صرف اوپری خرابیاں پیدا ہوتی تھیں جو معمولی تبدیلی سے درست ہو جاتی تھیں۔ اس طرح کی اصلاح کے دور اسلامی خلافت پر بار بار آئے اور جب تک اس کی بنیاد میں خرابی نہیں پیدا ہوئی یعنی خدا کی حکومت کی جگہ طاغوت کی حکومت نہیں قائم ہو گئی اس وقت تک دنیا میں خلافت راشدہ کی برکتوں کا دور بار بار آتا رہا اور اب بھی اس کے لیے جدوجہد کی جائے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کام میں ہماری مدد کیوں نہ فرمائے گا۔ اس آسمان کی چھت کے نیچے ہر طرح کے کام ہو رہے ہیں اور جن کاموں کے لیے وہ جدوجہد ظہور میں آجاتی ہے جو ان کے لیے مطلوب ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ کام بھی ہو جاتے ہیں۔ خواہ باطل ہوں یا حق۔ پھر جب اس کائنات کا رب اہل باطل کی جانبازیوں کو بھی نامراد نہیں کرتا تو آخر ایک مقصد حق ہی سے اس کو اتنی عداوت کیوں ہو گی کہ اس کے لیے اگرچہ سر دھڑ کی بازی لگانے والے پیدا ہو جائیں لیکن وہ پورا نہ ہو سکے گا۔

کام کے ضروری شرائط لیکن ہر کام کا ایک مخصوص طریقہ ہوتا ہے، اور ضروری ہے کہ اس کو اسی طریقہ پر انجام دیا جائے۔ ایک کام کو اگر آپ غلط طریقہ پر کر رہے ہیں تو خواہ یہ غلطی آپ کتنی ہی نیک نیتی سے کریں اس غلطی کا نتیجہ اس عمل کی ناکامی کی شکل میں آپ کے سامنے آکے رہے گا۔ خدا کے بنائے ہوئے قوانین بالکل بے لوث اور بے لاگ ہوتے ہیں۔ نیک سے نیک انسان بھی اگر شہد کی جگہ حنظل استعمال کر رہا ہے تو اس کی نیکی کی وجہ سے حنظل میں شہد کی تاثیر نہیں پیدا ہو جائے گی۔ اسی طرح اگر مسلمان ایک کام کو غلط طریقہ پر کر رہے ہیں تو اس وجہ سے کہ وہ مسلمان ہیں اور اپنے زعم میں خدا کے ہاں بڑا درجہ رکھتے ہیں، یہ نہیں ہو سکتا کہ ان کا کام صحیح ہو جائے۔ اور اگر غیر مسلم کسی کام کو صحیح طریقہ پر انجام دینے کی جدوجہد میں سرگرم ہیں تو محض اس وجہ سے کہ وہ غیر مسلم ہیں یہ نہیں ہو سکتا کہ ان کی صحیح جدوجہد کا نتیجہ نہ نکلے۔ اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قوانین میں اس طرح کی ناانصافی نہیں ہے۔ مسلمانوں میں یہ احساس بڑی شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے کہ بحیثیت مسلمان کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکومت و اقتدار کی نعمت پانے کے مستحق وہی ہیں۔ اس احساس کے ساتھ جب وہ اپنی موجودہ حالت پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کو قرآن کے وعدوں اور خدا کی طرف سے مایوسی ہونے لگتی ہے۔ وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ جب ہم مسلمان ہیں تو زمین کی وراثت ہمیں کو ملنی تھی۔ اگر نہیں ملی تو اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے بلکہ وعدہ کرنے والے ہی کی طرف سے کوئی تغافل ہے۔ لیکن یہ خیال نہایت غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کا وعدہ انفرادی کوششوں کے صلہ میں فرمایا ہے ان کو

انفرادی کوششوں کے صلہ میں عطا فرماتا ہے لیکن جن چیزوں کا وعدہ جماعت سے ہے ان کے لیے ضروری ہے کہ جماعتی جدوجہد ظہور میں آئے، اگر ان کے لیے جماعتی جدوجہد ظہور میں نہ آئے تو خواہ انفرادی زہد و تقویٰ میں آپ کتنے ہی بڑھے ہوئے ہوں، آپ کے اندر جنید و شبلی اور سلمان و ابوذرؓ کے درجہ کے تنہا عابد کیوں نہ موجود ہوں لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ ان انفرادی نیکیوں کے صلہ میں آپ کو اللہ تعالیٰ کے وہ انعامات مل جائیں جو جماعتی نیکیوں کے لیے مخصوص ہیں۔ ہم کو اس امر سے انکار نہیں ہے کہ مسلمانوں میں آج بھی نہایت نیک اور صالح افراد موجود ہیں لیکن ان نیک اور صالح افراد نے مل کر کبھی اس بات کی کوشش نہیں کی کہ اس ملک میں ایک صالح نظام قائم کریں بلکہ اپنی انفرادی نیکیوں کے زعم میں ہمیشہ خدا سے شکوہ سنج رہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے اپنے وعدے پورے نہیں کیے۔ خدا نے جماعتوں سے ان کی جماعتی نیکیوں پر جو وعدے فرمائے ہیں وہ تو اس قدر اٹل ہیں کہ اگر وہ نیکیاں کسی جماعت کے اندر خدا کے انکار کے ساتھ بھی پیدا ہو جائیں جب بھی وہ صلے مل کر رہتے ہیں۔ پھر اگر کوئی جماعت ایمان و اسلام کی نعمت سے بہرہ ور ہو کر ایک صالح نظام کے لیے جدوجہد کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے انعامات سے اس کو محروم فرمائے۔

جماعت اسلامی مسلمانوں کی اسی غلطی کی اصلاح کر رہی ہے۔ وہ قوم کے تمام صالح افراد کو منظم کرکے چاہتی ہے کہ ان کو ایک صالح نظام کے قیام کی جدوجہد میں لگائے اور اس کام کو انجام دینے کا جو صحیح طریقہ ہے اس طریقہ پر انجام دے۔ اگرچہ انجام بہرحال اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے لیکن ہمیں خدا کی ذات سے یہی امید ہے کہ ہماری جدوجہد کامیاب ہوگی اور ہم منزل مقصود تک پہنچ کے رہیں گے لیکن ایک طویل زمانہ تک جماعتی زندگی سے محروم رہنے کی وجہ سے ہم جماعتی زندگی کی خصوصیات اور ذمہ داریوں سے بالکل ناآشنا ہوگئے ہیں اس وجہ سے نہایت ضروری ہے کہ آج جب کہ ہم جماعتی زندگی کا ارادہ کر رہے ہیں اس کی ذمہ داریوں کو سمجھنے اور ادا کرنے کا اہتمام کریں۔

جماعتی زندگی کی خصوصیات

جماعتی زندگی کی سب سے بڑی امتیازی خصوصیت ڈسپلن اور جماعتی نظم کی پابندی ہے۔ جماعت وجود ہی میں اس نظم کی پابندی کے ارادہ سے آتی ہے اس وجہ سے اس سے ادنیٰ بے پروائی جماعت کی موت کے مرادف ہے۔ اس نظم کو قائم رکھنے کے لیے جماعت کے تمام افراد کو اپنی ذاتی خواہشوں اور انفرادی رایوں کی قربانی کرنی پڑتی ہے۔ اس زندگی میں کسر و انکسار شرط ضروری ہے۔ افراد بکھری ہوئی اینٹوں کے مانند ہیں ان کو ایک عمارت کی صورت اختیار کرنے کے لیے لازماً اس بات پر آمادہ ہونا پڑتا ہے کہ تھوڑا سا زخم گوارا کریں۔ اگر ہر اینٹ اس بات پہ اصرار کرے کہ وہ کوئی زخم گوارا نہ کرے گی تو عمارت نہیں بن سکے گی۔ اسی طرح اگر آپ میں سے ہر فرد اپنی رائے پر اصرار کرے اور اپنی آزادی میں کسی قسم کی مداخلت نہ گوارا کرے تو جماعت نہیں بن سکتی اور اگر بن جائے گی تو قائم نہ رہ سکے گی۔ یہ نہیں خیال کرنا چاہیے کہ جماعتی زندگی آزادی رائے کو برباد کرنے والی چیز ہے۔ بے شک اس کے لیے آدمی کو اپنی آزادی کا ایک حصہ قربان کرنا پڑتا ہے لیکن اس تھوڑے حصہ کو قربان کرکے آدمی اپنی پوری آزادی کو محفوظ کر لیتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص اس تھوڑی قربانی پر آمادہ نہیں ہوتا تو اسے اپنی پوری آزادی کھونی پڑتی ہے۔ جس طرح ایک خزانہ کا مالک اگر اپنے خزانہ کا کچھ حصہ پہرہ داروں اور پاسبانوں کی نذر نہ کرے تو اس کا پورا خزانہ خطرہ میں رہتا ہے اسی طرح افراد کی ساری آزادی خطرہ میں ہے اگر وہ جماعت کے حق میں اپنی آزادی رائے کو ایک حد تک قربان کرنے پر آمادہ نہ ہوں۔ آپ کی رپورٹوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی ہم میں اس شعور کی کمی ہے۔ کوشش کیجیے کہ لوگوں میں یہ شعور پیدا ہو

اس کا پیدا ہونا محض ایک اخلاقی فضیلت نہیں ہے بلکہ ایک اہم دینی ضرورت ہے اور جن لوگوں کے اندر اس چیز کی کمی ہے وہ اس کی تلافی اس کو پورا کر کے ہی کر سکتے ہیں۔ نوافل کی کوئی مقدار اس کا بدل نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ جماعتی نظم میں فساد پیدا کرنے والوں کے لیے اسلام میں نہایت سخت سزا ہے۔ جو لوگ اس چیز میں کوئی خرابی ڈالتے ہیں وہ اپنی ساری نیکیوں کا ثواب کھو بیٹھتے ہیں۔ پس میں ارکان جماعت کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ اس معاملہ میں ادنیٰ غفلت کو بھی راہ نہ دیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے پھر عرض کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے جو وعدے جماعت سے ہیں وہ افراد کے لیے نہیں ہیں اور اسلام کوئی ایسا دین نہیں ہے جس کے مطالبات انفرادی زندگی سے پورے ہو سکیں خواہ ان میں کتنی ہی تقویٰ اور دینداری موجود ہو۔

اسی کے ساتھ ساتھ ایک اور امر بھی قابل لحاظ ہے۔ وہ یہ ہے کہ دین کے بعض جزئیات کے لیے مسلمانوں کے مختلف گروہوں میں خواہ مخواہ کی ایک مبالغہ آمیز عصبیت پیدا ہو گئی تھی۔ اور اس عصبیت کی شدت و خشونت اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ ان جزئیات کے لیے لوگ کٹنے مرنے تک تل گئے تھے اور ان کا تناسب اس قدر قوی ہو گیا تھا کہ ان کے نیچے اصل دین کے سارے مطالبات دب گئے تھے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے بعض ارکان میں اب بھی یہ پرانا مذاق کچھ نہ کچھ باقی ہے جس کے سبب سے اندیشہ ہوتا ہے کہ مبادا اس نظم جماعت کو نقصان پہنچ جائے۔ ضرورت ہے کہ آپ اصل اور فرع میں امتیاز پیدا کریں، پتیوں اور شاخوں کی آبیاری میں اس درجہ منہمک نہ ہو جائیں کہ درخت کی جڑ سوکھ کے رہ جائے۔ دین کا ایسا شعور جو آپ میں توازن پیدا کرے اور ہر چیز کو اس کی اصلی جگہ دینے کا مذاق پیدا کرے نہایت ضروری ہے۔ اگر یہ چیز آپ میں کم رہی تو اندیشہ ہے کہ آپ کسی فروع کو اصل بنا کر اس کی خاطر ساری جماعت اور سارے دین کو خطرہ میں ڈال دیں۔

اسی سلسلہ میں ایک اور بات پر بھی تنبیہ نہایت ضروری ہے وہ یہ کہ اس دور میں لوگوں کے ذہنوں میں دینداری کا ایک غلط تصور پیدا ہو گیا ہے کہ جب کسی دینی کام کا ارادہ کیا جائے تو لوگ اس کے کارکنوں میں ایسی باتیں ڈھونڈھنے لگتے ہیں جن کی دین میں کوئی اصل نہیں ہے۔ اور جب وہ چیزیں نہیں پاتے تو پوری جماعت کو ایک غیر دینی جماعت بلکہ ایک مفسد جماعت قرار دیتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ جماعت اسلامی اپنے مقاصد کے اعتبار سے نہایت صالح اور اچھی جماعت ہے لیکن اس کے لیڈروں میں تقویٰ نہیں ہے۔ چونکہ اس پروپیگنڈے سے کسی نہ کسی حد تک ہمارے ارکان بھی متاثر ہوتے ہیں اس وجہ سے ضروری ہے کہ بعض باتیں اس سلسلہ میں بھی گوش گزار کر دی جائیں۔ اور ان باتوں سے مقصود اپنے آپ کو محفوظ کرنا نہیں بلکہ اصل حقیقت کا اظہار و بیان ہے۔ اس جماعت کے لیڈروں میں سے کسی کو بھی تقویٰ کا دعویٰ نہیں ہے البتہ ان حضرات کے تقویٰ پر حیرت ضرور ہے جو صحیح کام جماعت اسلامی کے کام کو سمجھتے ہیں لیکن ہمارے اندر تقویٰ کی کمی کی وجہ سے عام مسلمانوں کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ ان لوگوں کے پیچھے چلو جو اگرچہ غلط راہ پر جا رہے ہیں لیکن متقی ہیں۔ ہم ان کو خدا کا واسطہ دے کر ان کی ذمہ داری یاد دلاتے ہیں کہ اگر ان پر راہ حق واضح ہے اور ان میں تقویٰ بھی موجود ہے تو وہ خود آگے بڑھ کر تمام قیادت اپنے ہاتھوں میں لیں لیکن دیدہ و دانستہ مسلمانوں کو غلط راہ پر چلنے کا مشورہ نہ دیں۔ انھیں اس بات کو یاد رکھنا چاہیے کہ اس تقویٰ کے لیے ایک روز حساب بھی ہے جس دن ان سے مسلمانوں کو دیدہ و دانستہ غلط مشورہ دینے کی بابت پرسش ہوگی اور وہ اس جواب سے بری نہ ہو سکیں گے کہ انھوں نے مسلمانوں کو متقی غلط کاروں کے پیچھے گمراہ ہونے کا مشورہ دیا۔

میں اس موقع پر پورے اطمینان قلب کے ساتھ یہ حقیقت بھی واضح کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اس زمانہ میں تقویٰ کے جو لوازم پیدا ہو گئے ہیں تقویٰ کے موسم بہار یعنی خیر القرون میں ان لوازم کا کوئی نام و نشان بھی نہ تھا۔ موجودہ تقویٰ میں صرف یہ کافی نہیں ہے کہ حرام کو حرام قرار دیا جائے اور آدمی اس سے پرہیز کرے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اللہ کی مباح کی ہوئی چیزوں کا بھی تارک ہو۔ اور ستم یہ کہ بعض مباحات کے ترک کا اس درجہ اہتمام ہے کہ جہاں آدمی میں ان چیزوں کا کوئی شائبہ پایا گیا وہ رند مشہور ہوا حالانکہ بڑے بڑے محرمات صریحہ میں یہ حضرات مبتلا ہیں لیکن ان کا احساس ان حضرات کو ذرا بےچین نہیں کرتا۔ اگر ایک آدمی قرینہ کی صاف ستھری زندگی بسر کرے تو ان کی ولایت سے وہ خارج ہے لیکن طاغوت کی حمایت و نصرت میں اپنی ساری قابلیتیں رات دن صرف کرنے والے محض چند رسمیات کی پابندی کی بدولت روزانہ قرب خداوندی کے نہایت بلند مراحل و مقامات طے کرتے ہیں اور ان کے سلوک میں کوئی شے مزاحم نہیں ہوتی۔ مسیحؑ نے شاید اسی تقویٰ کو "مچھر کو چھاننے اور اونٹ کو نگلنے" سے تعبیر کیا ہے اور کتنی سچی تعبیر ہے یہ اس تقویٰ کی جس میں ڈاڑھی اور لباس کی ادنیٰ بے قاعدگی گوارا نہیں کی جاتی لیکن خدا کی ساری شریعت کی بربادی پر ان کے سینوں میں ایک آہ بھی نہیں۔

اس عہد میں تقویٰ کے لیے ایک شرط لازم یہ بھی ہے کہ آدمی کے پاس کسی خانقاہ کی سند ہو۔ بغیر اس سند کے چاہے کوئی شخص کتاب و سنت کا کتنا ہی پابند ہو مقام تقویٰ تک نہیں پہنچ سکتا۔ حالانکہ یہ شرط دین میں ایک اضافہ ہے۔ قرآن میں جس تقویٰ کی مدح کی گئی ہے وہ حدود الٰہی کی پاسداری اور خدا کے دین کو اپنے اوپر قائم کرنے اور دوسروں کو اس کی دعوت دینے سے زیادہ کچھ نہیں۔ اگر ایک شخص اللہ کے حدود سے ڈرتا ہے، خدا کی شریعت کی پابندی کا التزام کرتا ہے، محرمات اور بدعات سے بچتا ہے تو وہ متقی ہے خواہ وہ کسی خانقاہ سے وابستہ ہو یا نہ ہو۔ ظاہرداری، خاکساری، بے قرینہ تقشف، اقامت دین کی جدوجہد سے بے پروائی و غیر ثابت اوراد و وظائف کا انہماک اور اس قبیل کی دوسری باتیں ہمارے یہاں نہیں ہیں اور جن حضرات کو ان چیزوں کی تلاش ہے بہتر ہے کہ وہ کسی خانقاہ کی راہ لیں۔ ہم سے ان چیزوں کا مطالبہ نہ کریں۔ ہم سے انہی چیزوں کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے جن کی اصل اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت میں ہے۔ ان چیزوں کے سوا کوئی چیز ہم پر حجت نہیں قائم کر سکتی۔ میں ان باتوں کو اس لیے صاف صاف کہہ رہا ہوں کہ کسی کو ہماری نسبت کوئی غلط فہمی نہ رہے۔ ہم جتنے ہیں اس سے زیادہ ایک حرف ظاہر کرنا پسند نہیں کرتے۔

مجھے یہ حقیقت ظاہر کر دینے میں بھی کوئی باک نہیں ہے کہ آج یہ تقویٰ کے بہت سے لوازم جو پیدا کیے گئے ہیں وہ اقامت دین کی اصلی جدوجہد پر پردہ ڈالنے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ ان حضرات کو جب دین کے اصلی مطالبات مشکل معلوم ہوئے اور انھیں نظر آیا کہ اس راہ میں چند مقامات بہت سخت آتے ہیں اور ساتھ ہی ان کو یہ شرمندگی بھی گوارا نہ تھی کہ ان پر قصور ہمت کا الزام آئے تو انھوں نے دین کے اصلی مطالبات کے دوسرے بدل تجویز کر لیے۔ میدان کارزار کو انھوں نے دنیا کو فتنہ کہہ کر چھوڑ دیا اور خانقاہوں میں معتکف ہو کر اوراد و وظائف کی مقداروں میں اضافہ کر دیا۔ پھر تقویٰ کی ایک خاص ہیئت قرار پا گئی اور متقیانہ زندگی کا ایک خاص نہج وجود میں آ گیا اور آہستہ آہستہ اب یہ حال ہو گیا ہے کہ ان کے ہاتھوں میں تقویٰ کا جو پیمانہ ہے ہمیں اندیشہ ہے کہ اگر اس سے خیر القرون کے مسلمانوں کو بھی ناپا جائے تو شاید وہ بھی متقی نہ ثابت ہو سکیں ہم ان

تقویٰ کے قائل نہیں ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ کافی ہے کہ ایک سیدھے سادے اور پختہ مسلمان کی سی زندگی بسر کیجیے۔ خدا اور اس کے رسول کی جو باتیں آپ کے علم میں آئیں اس پر کار بند رہیے اور ہر لمحہ فکر مند رہیے۔ اپنی زندگی کا برابر احتساب کرتے رہیے کہ آپ کے کام دکھاوے اور شہرت کے لیے نہ ہوں۔ اور رات دن اس جدوجہد میں لگے رہیے کہ خدا کے بندوں پر صرف خدا کا قانون حاکم ہو۔ دوسرے مدعیان حکومت یا تو مٹ جائیں یا ان کو ہٹنے اور نہ بدلنے کی صورت میں ان کو مٹانے میں ہم مٹ جائیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اب ان باتوں کو آپ گوش ہوش سے سن لیں۔ زمانہ بڑی تیزی سے بدل رہا ہے۔ ہمارے سامنے نہایت مشکل کام آنے والے ہیں نہ جانے کب ہمارے سامنے کوئی سخت امتحان آ جائے اور ہماری فوج مغالطوں میں الجھی ہوئی ہو۔ آپ کے ہاتھ میں کتاب و سنت کے سوا کوئی پیمانہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس پیمانہ سے اپنی جماعت کے افراد کو ناپتے رہیے۔ اپنے امیر کو بھی اور مامور کو بھی۔ اس احتساب میں جماعت کی زندگی ہے اور اس میں کسی قسم کی مداہنت اور مسامحت سے کام نہ لیجیے دوسرے خیالات جو بے اصل ہیں ان کو چھوڑیے اور اگر ان کی گرفت آپ پر اتنی سخت ہے کہ آپ الگ نہیں ہو سکتے تو ہمیں اس بات کا کوئی غم نہ ہوگا اگر آپ ہم کو چھوڑ دیں۔ ہم نہ تو خود دھوکے میں رہنا چاہتے ہیں نہ دوسروں کو دھوکا دینا چاہتے

اجلاس ہفتم

(تاریخ ایضاً)

نماز مغرب کے بعد آخری اجلاس منعقد ہوا۔ چونکہ اب اجتماع کے سلسلہ کا سارا پروگرام اختتام کو پہنچ چکا تھا اس لیے جماعت کو رخصت کرنے سے پہلے اس اجلاس میں امیر جماعت نے رفقاء و حاضرین سے آخری خطاب کیا جو درج ذیل ہے۔

امیر جماعت کی اختتامی تقریر

حمد و صلوٰۃ اور تمہیدی فقروں کے بعد فرمایا:۔

رفقاء و حاضرین۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے ہماری جدوجہد کا آخری مقصود انقلاب امامت ہے، یعنی دنیا میں ہم جس انتہائی منزل تک پہنچنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ فساق و فجار کی امامت و قیادت ختم ہو کر امامت صالحہ کا نظام قائم ہو اور اسی سعی و جہد کو ہم دنیا و آخرت میں رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ یہ چیز جسے ہم نے اپنا مقصد قرار دیا ہے، افسوس ہے کہ آج اس کی اہمیت سے مسلم اور غیر مسلم سبھی غافل ہیں۔ مسلمان اس کو محض ایک سیاسی مقصد سمجھتے ہیں اور ان کو کچھ احساس نہیں ہے کہ دین میں اس کی کیا اہمیت ہے۔ غیر مسلم کچھ تعصب کی بنا پر اور کچھ ناواقفیت کی وجہ سے اس حقیقت کو جانتے ہی نہیں کہ دراصل فساق۔ فجار کی قیادت ہی نوع انسانی کے مصائب کی جڑ ہے اور انسان کی بھلائی کا سارا انحصار صرف اس بات پر ہے کہ دنیا کے معاملات کی سربراہ کاری صالح لوگوں کے ہاتھوں میں ہو۔ آج دنیا میں جو فساد عظیم برپا ہے، جو ظلم اور طغیان ہو رہا ہے انسانی اخلاق میں جو عالمگیر بگاڑ رونما ہے، انسانی تمدن و تہذیب اور معیشت و سیاست کی رگ رگ میں جو زہر سرایت کر گئے۔ زمین کے تمام وسائل اور انسانی علوم کی دریافت کردہ ساری قوتیں جس طرح انسان کی فلاح و بہبود کے بجائے اس کی تباہی کیلئے استعمال ہو رہی ہیں۔ ان سب کی ذمہ داری اگر کسی چیز پر ہے تو وہ صرف یہی ہے کہ دنیا میں چاہے نیک لوگوں اور شریف انسانوں کی کمی نہ ہو مگر دنیا کے معاملات ان کے ہاتھ میں نہیں ہیں بلکہ خدا سے پھرے ہوئے اور مادہ پرستی و بداخلاقی

میں ڈوبے ہوئے لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں۔ اب اگر کوئی شخص دنیا کی اصلاح چاہتا ہو اور فساد کو صلاح سے، اضطراب کو امن سے، بداخلاقیوں کو اخلاق صالحہ سے اور برائیوں کو بھلائیوں سے بدلنے کا خواہشمند ہو تو اس کے لیے محض نیکیوں کا وعظ اور خدا پرستی کی تلقین اور حسن اخلاق کی ترغیب ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کا فرض ہے کہ نوع انسانی میں جتنے صالح عناصر اس کو مل سکیں انہیں ملا کر وہ اجتماعی قوت بہم پہنچائے جس سے تمدن کی زمام کار فاسقوں سے چھینی جاسکے اور امامت کے نظام میں تغیر کیا جاسکے۔

انسانی زندگی کے مسائل میں جس کو تھوڑی سی بصیرت بھی حاصل ہوگی وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتا کہ انسانی معاملات کے بناؤ اور بگاڑ کا آخری فیصلہ جس مسئلے پر منحصر ہے وہ یہ سوال ہے کہ معاملات انسانی کی زمام کار کس کے ہاتھ میں ہے؟ جس طرح گاڑی ہمیشہ اسی سمت چلا کرتی ہے جس سمت پر ڈرائیور اس کو لے جانا چاہتا ہو اور دوسرے لوگ جو گاڑی میں بیٹھے ہوں خواستہ و ناخواستہ اسی سمت پر سفر کرنے کے لیے مجبور ہوتے ہیں، اسی طرح انسانی تمدن کی گاڑی بھی اسی سمت پر سفر کیا کرتی ہے جس سمت پر وہ لوگ جانا چاہتے ہیں جن کے ہاتھ میں تمدن کی باگیں ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ زمین کے سارے ذرائع جن کے قابو میں ہوں، قوت و اقتدار جن کے ہاتھ میں ہو، عام انسانوں کی زندگی جن کے دامن سے وابستہ ہو، خیالات و افکار اور نظریات کو بنانے اور ڈھالنے کے وسائل جن کے قبضے میں ہوں، انفرادی سیرتوں کی تعمیر، اجتماعی نظام کی تشکیل اور اخلاقی قدروں کی تعیین جن کے اختیار میں ہو، ان کی رہنمائی و فرمانروائی کے تحت رہتے ہوئے انسانیت بحیثیت مجموعی اس راہ پر چلنے سے کسی طرح باز نہیں رہ سکتی جس پر وہ اسے چلانا چاہتے ہوں۔ یہ رہنما و فرمانروا اگر خدا پرست اور صالح لوگ ہوں تو لامحالہ زندگی کا سارا نظام خدا پرستی اور خیر و صلاح پر چلے گا، برے لوگ بھی اچھے بننے پر مجبور ہوں گے، بھلائیوں کو نشو و نما نصیب ہوگا اور برائیاں اگر مٹیں گی نہیں تو کم از کم پروان بھی نہ چڑھ سکیں گی۔ لیکن اگر رہنمائی و قیادت اور فرمانروائی کا اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو خدا سے برگشتہ اور فسق و فجور میں سرگشتہ ہوں تو آپ سے آپ سارا نظام زندگی خدا سے بغاوت اور ظلم و بداخلاقی پر چلے گا۔ خیالات و نظریات، علوم و آداب، سیاست و معیشت، تہذیب و معاشرت، اخلاق و معاملات، عدل و قانون، سب کے سب بحیثیت مجموعی بگڑ جائیں گے۔ برائیاں خوب نشو و نما پائیں گی اور بھلائیوں کو زمین اپنے اندر جگہ دینے سے اور ہوا اور پانی ان کو غذا دینے سے انکار کر دیں گے۔ اور خدا کی زمین ظلم و جور سے لبریز ہو کر رہے گی۔ ایسے نظام میں برائی کی راہ پر چلنا آسان اور بھلائی کی راہ پر چلنا کیا معنی قائم رہنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ جس طرح آپ نے کسی بڑے مجمع میں دیکھا ہوگا کہ سارا مجمع جس طرف جارہا ہو، اس طرف چلنے کے لیے تو آدمی کو کچھ قوت لگانے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ مجمع کی قوت سے خود بخود اسی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے، لیکن اگر اس کے مخالف سمت میں اگر کوئی چلنا چاہے تو وہ بہت زور مار کر بھی بمشکل ایک آدھ قدم چل سکتا ہے اور جتنے قدم وہ چلتا ہے مجمع کا ایک ہی ریلا اس سے کئی گنے زیادہ قدم اسے پیچھے دھکیل دیتا ہے، اسی طرح اجتماعی نظام بھی جب غیر صالح لوگوں کی قیادت میں کفر و فسق کی راہوں پر چل پڑتا ہے تو افراد اور گروہوں کے لیے غلط راہ پر چلنا تو اتنا آسان ہو جاتا ہے کہ انہیں بطور خود اس پر چلنے کے لیے کچھ زور لگانے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی، لیکن اگر وہ اس کے خلاف چلنا چاہیں تو اپنے جسم و جان کا سارا زور لگانے پر بھی ایک آدھ قدم ہی راہ راست پر بڑھ سکتے ہیں اور اجتماعی رو ان کی مزاحمت کے باوجود انہیں دھکیل کر میلوں پیچھے ہٹا لے جاتی ہے۔

یہ بات جو میں عرض کر رہا ہوں، یہ اب کوئی ایسی نظری حقیقت نہیں رہی ہے جسے ثابت کرنے کے لیے دلائل کی ضرورت ہو،

بلکہ واقعات نے اسے ایک بدیہی حقیقت بنا دیا ہے جس سے کوئی صاحب دیدۂ بینا انکار نہیں کر سکتا۔ آپ خود ہی دیکھ لیں کہ پچھلے سو برس کے اندر آپ کے اپنے ملک میں کس طرح خیالات و نظریات بدلے ہیں، مذاق اور مزاج بدلے ہیں، سوچنے کے انداز اور دیکھنے کے زاویے بدلے ہیں، تہذیب و اخلاق کے معیار اور قدر و قیمت کے پیمانے بدلے ہیں، زندگی کے طریقے اور معاملات کے ڈھنگ بدلے ہیں، اور کونسی چیز رہ گئی ہے جو بدل نہ گئی ہو۔ یہ سارا تغیر جو دیکھتے دیکھتے آپ کی اسی سرزمین میں ہوا اس کی اصلی وجہ آخر کیا ہے؟ کیا آپ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ اور بتلا سکتے ہیں کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں زمام کار تھی، اور رہنمائی و فرمانروائی کی باگوں پر جن کو قبضہ تھا انھوں نے پورے ملک کے اخلاق، اذہان، نفسیات، معاملات اور نظام تمدن کو اس سانچے میں ڈھال کر رکھ دیا جو ان کی اپنی پسند کے مطابق تھا؟ پھر جن طاقتوں نے اس تغیر کی مزاحمت کی، ذرا حساب کر دیکھیے کہ انھیں کامیابی کتنی ہوئی اور ناکامی کتنی۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ کل جو مزاحمت کی تحریک کے پیشوا تھے آج ان کی اولاد وقت کی رو میں بہی چلی جا رہی ہے اور ان کے گھروں تک میں وہی سب کچھ پہنچ گیا ہے جو گھروں سے باہر پھیل چکا تھا؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ مقدس ترین مذہبی پیشواؤں تک کی نسل سے وہ لوگ اٹھ رہے ہیں جنھیں خدا کے وجود اور وحی و رسالت کے امکان میں بھی شک ہے؟ اس مشاہدے اور تجربے کے بعد بھی کیا کسی کو اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں تامل ہو سکتا ہے کہ انسانی زندگی کے مسائل میں اصل فیصلہ کن مسئلہ زمام کار کا مسئلہ ہے؟ اور یہ اہمیت اس مسئلے نے کچھ آج ہی اختیار نہیں کی ہے بلکہ ہمیشہ سے اس کی یہی اہمیت رہی ہے۔ الناس علیٰ دین ملوکھم بہت پرانا مقولہ ہے اور اسی بنا پر حدیث میں قوموں کے بناؤ اور بگاڑ کا ذمہ دار ان کے علماء اور امراء کو قرار دیا گیا ہے کیونکہ لیڈرشپ اور زمام کار انہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔

اس تشریح کے بعد یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ دین میں اس مسئلہ کی کیا اہمیت ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اللہ کا دین اول تو یہ چاہتا ہے کہ لوگ بالکلیہ بندۂ حق بن کر رہیں اور ان کی گردن میں اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی کا حلقہ نہ ہو پھر وہ یہ چاہتا ہے کہ اللہ ہی کا قانون لوگوں کی زندگی کا قانون بن کر رہے۔ پھر اس کا مطالبہ یہ ہے کہ زمین سے فساد مٹایا جائے، ان منکرات کا استیصال کیا جائے جو اہل زمین پر اللہ کے غضب کے موجب ہوتے ہیں، اور ان خیرات و حسنات کو فروغ دیا جائے جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں۔ ان تمام مقاصد میں کوئی مقصد بھی اس طرح پورا نہیں ہو سکتا کہ نوع انسانی کی رہنمائی و قیادت اور معاملات انسانی کی سربراہ کاری ائمہ کفر و ضلال کے ہاتھوں میں ہو اور دین حق کے پیرو محض ان کے ماتحت رہ کر ان کی دی ہوئی رعایتوں اور گنجائشوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یاد خدا کرتے رہیں۔ یہ مقاصد تو لازمی طور پر اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ تمام اہل خیر و صلاح جو اللہ کی رضا کے طالب ہوں، اجتماعی قوت پیدا کریں اور سر دھڑ کی بازی لگا کر ایک ایسا نظام حق قائم کرنے کی سعی کریں جس میں امامت و رہنمائی اور قیادت و فرمانروائی کا منصب مومنین صالحین کے ہاتھوں میں ہو۔ اس چیز کے بغیر وہ مدعا حاصل ہی نہیں ہو سکتا جو دین کا اصل مدعا ہے۔ اسی لیے دین میں امامت صالحہ کے قیام اور نظام حق کی اقامت کو مقصدی اہمیت حاصل ہے، اور اس چیز سے غفلت برتنے کے بعد کوئی عمل ایسا نہیں ہو سکتا جس سے انسان اللہ تعالیٰ کی رضا کو پہنچ سکے۔ غور کیجیے کہ آخر قرآن و حدیث میں التزام جماعت اور سمع و طاعت پر اتنا زور کیوں دیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص جماعت سے خروج اختیار کرے تو وہ واجب القتل ہے خواہ وہ کلمۂ توحید کا قائل اور نماز روزہ کا پابند ہی کیوں نہ ہو؟ کیا

اس کی وجہ یہ اور صرف یہی نہیں ہے کہ امامت صالحہ اور نظام حق کا قیام و بقا دین کا حقیقی مقصود ہے، اور اس مقصد کا حصول اجتماعی طاقت پر موقوف ہے جو شخص اجتماعی طاقت کو نقصان پہنچاتا ہے وہ اتنے بڑے جرم کا ارتکاب کرتا ہے جس کی تلافی نہ نماز سے ہو سکتی ہے اور نہ اقرار توحید سے، پھر دیکھیے کہ آخر اس دین میں جہاد کو اتنی اہمیت کیوں دی گئی ہے کہ اس سے جی چرانے اور منہ موڑنے والوں پر قرآن مجید نفاق کا حکم لگاتا ہے؟ جہاد، نظام حق کی سعی کا ہی تو دوسرا نام ہے۔ اور قرآن اسی جہاد کو وہ کسوٹی قرار دیتا ہے جس پر آدمی کا ایمان پرکھا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر جس کے دل میں ایمان ہوگا وہ نہ تو نظام باطل کے تسلط پر راضی ہو سکتا ہے اور نہ نظام حق کے قیام کی جدوجہد میں جان و مال سے دریغ کر سکتا ہے، اور اگر کوئی اس معاملہ میں کمزوری دکھاتا ہے تو اس کا ایمان ہی مشتبہ ہے پھر بھلا کوئی دوسرا عمل اسے کیا نفع پہنچا سکتا ہے۔

اس وقت اتنا موقع نہیں ہے کہ میں آپ کے سامنے اس مسئلہ کی پوری تفصیل بیان کروں، مگر جو کچھ میں نے عرض کیا ہے وہ اس حقیقت کو ذہن نشین کرنے کے لیے بالکل کافی ہے کہ اسلام کے نقطۂ نظر سے امامت صالحہ کا قیام مرکزی اور مقصدی اہمیت رکھتا ہے، اور جو شخص اس دین پر ایمان لایا ہو اس کا کام صرف اتنے ہی پر ختم نہیں ہو جاتا کہ اپنی زندگی کو حتی الامکان اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرے، بلکہ عین اس کے ایمان ہی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنی تمام سعی و جہد کو اس ایک مقصد پر مرکوز کر دے کہ زمام کار کفار و فساق کے ہاتھ سے نکل کر صالحین کے ہاتھ میں آئے اور وہ نظام حق قائم ہو جائے جو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق دنیا کے انتظام کو درست رکھے۔ پھر چونکہ یہ مقصد اعلیٰ اجتماعی کوشش کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا اس لیے ایک ایسی جماعت صالحہ کا وجود ضروری ہے جو خود اصول حق کی پابند ہو اور نظام حق کو قائم کرنے، باقی رکھنے اور ٹھیک ٹھیک چلانے کے سوا دنیا میں کوئی دوسری غرض پیش نظر نہ رکھے۔ روئے زمین پر اگر صرف ایک ہی آدمی مومن ہو تب بھی اس کے لیے یہ درست نہیں ہے کہ اپنے آپ کو اکیلا پاکر اور ذرائع مفقود دیکھ کر نظام باطل کے تسلط پر راضی ہو جائے، یا "اھون البلیتین" کے شرعی حیلے تلاش کر کے غلبۂ کفر و فسق کے ماتحت کچھ آدھی پونی مذہبی زندگی کا سودا چکانا شروع کر دے، بلکہ اس کے لیے سیدھا اور صاف راستہ صرف یہی ایک ہے کہ بندگان خدا کو اس طریق زندگی کی طرف بلائے جو خدا کو پسند ہے۔ پھر اگر کوئی اس کی بات سن کر نہ دے تو اس کا ساری عمر صراط مستقیم پر کھڑے ہو کر لوگوں کو پکارتے رہنا اور پکارتے پکارتے مر جانا اس سے لاکھ درجہ بہتر ہے کہ وہ اپنی زبان سے وہ صدائیں بلند کرنے لگے جو ضلالت میں بھٹکی ہوئی دنیا کو مرغوب ہوں اور ان راہوں پر چل پڑے جن پر کفار کی امامت میں دنیا چل رہی ہو۔ اور اگر کچھ اللہ کے بندے اس کی بات سننے پر آمادہ ہو جائیں تو اس کے لیے لازم ہے کہ ان کے ساتھ مل کر ایک جتھا بنائے اور یہ جتھا اپنی تمام اجتماعی قوت اس مقصد عظیم کے لیے جدوجہد کرنے میں صرف کر دے جس کا میں ذکر کر رہا ہوں۔

حضرات! مجھے خدا نے دین کا جو تھوڑا بہت علم دیا ہے اور قرآن و حدیث کے مطالعہ سے جو کچھ بصیرت مجھے حاصل ہوئی ہے اس سے میں دین کا تقاضا یہی کچھ سمجھا ہوں۔ یہی میرے نزدیک کتاب الٰہی کا مطالبہ ہے، یہی انبیاء کی سنت ہے۔ اور میں اپنی اس رائے سے نہیں ہٹ سکتا جب تک کوئی خدا کی کتاب اور رسول کی سنت ہی سے مجھ پر یہ ثابت نہ کر دے کہ دین کا یہ تقاضا نہیں ہے۔

اپنی سعی کے اس مقصد و منتہا کو سمجھ لینے کے بعد اب ہمیں اس سنت اللہ کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے جس کے تحت ہم اس مقصود کو پا سکتے ہیں۔ یہ کائنات جس میں ہم رہتے ہیں، اس کو اللہ تعالیٰ نے ایک قانون پر بنایا ہے اور اس کی ہر چیز ایک لگے بندھے ضابطے پر چل رہی ہے۔ یہاں کوئی سعی محض پاکیزہ خواہشات اور اچھی نیتوں کی بنا پر کامیاب نہیں ہو سکتی اور نہ محض نفوس قدسیہ کی برکتیں ہی اس کو بارآور کر سکتی ہیں، بلکہ اس کے لیے ان شرائط کا پورا ہونا ضروری ہے جو اسی سعی کو بارآور کے لیے قانون الٰہی میں مقرر ہیں۔ آپ اگر زراعت کریں تو خواہ آپ کتنے ہی بزرگ صفت انسان ہوں اور تسبیح و تہلیل میں کتنا ہی مبالغہ کرتے ہوں، لیکن آپ کا پھینکا ہوا کوئی بیج بھی برگ و بار نہیں لا سکتا جب تک آپ اپنی سعی کاشتکاری میں اس قانون کی پوری پوری پابندی ملحوظ نہ رکھیں جو اللہ تعالیٰ نے کھیتوں کی بارآوری کے لیے مقرر کر دیا ہے۔ اسی طرح نظام امامت کا وہ انقلاب بھی جو اس وقت آپ کے پیش نظر ہے، کبھی محض دعاؤں اور پاک تمناؤں سے رونما نہ ہو سکے گا بلکہ اس کے لیے بھی ناگزیر ہے کہ آپ اس قانون کو سمجھیں اور اس کی ساری شرطیں پوری کریں جس کے تحت دنیا میں امامت قائم ہوتی ہے، کسی کو ملتی ہے اور کسی سے چھنتی ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی میں اس مضمون کو اپنی تحریروں اور تقریروں میں اشارۃً بیان کرتا رہا ہوں، لیکن آج میں اسے زیادہ تفصیل و تشریح کے ساتھ پیش کرنا چاہتا ہوں کیونکہ یہ وہ مضمون ہے جسے پوری طرح سمجھے بغیر ہمارے سامنے اپنی راہ عمل واضح نہیں ہو سکتی۔

انسان کی ہستی کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر دو مختلف حیثیتیں پائی جاتی ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف بھی ہیں اور باہم دگر ملی جلی بھی۔ اس کی ایک حیثیت تو یہ ہے کہ وہ اپنا ایک طبعی و حیوانی وجود رکھتا ہے جس پر وہی قوانین جاری ہوتے ہیں جو تمام طبعیات و حیوانات پر فرمانروائی کر رہے ہیں۔ اس وجود کی کارکردگی منحصر ہے ان آلات و وسائل پر، ان مادی ذرائع پر، اور ان طبعی حالات پر جن پر دوسری تمام طبعی اور حیوانی موجودات کی کارکردگی کا انحصار ہے۔ یہ وجود جو کچھ کر سکتا ہے قوانین طبعی کے تحت، آلات و وسائل کے ذریعہ سے اور طبعی حالات کے اندر ہی رہتے ہوئے کر سکتا ہے۔ اور اس کے کام پر عالم اسباب کی تمام قوتیں مخالف یا موافق اثر ڈالتی ہیں۔ دوسری حیثیت جو انسان کے اندر نمایاں نظر آتی ہے وہ اس کے انسان ہونے کی، یا بالفاظ دیگر ایک اخلاقی وجود ہونے کی حیثیت ہے۔

یہ اخلاقی وجود طبعیات کا تابع نہیں ہے بلکہ ان پر ایک طرح سے حکومت کرتا ہے۔ یہ خود انسان کے طبعی و حیوانی وجود کو بھی آلہ کے طور پر استعمال کرتا ہے اور خارجی دنیا کے اسباب کو بھی اپنا تابع بنانے اور ان سے کام لینے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی کارکن قوتیں وہ اخلاقی اوصاف ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انسان میں ودیعت فرمائے ہیں، اور اس پر فرمانروائی بھی طبعی قوانین کی نہیں بلکہ اخلاقی قوانین کی ہے۔

یہ دونوں حیثیتیں انسان کے اندر ملی جلی کام کر رہی ہیں اور مجموعی طور پر اس کی کامیابی و ناکامی اور اس کے عروج و زوال کا مدار مادی اور اخلاقی دونوں قسم کی قوتوں پر ہے۔ وہ بے نیاز تو نہ مادی قوت سے ہو سکتا ہے اور نہ اخلاقی قوت سے۔ اسے عروج ہوتا ہے تو دونوں کے بل پر ہوتا ہے اور وہ گرتا ہے تو اسی وقت گرتا ہے جب یہ دونوں طاقتیں اس کے ہاتھ سے جاتی رہتی ہیں، یا ان میں وہ دوسروں کی بہ نسبت کمزور ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر غائر نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسانی

زندگی میں اصل فیصلہ کن اہمیت اخلاقی طاقت کی ہے نہ کہ مادی کی۔ اس میں شک نہیں کہ مادی وسائل کا حصول، طبعی ذرائع کا استعمال اور اسباب خارجی کی موافقت بھی کامیابی کے لیے شرط لازم ہے اور جب تک انسان اس عالم طبعی ( ) میں رہتا ہے، یہ شرط کسی طرح ساقط نہیں ہو سکتی۔ مگر وہ اصل چیز جو انسان کو گراتی اور اٹھاتی ہی جسے اس کی قسمت کے بنانے اور بگاڑنے میں سب سے بڑھ کر دخل حاصل ہے وہ اخلاقی طاقت ہی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم جس چیز کی وجہ سے انسان کو انسان کہتے ہیں وہ اس کی جسمانیت یا حیوانیت نہیں بلکہ اس کی اخلاقیت ہے۔ آدمی دوسری موجودات سے جس خصوصیت کی بنا پر ممیز ہوتا ہے وہ یہ نہیں ہے کہ وہ جگہ گھیرتا ہے یا سانس لیتا ہے یا نسل کشی کرتا ہے، بلکہ اس کی وجہ امتیازی خصوصیت جو اسے ایک مستقل نوع ہی نہیں، خلیفۃ اللہ فی الارض بناتی ہے وہ اس کا اخلاقی اختیار ہے اور اخلاقی ذمہ داری کا حامل ہونا ہے۔ پس جب اصل جوہر انسانیت اخلاق ہے تو لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ اخلاقیات ہی کو انسانی زندگی کے بناؤ اور بگاڑ میں فیصلہ کن مقام حاصل ہے اور اخلاقی قوانین ہی انسان کے عروج و زوال پر فرمانروا ہیں۔

اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد جب ہم اخلاقیات کا تجزیہ کرتے ہیں تو وہ اصولی طور پر ہمیں دو بڑے شعبوں میں منقسم نظر آتے ہیں: ایک، بنیادی انسانی اخلاقیات۔ دوسرے، اسلامی اخلاقیات۔

بنیادی انسانی اخلاقیات سے مراد وہ اوصاف ہیں جن پر انسان کے اخلاقی وجود کی اساس قائم ہے اور ان میں وہ تمام صفات شامل ہیں جو دنیا میں انسان کی کامیابی کے لیے بہرحال شرط لازم ہیں خواہ وہ صحیح مقصد کے لیے کام کر رہا ہو یا غلط مقصد کے لیے۔ ان اخلاقیات میں اس سوال کا کوئی دخل نہیں ہے کہ آدمی خدا اور وحی اور رسول اور آخرت کو مانتا ہے یا نہیں، طہارت نفس اور نیت خیر اور عمل صالح سے آراستہ ہے یا نہیں، اچھے مقصد کے لیے کام کر رہا ہے یا برے مقصد کے لیے۔ قطع نظر اس سے کہ کسی میں ایمان ہو یا نہ ہو اور اس کی زندگی پاک ہو یا ناپاک، اور اس کی سعی کا مقصد اچھا ہو یا برا، جو شخص اور جو گروہ بھی اپنے اندر وہ اوصاف رکھتا ہوگا جو دنیا میں کامیابی کے لیے ناگزیر ہیں وہ یقیناً کامیاب ہوگا اور ان لوگوں سے بازی لے جائے گا جو ان اوصاف کے لحاظ سے اس کے مقابلہ میں ناقص ہوں گے۔ مومن ہو یا کافر، نیک ہو یا بد، مصلح ہو یا مفسد غرض جو بھی ہو، وہ اگر کارگر انسان ہو سکتا ہے تو صرف اسی صورت میں جبکہ اس کے اندر ارادے کی طاقت اور فیصلے کی قوت ہو، عزم اور حوصلہ ہو، صبر و ثبات اور استقلال ہو، تحمل اور برداشت ہو، ہمت اور شجاعت ہو، مستعدی و جفاکشی ہو، اپنے مقصد کا عشق اور اس کے لیے ہر چیز قربان کر دینے کا بل بوتا ہو، حزم و احتیاط اور معاملہ فہمی و تدبر ہو، باضابطگی کے ساتھ کام کرنے کا سلیقہ ہو، فرض شناسی اور احساس ذمہ داری ہو، حالات کو سمجھنے اور ان کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے اور مناسب تدبیر کرنے کی قابلیت ہو، اپنے جذبات و خواہشات اور ہیجانات پر قابو ہو، اور دوسرے انسانوں کو موہنے، ان کے دل میں جگہ پیدا کرنے اور ان سے کام لینے کی صلاحیت ہو۔ پھر ناگزیر ہے کہ اس کے اندر وہ شریفانہ خصائل بھی کچھ نہ کچھ موجود ہوں جو فی الحقیقت جوہر آدمیت ہیں اور جن کی بدولت آدمی کا وقار و اعتبار دنیا میں قائم ہوتا ہے۔ مثلاً خودداری، فیاضی، رحم، ہمدردی، انصاف، وسعت قلب و نظر، سچائی، امانت، راستبازی، پاس عہد، معقولیت، اعتدال، شائستگی، طہارت و نظافت، اور ذہن و نفس کا انضباط۔ یہ اوصاف اگر کسی قوم یا گروہ کے بیشتر افراد میں موجود ہوں تو گویا یوں سمجھیے کہ اس کے پاس وہ سرمایۂ انسانیت

موجود ہے جس سے ایک طاقتور اجتماعیت وجود میں آسکتی ہے۔ لیکن یہ سرمایہ مجتمع ہوکر بالفعل ایک مضبوط و مستحکم اور کارگر اجتماعی طاقت نہیں بن سکتا جب تک کہ کچھ دوسرے اخلاقی اوصاف بھی اس کی مدد پر نہ آئیں، مثلاً تمام یا بیشتر افراد کسی اجتماعی نصب العین پر متفق ہوں اور اس نصب العین کو اپنی انفرادی اغراض بلکہ اپنی جان مال اور اولاد سے بھی عزیز تر رکھیں، ان کے اندر آپس کی محبت اور ہمدردی ہو، انھیں مل کر کام کرنا آتا ہو، وہ اپنی خودی و نفسانیت کو کم از کم اس حد تک قربان کر سکیں جو منظم سعی کے لیے ناگزیر ہے، وہ صحیح و غلط رہنما میں تمیز کر سکتے ہوں اور موزوں آدمیوں ہی کو اپنا رہنما بنائیں، ان کے رہنماؤں میں اخلاص اور حسن تدبیر اور رہنمائی کی دوسری ضروری صفات موجود ہوں، اور خود قوم یا جماعت اپنے رہنماؤں کی اطاعت کرنا جانتی ہو۔ ان پر اعتماد رکھتی ہو اور اپنے تمام ذہنی، جسمانی اور مادی ذرائع ان کے تصرف میں دے دینے پر تیار ہو۔ نیز پوری قوم کے اندر ایسی زندہ اور حساس رائے عام پائی جاتی ہو جو کسی ایسی چیز کو اپنے اندر پنپنے نہ دے جو اجتماعی فلاح کے لیے نقصان دہ ہو۔

یہ ہیں وہ اخلاقیات جن کو میں "بنیادی انسانی اخلاقیات" کے لفظ سے تعبیر کرتا ہوں، کیونکہ فی الواقع یہی اخلاقی اوصاف انسان کی اخلاقی طاقت کا اصل منبع ہیں، اور انسان کسی مقصد کے لیے بھی دنیا میں کامیاب سعی نہیں کر سکتا جب تک کہ ان اوصاف کا زور اس کے اندر موجود نہ ہو۔ ان اخلاقیات کی مثال ایسی ہے جیسے فولاد کہ وہ اپنی ذات میں مضبوطی و استحکام رکھتا ہے، اور اگر کوئی کارگر ہتھیار بن سکتا ہے تو اسی سے بن سکتا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ غلط مقصد کے لیے استعمال ہو یا صحیح مقصد کے لیے۔ آپ کے پیش نظر صحیح مقصد ہو تب بھی تو آپ کے لیے مفید وہی ہتھیار ہو سکتا ہے جو فولاد سے بنا ہو، نہ کہ سڑی ہوئی پھس پھسی لکڑی سے جو ایک ذرا سے بوجھ اور معمولی سی چوٹ کی تاب بھی نہ لا سکتی ہو۔ یہی وہ بات ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں بیان فرمایا ہے کہ خیارکم فی الجاھلیۃ خیارکم فی الاسلام، "تم میں جو لوگ جاہلیت میں اچھے تھے وہی اسلام میں بھی اچھے ہیں"۔ یعنی زمانۂ جاہلیت میں جو لوگ اپنے اندر جوہر قابل رکھتے تھے وہی زمانۂ اسلام میں مردانِ کار ثابت ہوئے، فرق صرف یہ ہے کہ ان کی قابلیتیں پہلے غلط راہوں میں صرف ہو رہی تھیں اور اسلام نے آکر انھیں صحیح راہ پر لگا دیا۔ مگر بہرحال نا کارہ انسان نہ جاہلیت کے کسی کام کے تھے نہ اسلام کے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب میں جو زبردست کامیابی حاصل ہوئی اور جس کے اثرات تھوڑی ہی مدت گذرنے کے بعد دریائے سندھ سے لے کر اٹلانٹک کے ساحل تک دنیا کے ایک بڑے حصے نے محسوس کر لیے، اس کی وجہ یہی تو تھی کہ آپ کو عرب میں بہترین انسانی مواد مل گیا تھا جس کے اندر کیرکٹر کی زبردست طاقت موجود تھی۔ اگر خدانخواستہ آپ کو بودے، کم ہمت، ضعیف الارادہ اور ناقابل اعتماد لوگوں کی بھیڑ مل جاتی تو کیا پھر بھی وہ نتائج نکل سکتے تھے؟

اب اخلاقیات کے دوسرے شعبے کو لیجیے جسے میں "اسلامی اخلاقیات" کے لفظ سے تعبیر کر رہا ہوں۔ یہ بنیادی انسانی اخلاقیات سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اسی کی تصحیح اور تکمیل ہے۔

اسلام کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ بنیادی انسانی اخلاقیات کو ایک صحیح مرکز و محور مہیا کر دیتا ہے جس سے وابستہ ہو کر وہ سراپا خیر بن جاتے ہیں۔ اپنی ابتدائی صورت میں یہ اخلاقیات مجرد ایک قوت ہیں، جو خیر بھی ہو سکتی ہے اور شر بھی۔ جس طرح تلوار کا حال ہے کہ وہ بس ایک کاٹ ہے جو ڈاکو کے ہاتھ میں جاکر آلۂ ظلم بھی بن سکتی ہے اور مجاہد فی سبیل اللہ کے ہاتھ میں جاکر وسیلۂ خیر بھی۔ اسی طرح ان اخلاقیات کی طاقت بھی کسی شخص یا گروہ میں ہونا بجائے خود خیر نہیں ہے بلکہ اس کا

خیر ہونا موقوف ہے اس امر پر کہ یہ قوت صحیح راہ میں صرف ہو۔ یہ اس کو صحیح راہ پر لگانے کی خدمت اسلام انجام دیتا ہے۔ اسلام کی دعوتِ توحید کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ دنیا کی زندگی میں انسان کی تمام کوششوں اور محنتوں اور دوڑ دھوپ کا مقصد وحید اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہو۔ ﴿اللّٰھم لک نسعیٰ ونحفد﴾۔ اور اس کا پورا دائرہ فکر و عمل ان حدود سے محدود ہو جائے جو اللہ نے اس کے لیے مقرر کر دی ہیں۔ ﴿ایاک نعبد ولک نصلی ونسجد﴾۔ اس اساسی اصلاح کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ تمام بنیادی اخلاقیات جن کا ابھی میں نے آپ سے ذکر کیا ہے، صحیح راہ پر لگ جاتے ہیں اور وہ قوت جو ان اخلاقیات کی موجودگی سے پیدا ہوتی ہے بجائے اس کے کہ نفس یا خاندان یا قوم یا ملک کی سربلندی پر ہر ممکن طریقے سے صرف ہو، خالص حق کی سربلندی پر صرف جائز طریقوں سے صرف ہونے لگتی ہے۔ یہی چیز اس کو ایک مجرد قوت کے مرتبے سے اٹھا کر ایک بھلائی اور دنیا کے لیے ایک رحمت بنا دیتی ہے۔

دوسرا کام جو اخلاق کے باب میں اسلام کرتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ بنیادی انسانی اخلاقیات کو مستحکم بھی کرتا ہے اور پھر ان کے اطلاق کو انتہائی حدود تک وسیع بھی کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر صبر کو لیجیے۔ بڑے سے بڑے صابر آدمی میں بھی جو محض دنیوی اغراض کے لیے ہو اور جسے شرک یا مادہ پرستی کی فکری جڑوں سے غذا مل رہی ہو، اس کے برداشت اور اس کے ثبات و قرار کی ایک حد ہوتی ہے جس کے بعد وہ گھبرا اٹھتا ہے۔ لیکن جس صبر کو توحید کی جڑ سے غذا ملے اور جو دنیا کے لیے نہیں بلکہ اللہ رب العٰلمین کے لیے ہو، وہ تحمل و برداشت اور پامردی کا ایک اتھاہ خزانہ ہوتا ہے جسے دنیا کی تمام ممکن مشکلات مل کر بھی لوٹ نہیں سکتیں۔ پھر غیر مسلم کا صبر نہایت محدود نوعیت کا ہوتا ہے۔ اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ ابھی تو گولوں اور گولیوں کی بوچھاڑ میں نہایت استقلال کے ساتھ ڈٹا ہوا تھا، اور ابھی جو جذبات شہوانی کی تسکین کا کوئی موقع سامنے آیا تو وہ نفس امارہ کی ایک معمولی تحریک کے مقابلہ میں بھی نہ ٹھہر سکا۔ لیکن اسلام صبر کو انسان کی پوری زندگی میں پھیلا دیتا ہے اور اسے صرف خطرات، مصائب اور مشکلات ہی کے مقابلہ میں نہیں بلکہ تمام ایسے لالچوں، خطروں، اندیشوں اور خواہشوں کے مقابلہ میں بھی ٹھہراؤ کی ایک ایسی زبردست طاقت بنا دیتا ہے جو آدمی کو راہ راست سے ہٹانے والے ہوں۔ درحقیقت اسلام مومن کی پوری زندگی کو ایک صابرانہ زندگی بناتا ہے جس کا بنیادی اصول ہی یہ ہے کہ عمر بھر صحیح طرز خیال اور صحیح طرز عمل پر قائم رہو خواہ اس میں کتنے ہی خطرات و نقصانات اور مشکلات ہوں اور اس دنیا کی زندگی میں اس کا کوئی مفید نتیجہ نکلتا نظر نہ آئے، اور کبھی فکر و عمل کی برائی نہ اختیار کرو خواہ فائدوں اور امیدوں کا کیسا ہی خوشنما سبز باغ تمہارے سامنے لہلہا رہا ہو۔ یہ آخرت کے قطعی نتائج کی توقع پر دنیا کی ساری زندگی میں بدی سے رکنا اور خیر کی راہ پر جم کر چلنا اسلامی صبر ہے اور اس کا ظہور ان تمام شکلوں میں بھی ہوتا ہے جو بہت محدود پیمانے پر کفار کی زندگی میں نظر آتی ہیں۔ اسی خیال پر دوسرے تمام بنیادی اخلاقیات کو بھی آپ قیاس کر سکتے ہیں جو کفار کی زندگی میں صحیح فکری بنیاد نہ ہونے کی وجہ سے ضعیف اور محدود ہوتے ہیں اور اسلام ان سب کو ایک صحیح بنیاد دے کر محکم بھی کرتا ہے اور وسیع بھی کر دیتا ہے۔

اسلام کا تیسرا کام یہ ہے کہ وہ بنیادی اخلاقیات کی ابتدائی منزل پر اخلاق فاضلہ کی ایک نہایت شاندار بالا منزل تعمیر کرتا ہے جس کی بدولت انسان اپنے شرف کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ جاتا ہے۔ وہ اس کے نفس کو خود غرضی سے نفسا...

ے، ظلم سے، بے حیائی اور خلاعت و بے قیدی سے پاک کر دیتا ہے۔ اس میں خدا ترسی، تقویٰ و پرہیزگاری، اور حق پرستی پیدا کرتا ہے۔ اس کے اندر اخلاقی ذمہ داریوں کا شعور و احساس ابھارتا ہے، اس کو ضبط نفس کا خوگر بناتا ہے، اسے تمام مخلوقات کے لیے کریم، فیاض، رحیم، ہمدرد، امین، بے غرض خیر خواہ، بے لوث منصف، اور ہر حال میں صادق و راستباز بنا دیتا ہے، اور اس میں ایک ایسی بلند پایہ سیرت پرورش کرتا ہے جس سے ہمیشہ صرف بھلائی ہی متوقع ہو اور برائی کا کوئی اندیشہ نہ ہو۔ پھر اسلام آدمی کو محض نیک ہی بنانے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ حدیث رسول کے الفاظ میں وہ اسے مفتاحٌ للخیر مغلاقٌ للشر، یعنی بھلائی کا دروازہ کھولنے والا اور برائی کا دروازہ بند کرنے والا بناتا ہے۔ یعنی وہ ایجابا یہ مشن اس کے سپرد کرتا ہے کہ دنیا میں بھلائی پھیلائے اور برائی کو روکے۔ اس سیرت و اخلاق میں فطرۃً وہ حسن ہے۔ وہ کشش ہے۔ وہ بلا کی قوت تسخیر ہے کہ اگر کوئی منظم جماعت اس سیرت کی حامل ہو اور عملاً اپنے اس مشن کے لیے سعی کرے، جو اسلام نے اس کے سپرد کیا ہے، تو اس کی جہانگیری کا مقابلہ کرنا دنیا کی کسی قوت کے بس کا کام نہیں ہے۔

اب میں چند الفاظ میں اس سنت اللہ کو بیان کیے دیتا ہوں جو امامت کے باب میں ابتدائے آفرینش سے جاری ہے اور جب تک نوع انسانی اپنی موجودہ فطرت پر زندہ ہے اس وقت تک برابر جاری رہے گی۔ اور وہ یہ ہے کہ:

(۱) اگر دنیا میں کوئی منظم انسانی گروہ ایسا موجود نہ ہو جو اسلامی اخلاقیات اور بنیادی انسانی اخلاقیات دونوں سے آراستہ ہو اور پھر مادی اسباب و وسائل بھی استعمال کرے تو دنیا کی امامت و قیادت لازماً کسی ایسے گروہ کے قبضے میں دے دی جاتی ہے جو بنیادی انسانی اخلاقیات اور مادی اسباب و وسائل کے اعتبار سے دوسروں کی بہ نسبت زیادہ بڑھا ہوا ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ بہرحال اپنی دنیا کا انتظام چاہتا ہے اور یہ انتظام اسی گروہ کے سپرد کیا جاتا ہے جو موجود الوقت گروہوں میں اہل تر ہو۔

(۲) لیکن اگر کوئی منظم گروہ ایسا موجود ہو جو اسلامی و انسانی اخلاقیات اور بنیادی اخلاقیات دونوں میں باقی ماندہ انسانی دنیا پر فضیلت رکھتا ہو، اور وہ مادی اسباب و وسائل کے استعمال میں بھی کوتاہی نہ کرے، تو یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ اس کے مقابلہ میں کوئی دوسرا گروہ دنیا کی امامت و قیادت پر قابض رہ سکے۔ ایسا ہونا فطرت کے خلاف ہے۔ اللہ کی اس سنت کے خلاف ہے جو انسانوں کے معاملہ میں اس نے مقرر کر رکھی ہے۔ ان وعدوں کے خلاف ہے جو اللہ نے اپنی کتاب میں مومنین صالحین سے کیے ہیں، اور اللہ ہرگز فساد پسند نہیں ہے کہ اس کی دنیا میں ایک صالح گروہ انتظام عالم کو ٹھیک ٹھیک اس کی رضا کے مطابق درست رکھنے والا موجود ہو اور پھر بھی وہ مفسدوں ہی کے ہاتھ میں اس نظام کی باگ ڈور رہنے دے۔ مگر یہ خیال رہے کہ اس نتیجے کا ظہور صرف اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ ایک جماعت صالحہ ان اوصاف کی موجود ہو۔ کسی ایک صالح فرد، یا متفرق طور پر بہت سے صالح افراد موجود ہونے سے استخلاف فی الارض کا نظام تبدیل نہیں ہو سکتا، خواہ وہ افراد اپنی جگہ کیسے ہی زبردست اولیا اللہ بلکہ پیغمبر ہی کیوں نہ ہوں۔ اللہ نے استخلاف کے متعلق جتنے وعدے بھی کیے ہیں، منتشر و متفرق افراد سے نہیں بلکہ ایک ایسی جماعت سے کیے ہیں جو دنیا میں اپنے آپ کو عملاً خیر امۃ اور امۃ وسطاً ثابت کر دے۔ نیز یہ بھی ذہن نشین رہے کہ ایسے ایک گروہ کے محض وجود میں آجانے ہی سے نظام امامت میں تغیر واقع نہ ہو جائے گا کہ ادھر وہ بنے اور ادھر اچانک آسمان سے کچھ فرشتے اتریں اور فساق و فجار

کو اقتدار کی گدی سے ہٹا کر انھیں مسند نشین کر دیں، بلکہ اس جماعت کو کفر و فسق کی طاقتوں سے زندگی کے ہر میدان میں ہر ہر قدم پر کشمکش اور مجاہدہ کرنا ہوگا اور اقامت حق کی راہ میں ہر قسم کی قربانیاں دے کر اپنی محبت حق اور اپنی اہلیت کا ثبوت دینا پڑے گا۔ یہ ایسی شرط ہے جس سے انبیاء تک مستثنیٰ نہ رکھے گئے کجا کہ آج کوئی اس سے مستثنیٰ ہونے کی توقع کرے۔

(۳) مادی طاقت اور اخلاقی طاقت کے تناسب کے باب میں قرآن اور تاریخ کے غائر مطالعہ سے جو سنت اللہ میں سمجھا ہوں وہ یہ ہے کہ جہاں اخلاقی طاقت کا سارا انحصار صرف بنیادی انسانی اخلاقیات پر ہو وہاں مادی وسائل بڑی اہمیت رکھتے ہیں، حتیٰ کہ اس امر کا بھی امکان ہے کہ اگر ایک گروہ کے پاس مادی وسائل کی طاقت بہت زیادہ ہو تو وہ تھوڑی اخلاقی طاقت سے بھی دنیا پر چھا جاتا ہے اور دوسرے گروہ اخلاقی طاقت میں فائق تر ہونے کے باوجود محض وسائل کی کمی کے باعث دبے رہتے ہیں لیکن جہاں اخلاقی طاقت میں اسلامی اور بنیادی، دونوں قسم کے اخلاقیات کا پورا زور شامل ہو وہاں مادی وسائل کے انتہائی کمی کے باوجود اخلاق کو آخرکار ان تمام طاقتوں پر غلبہ حاصل ہو کر رہتا ہے جو مجرد بنیادی اخلاقیات اور مادی سروسامان کے بل بوتے پر اٹھی ہوں۔ اس نسبت کو یوں سمجھیے کہ بنیادی اخلاقیات کے ساتھ اگر سو درجے مادی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے تو اسلامی اور بنیادی اخلاقیات کی مجموعی قوت کے ساتھ صرف ۲۵ درجے مادی طاقت کافی ہو جاتی ہے۔ باقی ۷۵ فی صدی قوت کی کمی کو محض اسلامی اخلاق کا زور پورا کر دیتا ہے۔ بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کا تجربہ تو یہ بتاتا ہے کہ اسلامی اخلاق اگر اس پیمانے کا ہو جو حضور اور آپ کے صحابہ کا تھا تو صرف پانچ فیصدی مادی طاقت سے بھی کام چل جاتا ہے۔ یہی حقیقت ہے جس کی طرف آیت اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ میں ارشاد کیا گیا ہے۔

یہ آخری بات جو میں نے عرض کی ہے اسے محض خوش عقیدگی پر محمول نہ کیجیے اور نہ یہ گمان کیجیے کہ میں کسی معجزہ و کرامت کا آپ سے ذکر کر رہا ہوں۔ نہیں، یہ بالکل ایک فطری حقیقت ہے جو اس عالم اسباب میں قانون علت و معلول کے تحت پیش آتی ہے اور ہر وقت رونما ہو سکتی ہے اگر اس کی علت موجود ہو۔ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ آگے بڑھنے سے پہلے چند الفاظ میں اس کی تشریح کر دوں کہ اسلامی اخلاقیات سے (جن میں بنیادی اخلاقیات خود بخود شامل ہیں) مادی اسباب کی ۷۵ فی صدی بلکہ ۹۵ فی صدی تک کمی کس طرح پوری ہو جاتی ہے۔ اس چیز کو سمجھنے کے لیے آپ ذرا خود اپنے زمانہ ہی کی بین الاقوامی صورت حال پر ایک نگاہ ڈال کر دیکھیے۔ ابھی آپ کے سامنے وہ فساد عظیم جو آج سے ساڑھے پانچ سال پہلے ہوا تھا جرمنی کی شکست پر ختم ہوا ہے اور جاپان کی شکست بھی قریب نظر آ رہی ہے جہاں تک بنیادی اخلاقیات کا تعلق ہے، ان کے اعتبار سے اس فساد کے دونوں فریق تقریباً مساوی ہیں، بلکہ بعض پہلوؤں سے جرمنی اور جاپان نے اپنے حریفوں کے مقابلہ میں زیادہ زبردست اخلاقی طاقت کا ثبوت دیا ہے۔ جہاں تک علوم طبیعی اور ان کے عملی استعمال کا تعلق ہے اس میں بھی دونوں فریق برابر ہیں، بلکہ اس معاملہ میں کم از کم جرمنی کی فوقیت تو کسی سے مخفی نہیں ہے۔ مگر صرف ایک چیز ہے جس میں ایک فریق دوسرے فریق سے بہت زیادہ بڑھا ہوا ہے، اور وہ ہے

مادی اسباب کی موافقت۔ اس کے پاس آدمی اپنے دونوں حریفوں سے کئی گنے زیادہ ہیں اس کو مادی وسائل ان کی بہ نسبت بدرجہا زیادہ حاصل ہیں۔ اُس کی جغرافی پوزیشن ان سے بہتر ہے اور اس کو تاریخی اسباب نے ان کے مقابلہ میں بہت زیادہ بہتر حالات فراہم کر دیے ہیں۔ اسی وجہ سے اس کو فتح نصیب ہوئی ہے، اور اسی وجہ سے آج کسی ایسی قوم کے لیے بھی جس کی تعداد کم ہو اور جس کی دسترس میں مادی وسائل کم ہوں، اس امر کا امکان نظر نہیں آتا کہ وہ کثیر التعداد اور کثیر الوسائل قوموں کے مقابلہ میں سر اٹھا سکے، خواہ وہ بنیادی اخلاقیات میں اور طبعی علوم کے استعمال میں ان سے کچھ بڑھ ہی کیوں نہ جائے۔ اس لیے کہ بنیادی اخلاق اور طبعی علوم کے بل پر اٹھنے والی قوم کا معاملہ دو حال سے خالی نہیں ہو سکتا۔ یا تو وہ خود اپنی قومیت کی پرستار ہوگی اور دنیا کو اپنے لیے مسخر کرنا چاہے گی یا پھر وہ کچھ عالمگیر اصولوں کی حامی بن کر اٹھے گی اور دوسری قوموں کو ان کی طرف دعوت دے گی۔ پہلی صورت میں تو اس کے لیے کامیابی کی کوئی شکل بجز اس کے ہے ہی نہیں کہ وہ مادی طاقت اور وسائل میں دوسروں سے فائق تر ہو، کیونکہ وہ تمام قومیں جن پر اس کی اس حرص اقتدار کی زد پڑ رہی ہوگی، انتہائی غصہ و نفرت کے ساتھ اس کی مزاحمت کریں گی اور اس کا راستہ روکنے میں اپنی حد تک کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گی۔ رہی دوسری صورت تو اس میں بلاشبہ اس کا امکان تو ضرور ہے کہ قوموں کے دل اور دماغ خود بخود اس کی اصولی دعوت سے مسخر ہوتے چلے جائیں اور اسے مزاحمتوں کو راستے سے ہٹانے میں بہت تھوڑی قوت استعمال کرنی پڑے۔ لیکن یہ یاد رہنا چاہیے کہ دل صرف چند خوش آیند اصولوں ہی سے مسخر نہیں ہو جایا کرتے بلکہ انھیں مسخر کرنے کے لیے وہ حقیقی خیر خواہی، نیک نیتی، راستبازی، بے غرضی، فراخ دلی، فیاضی، ہمدردی، اور شرافت و عدالت درکار ہے جو جنگ اور صلح، فتح اور شکست، دوستی اور دشمنی، تمام حالات کی کڑی آزمائشوں میں کھری اور بے لوث ثابت ہو، اور یہ چیز اخلاقِ فاضلہ کی اس بلند منزل سے تعلق رکھتی ہے جس کا مقام بنیادی اخلاقیات سے بہت برتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجرد بنیادی اخلاقیات اور مادی طاقت کے بل پر اٹھنے والے خواہ کھلے قوم پرست ہوں یا پوشیدہ قوم پرستی کے ساتھ کچھ عالمگیر اصولوں کی دعوت و حمایت کا ڈھونگ رچائیں، آخر کار اُن کی ساری جد و جہد اور کشمکش خالص شخصی یا طبقاتی یا قومی خود غرضی ہی پر آ ٹھیرتی ہے، جیسا کہ آج آپ امریکہ، اور برطانیہ اور روس کی سیاست خارجیہ میں نمایاں طور پر دیکھ سکتے ہیں۔ ایسی کشمکش میں یہ ایک بالکل فطری امر ہے کہ ہر قوم دوسری قوم کے مقابلہ میں ایک مضبوط چٹان بن کر کھڑی ہو جائے اور اپنی پوری اخلاقی و مادی طاقت اس کی مزاحمت میں صرف کر دے اور اپنے حدود میں اس کو ہرگز راہ دینے کے لیے تیار نہ ہو جب تک کہ مخالف کی برتر مادی قوت اس کو پیس کر نہ رکھ دے۔

اچھا، اب ذرا تصور کیجیے کہ اسی ماحول میں ایک ایسا گروہ (خواہ وہ ابتداءً ایک ہی قوم میں سے اٹھا ہو، مگر "قوم" کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک "جماعت" کی حیثیت سے اٹھا ہو) پایا جاتا ہے، جو شخصی طبقاتی اور قومی خود غرضیوں سے بالکل پاک ہے۔ اس کی سعی و جہد کی کوئی غرض اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ نوعِ انسانی کی فلاح چند اصولوں کی پیروی میں دیکھتا ہے اور انسانی زندگی کا نظام ان پر قائم کرنا چاہتا ہے۔ ان اصولوں پر جو سوسائٹی وہ بناتا ہے اس میں قومی و وطنی اور طبقاتی و نسلی امتیازات بالکل مفقود ہیں۔ تمام انسان اس میں یکساں حقوق اور مساوی حیثیت سے شامل ہو سکتے ہیں

اس میں رہنمائی و قیادت کا منصب ہر اس شخص یا مجموعۂ اشخاص کو حاصل ہو سکتا ہے جو ان اصولوں کی پیروی میں سب پر فوقیت لے جائے قطع نظر اس سے کہ اس کی نسلی و وطنی قومیت کچھ ہی ہو، حتیٰ کہ اس میں اس امر کا بھی امکان ہے کہ اگر مفتوح ایمان لاکر اپنے آپ کو صالح تر ثابت کر دے تو فاتح اپنی سرفروشیوں اور جانفشانیوں کے سارے ثمرات اس کے قدموں میں لاکر رکھ دے اور اس کو امام مان کر خود مقتدی بننا قبول کرلے۔ یہ گروہ جب اپنی دعوت لے کر اٹھتا ہے تو وہ لوگ جو اس کے اصولوں کو چلنے دینا نہیں چاہتے، اس کی مزاحمت کرتے ہیں اور اس طرح فریقین میں کشمکش شروع ہو جاتی ہے مگر اس کشمکش میں جتنی شدت بڑھتی جاتی ہے یہ گروہ اپنے مخالفوں کے مقابلہ میں اتنے ہی زیادہ افضل و اشرف اخلاق کا ثبوت دیتا چلا جاتا ہے۔ وہ اپنے طرز عمل سے ثابت کر دیتا ہے کہ واقعی وہ خلق اللہ کی بھلائی کے سوا کوئی دوسری غرض پیش نظر نہیں رکھتا۔ اس کی دشمنی اپنے مخالفوں کی ذات یا قومیت سے نہیں بلکہ صرف ان کی ضلالت و گمراہی سے ہے جسے وہ چھوڑ دیں تو وہ اپنے خون کے پیاسے دشمن کو بھی سینے سے لگا سکتا ہے۔ اسے لالچ ان کے مال و دولت یا ان کی تجارت و صنعت کا نہیں بلکہ خود انہی کی اخلاقی و روحانی فلاح کا ہے جو حاصل ہو جائے تو ان کی دولت انہی کو مبارک رہے۔ وہ سخت سے سخت آزمائش کے موقعوں پر جھوٹ، دغا اور مکر و فریب سے کام نہیں لیتا۔ ٹیڑھی چالوں کا جواب بھی سنجیدہ تدبیروں سے دیتا ہے۔ انتقام کے جوش میں بھی ظلم و زیادتی پر آمادہ نہیں ہوتا۔ جنگ کے سخت لمحوں میں بھی اپنے ان اصولوں کی پیروی نہیں چھوڑتا جن کی دعوت دینے کے لیے وہ اٹھا ہے۔ سچائی و وفائے عہد اور حسن معاملت پر ہر حال میں قائم رہتا ہے۔ بے لاگ انصاف کرتا ہے اور امانت و دیانت کے اس معیار پر پورا اترتا ہے جسے ابتداءً اس نے دنیا کے سامنے معیار کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔ مخالفین کی زانی، شرابی، جواری اور سنگدل بے رحم فوجوں سے جب اس گروہ کے خدا ترس، پاکباز، عبادت گذار، نیک دل اور رحیم و کریم مجاہدین کا مقابلہ پیش آتا ہے تو فرداً فرداً ان کی انسانیت اُن کی درندگی و حیوانیت پر فائق نظر آتی ہے۔ وہ ان کے پاس زخمی یا قیدی بن کر آتے ہیں تو یہاں ہر طرف نیکی شرافت اور پاکیزگیٔ اخلاق کا ماحول دیکھ کر ان کی آلودۂ نجاست روحیں بھی پاک ہونے لگتی ہیں، اور یہ وہاں گرفتار ہو جاتے ہیں تو ان کا جوہرِ انسانیت اس تاریک ماحول میں اور زیادہ چمک اٹھتا ہے۔ ان کو کسی علاقے پر غلبہ حاصل ہوتا ہے تو مفتوح آبادی کو انتقام کی جگہ عفو، ظلم و جور کی جگہ رحم و انصاف، شقاوت کی جگہ ہمدردی، تکبر و نخوت کی جگہ حلم و تواضع، گالیوں کی جگہ دعوتِ خیر و جھوٹے پروپیگنڈوں کی جگہ اصول حق کی تبلیغ کا تجربہ ہوتا ہے اور وہ یہ دیکھ کر عش عش کرنے لگتے ہیں کہ فاتح سپاہی نہ ان سے عورتیں مانگتے ہیں، نہ دبے چھپے مال ٹٹولتے پھرتے ہیں، نہ ان کے صنعتی رازوں کا سراغ لگاتے ہیں، نہ ان کی معاشی طاقت کو کچلنے کی فکر کرتے ہیں، نہ ان کی قومی عزت کو ٹھوکر مارتے ہیں بلکہ انہیں اگر کچھ فکر ہے تو یہ کہ جو ملک اب ان کے چارج میں ہے اس کے باشندوں میں سے کسی کی عصمت خراب نہ ہو، کسی کے مال کو نقصان نہ پہنچے، کوئی اپنے جائز حقوق سے محروم نہ ہو، کوئی بد اخلاقی ان کے درمیان پرورش نہ پاسکے اور اجتماعی ظلم و جور کسی شکل میں بھی وہاں باقی نہ رہے۔ بخلاف اس کے جب فریق مخالف کسی علاقہ میں گھس آتا ہے تو ساری آبادی اُس کی زیادتیوں، بے رحمیوں سے چیخ اٹھتی ہے۔ اب آپ خود ہی اندازہ کرلیں کہ ایسی لڑائی میں قوم پرستانہ

لڑائیوں کی بہ نسبت کتنا بڑا فرق واقع ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے مقابلہ میں بالا تر انسانیت کم تر مادی سر و سامان کے باوجود اپنے مخالفوں کی آہن پوش حیوانیت کو آخر کار شکست دے کر رہے گی، اخلاق فاضلہ کے ہتھیار توپ و تفنگ سے زیادہ دور مار ثابت ہوں گے، عین حالت جنگ میں دشمن دوستوں میں تبدیل ہوں گے، جسموں سے پہلے دل مسخر ہوں گے، آبادیاں لڑے بھڑے بغیر مفتوح ہو جائیں گی، اور یہ صالح گروہ جب ایک مرتبہ مٹھی بھر جمعیت اور تھوڑے سے سر و سامان کے ساتھ کام شروع کر دے گا تو رفتہ رفتہ خود مخالف کیمپ ہی سے اس کو جنرل، سپاہی، ماہرین فنون، اسلحہ، رسد، سامان جنگ سب کچھ حاصل ہوتے چلے جائیں گے۔

یہ جو کچھ میں عرض کر رہا ہوں یہ نرا قیاس اور اندازہ نہیں ہے بلکہ اگر آپکے سامنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے دور مبارک کی تاریخی مثال موجود ہو تو آپ پر واضح ہو جائے گا کہ فی الواقع اس سے پہلے یہی کچھ ہو چکا ہے اور آج بھی یہی کچھ ہو سکتا ہے بشرطیکہ کسی میں یہ تجربہ کرنے کی ہمت ہو۔

حضرات! مجھے توقع ہے کہ اس تقریر سے یہ حقیقت آپکے ذہن نشین ہو گئی ہوگی کہ طاقت کا اصل منبع اخلاقی طاقت ہے اور اگر دنیا میں کوئی منظم گروہ ایسا موجود ہو جو بنیادی اخلاقیات کے ساتھ اسلامی اخلاقیات کا زور بھی اپنے اندر رکھتا ہو تو یہ بات عقلاً محال اور فطرۃً غیر ممکن ہے کہ اس کی موجودگی میں کوئی دوسرا گروہ دنیا کی امامت و قیادت پر قابض رہ سکے۔ اس کے ساتھ مجھے امید ہے کہ آپنے یہ بھی اچھی طرح سمجھ لیا ہو گا کہ مسلمانوں کی موجودہ پست حالی کا اصل سبب کیا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جو لوگ نہ مادی وسائل سے کام لیں، نہ بنیادی وسائل سے کام لیں، نہ بنیادی اخلاقیات سے آراستہ ہوں اور نہ اجتماعی طور پر ان کے اندر اسلامی اخلاقیات ہی پائے جائیں وہ کسی طرح امامت کے منصب پر فائز نہیں رہ سکتے اور خدا کی اٹل بے لاگ سنت کا تقاضا یہی ہے کہ ان پر ایسے کافروں کو ترجیح دی جائے جو اسلامی اخلاقیات سے عاری سہی مگر کم از کم بنیادی اخلاقیات اور مادی وسائل کے استعمال میں تو اپنے آپ کو ان کی نسبت انتظام دنیا کے لیے اہل تر ثابت کر رہے ہیں۔ اس معاملہ میں اگر آپ کو کوئی شکایت ہو تو سنت اللہ سے نہیں بلکہ اپنے آپ سے ہونی چاہیے اور اس شکایت کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ آپ اب اپنی اس خامی کو دور کرنے کی فکر کریں جس نے آپ کو امام سے مقتدی اور پیش رو سے پس رو بنا کر چھوڑا ہے۔

اس کے بعد ضرورت ہے کہ میں صاف اور واضح طریقہ سے آپکے سامنے اسلامی اخلاقیات کی بنیادوں کو بھی پیش کر دوں، کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ اس معاملہ میں عام طور پر مسلمانوں کے تصورات بری طرح الجھے ہوئے ہیں اور اس الجھن کی وجہ سے بہت ہی کم آدمی یہ جانتے ہیں کہ اسلامی اخلاقیات فی الواقع کس چیز کا نام ہے اور اس پہلو سے انسان کی تربیت و تکمیل کے لیے کیا چیزیں کس ترتیب و تدریج کے ساتھ اس کے اندر پرورش کی جانی چاہییں۔

قرآن اور حدیث کی رو سے جس چیز کو ہم اسلامی اخلاقیات کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں وہ دراصل چار مراتب پر مشتمل ہے: ایمانؔ، اسلامؔ، تقویٰؔ، اور احسانؔ۔ یہ چاروں مراتب یکے بعد دیگرے اس فطری ترتیب پر واقع ہیں کہ ہر بعد کا مرتبہ پہلے مرتبے سے پیدا اور لازماً اسی پر قائم ہوتا ہے، اور جب تک نیچے والی منزل پختہ و مستحکم نہ ہو جائے دوسری منزل کی تعمیر کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔ اس پوری عمارت میں ایمان کو بنیادی کی حیثیت حاصل ہے، اس بنیاد پر اسلام کی منزل تعمیر ہوتی ہے، پھر اس کے اوپر تقویٰ اور سب کے اوپر احسان کی منزلیں اٹھتی ہیں۔ ایمان نہ ہو تو اسلام و تقویٰ یا احسان کا سرے سے کوئی امکان ہی نہیں۔ ایمان کمزور ہو تو اس پر کسی بالائی منزل کا بوجھ نہیں ڈالا جا سکتا، یا ایسی کوئی منزل تعمیر کر بھی دی جائے تو وہ بودی اور متزلزل ہو گی۔ ایمان محدود ہو تو جتنے حدود میں وہ محدود ہو گا، اسلام، تقویٰ

اور احسان بھی بس انہی محدود تنگ حدود رہیں گے۔ پس جب تک ایمان پوری طرح صحیح، پختہ اور وسیع نہ ہو کوئی مرد عاقل جو دین کا فہم رکھتا ہو، اسلام، تقویٰ یا احسان کی تعمیر کا خیال نہیں کر سکتا۔ اسی طرح تقویٰ سے پہلے اسلام اور احسان سے پہلے تقویٰ کی تصحیح، پختگی اور توسیع ضروری ہے۔ لیکن اکثر ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ اس فطری و اصولی ترتیب کو نظر انداز کر کے ایمان و اسلام کی تکمیل کے بغیر تقویٰ و احسان کی باتیں شروع کر دیتے ہیں، اور اس سے بھی زیادہ افسوسناک یہ ہے کہ بالعموم لوگوں کے ذہنوں میں ایمان و اسلام کا ایک نہایت محدود تصور جاگزیں ہے اس وجہ سے وہ سمجھتے ہیں کہ محض وضع قطع، لباس، نشست و برخاست، اکل و شرب اور ایسی ہی چند ظاہری چیزوں کو ایک مقرر نقشے پر ڈھال لینے سے تقویٰ کی تکمیل ہو جاتی ہے، اور پھر عبادات میں نوافل، اذکار، اَوْرَاد اور ایسے ہی بعض اعمال اختیار کر لینے سے احسان کا بلند مقام حاصل ہو جاتا ہے، حالانکہ بسا اوقات اسی تقویٰ اور احسان کے ساتھ ساتھ لوگوں کی زندگیوں میں ایسی صریح علامات بھی نظر آتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ابھی ان کا ایمان ہی سرے سے درست اور پختہ نہیں ہوا ہے۔ یہ غلطیاں جب تک موجود ہیں، کسی طرح یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ ہم اسلامی اخلاقیات کا نصاب پورا کرنے میں کبھی کامیاب ہو سکیں گے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ہمیں ایمان، اسلام، تقویٰ، اور احسان کے ان چاروں مراتب کا پورا پورا تصور بھی حاصل ہو اور اس کے ساتھ ہم ان کی فطری ترتیب کو بھی اچھی طرح سمجھ لیں۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے ایمان کو لیجیے جو اسلامی زندگی کی بنیاد ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ توحید و رسالت کے اقرار کا نام ایمان ہے اگر کوئی شخص اس کا اقرار کرے تو اس سے وہ قانونی شرط پوری ہو جاتی ہے جو دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کے لیے رکھی گئی ہے اور وہ اس کا مستحق ہو جاتا ہے کہ اس کے ساتھ مسلمانوں کا سا معاملہ کیا جائے۔ مگر کیا یہی سادہ اقرار، جو ایک قانونی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کافی ہے، اس غرض کے لیے بھی کافی ہو سکتا ہے کہ اسلامی زندگی کی ساری سہ منزلہ عمارت صرف اسی بنیاد پر قائم ہو سکے؟ لوگ ایسا ہی سمجھتے ہیں اور اسی لیے جہاں یہ اقرار موجود ہوتا ہے وہاں عملی اسلام اور تقویٰ اور احسان کی تعمیر شروع کر دی جاتی ہے جو اکثر ہوائی قلعے سے زیادہ پائیدار ثابت نہیں ہوتی۔ لیکن فی الواقع ایک مکمل اسلامی زندگی کی تعمیر کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ ایمان اپنی تفصیلات میں پوری طرح وسیع اور اپنی گہرائی میں اچھی طرح مستحکم ہو۔ اس کی تفصیلات میں سے جو شعبہ بھی چھوٹ جائے گا، اسلامی زندگی کا وہی شعبہ تعمیر ہونے سے رہ جائے گا، اور اس کی گہرائی میں جہاں بھی کسر رہ جائے گی اسلامی زندگی کی عمارت اسی مقام پر بودی ثابت ہوگی۔ مثال کے طور پر ایمان باللہ کو دیکھیے جو دین کی اولین بنیاد ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ خدا کا اقرار اپنی سادہ صورت سے گزر کر جب تفصیلات میں پہنچتا ہے تو اس کی بے شمار صورتیں بن جاتی ہیں۔ کہیں وہ صرف اس حد پر ختم ہو جاتا ہے کہ بے شک خدا موجود ہے اور وہ دنیا کا خالق ہے اور اپنی ذات میں اکیلا ہے۔ کہیں اس کی انتہائی وسعت بس اتنی ہوتی ہے کہ خدا ہمارا معبود ہے اور ہمیں اس کی پرستش کرنی چاہیے۔ کہیں خدا کی صفات اور اس کے حقوق و اختیارات کا تصور کچھ زیادہ وسیع ہو کر بھی وہ اس سے آگے نہیں بڑھتا کہ عالم الغیب، سمیع و بصیر، سمیع الدعوات و قاضی الحاجات اور پرستش کی تمام جزوی شکلوں کا مستحق ہونے میں خدا کا کوئی شریک نہیں ہے، اور یہ کہ "مذہبی معاملات" میں آخری سند خدا ہی کی کتاب ہے۔ ظاہر ہے کہ ان مختلف تصورات سے ایک ہی طرز کی زندگی نہیں بن سکتی بلکہ جو تصور جتنا محدود ہے، عملی زندگی اور اخلاق میں بھی لازماً اسلامی رنگ اتنا ہی محدود ہوگا، حتیٰ کہ جہاں عام مذہبی تصورات کے مطابق ایمان باللہ اپنی انتہائی وسعت پر پہنچ جائے گا وہاں بھی اسلامی زندگی اس سے آگے نہ بڑھ سکے گی کہ خدا کے باغیوں کی وفاداری اور خدا کی وفاداری ایک ہی ساتھ نباہی جائے،

یا نظامِ کفر اور نظامِ اسلام کو گڈمڈ کر کے ایک مرکب بنا لیا جائے۔ اسی طرح ایمان باللہ کی گہرائی کا پیمانہ بھی مختلف لوگوں میں مختلف ہے۔ کوئی خدا کا اقرار کرنے کے باوجود اپنی کسی معمولی سے معمولی چیز کو بھی خدا پر قربان کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا، کوئی بعض چیزوں سے خدا کو عزیز تر رکھتا ہے مگر بعض چیزیں اسے خدا سے عزیز تر ہوتی ہیں، کوئی اپنی جان و مال تک خدا پر قربان کر دیتا ہے مگر اپنے رجحانات نفس اور اپنے نظریات و افکار کی قربانی یا اپنی شہرت کی قربانی اسے گوارا نہیں ہوتی۔ ٹھیک ٹھیک اسی تناسب سے اسلامی زندگی کی پائیداری و ناپائیداری بھی متعین ہوتی ہے، اور انسان کا اسلامی اخلاق ٹھیک اسی مقام پر دغا دے جاتا ہے جہاں اس کے نیچے ایمان کی بنیاد کمزور رہ جاتی ہے۔ ایک مکمل اسلامی زندگی کی عمارت اگر اٹھ سکتی ہے تو صرف اسی اقرارِ توحید پر اٹھ سکتی ہے جو انسان کی پوری انفرادی و اجتماعی زندگی پر وسیع ہو، جس کے مطابق انسان اپنے آپ کو اور اپنی ہر چیز کو خدا کی ملک سمجھے، اس کو اپنا اور تمام دنیا کا ایک ہی جائز مالک، معبود، مطاع اور صاحب امر و نہی تسلیم کرے، اسی کو ہدایت کا سرچشمہ مانے، اور پورے شعور کے ساتھ اس حقیقت پر مطمئن ہو جائے کہ خدا کی اطاعت سے انحراف، یا اس کی ہدایت سے بے نیازی، یا اس کی ذات و صفات اور حقوق و اختیارات میں غیر کی شرکت جس پہلو اور جس رنگ میں بھی ہے سراسر ضلالت ہے۔ پھر اس عمارت میں استحکام اگر پیدا ہو سکتا ہے تو صرف اس وقت ہو سکتا ہے کہ آدمی پورے شعور اور پورے ارادے کے ساتھ یہ فیصلہ کر لے کہ وہ اور اس کا سب کچھ اللہ کا ہے اور اللہ ہی کے لیے ہے۔ اپنے معیارِ پسند اور ناپسند کو ختم کر کے اللہ کی پسند و ناپسند کے تابع کر دے۔ اپنی خودسری کو مٹا کر اپنے نظریات، خیالات، خواہشات، جذبات، اور اندازِ فکر کو اس علم کے مطابق ڈھال لے جو خدا نے اپنی کتاب میں دیا ہے۔ اپنی تمام ان وفاداریوں کو دریا برد کر دے جو خدا کی وفاداری کی تابع نہیں بلکہ اس کی مدمقابل بن سکتی ہوں۔ اپنے دل میں سب سے بلند مقام پر خدا کی محبت کو بٹھائے اور ہر اس بت کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نہاں خانۂ دل سے نکال پھینکے جو خدا کے مقابلہ میں عزیز تر ہونے کا مطالبہ کرتا ہو۔ اپنی محبت اور نفرت، اپنی دوستی اور دشمنی، اپنی رغبت اور کراہیت، اپنی صلح اور جنگ ہر چیز کو خدا کی مرضی میں اس طرح گم کر دے کہ اس کا نفس وہی چاہنے لگے جو خدا چاہتا ہے اور ہر اس سے بھاگنے لگے جو خدا کو ناپسند ہے۔ یہ ہے ایمان باللہ کا حقیقی مرتبہ اور آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ جہاں ایمان ہی ان حیثیات سے اپنی وسعت و ہمہ گیری اور اپنی پختگی و مضبوطی میں ناقص ہو وہاں تقویٰ یا احسان کا کیا امکان ہو سکتا ہے۔ کیا اس نقص کی کسر ڈاڑھیوں کے طول اور لباس کی تراش خراش یا تسبیح گردانی و تہجد خوانی سے پوری کی جا سکتی ہے؟

اسی پر دوسرے ایمانیات کو بھی قیاس کر لیجیے۔ نبوت پر ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک انسان کا نفس زندگی کے سارے معاملات میں نبی کو اپنا رہنما نہ مان لے اور اس کی رہنمائی کے خلاف یا اس سے آزاد جتنی رہنمائیاں ہوں ان کو رد نہ کر دے۔ کتاب پر ایمان اس وقت تک ناقص ہی رہتا ہے جب تک نفس میں کتاب اللہ کے بتائے ہوئے اصولِ زندگی کے سوا کسی دوسری چیز کے تسلط پر رضامندی کا شائبہ بھی باقی ہو یا اتباع ما انزل اللہ کو اپنی اور ساری دنیا کی زندگی کا قانون دیکھنے کے لیے قلب و روح کی بےچینی میں کچھ بھی کسر ہو۔ اسی طرح آخرت پر ایمان بھی مکمل نہیں کہا جا سکتا جب تک نفس پوری طرح آخرت کو دنیا پر ترجیح دینے اور اخروی قدروں کے مقابلہ میں دنیوی قدروں کو ٹھکرا دینے پر آمادہ نہ ہو جائے اور آخرت کی جوابدہی کا خیال اسے زندگی کی ہر راہ پر چلتے ہوئے قدم قدم پر کھٹکنے نہ لگے۔ یہ بنیادیں ہی جہاں پوری طرح موجود نہ ہوں آخر وہاں اسلامی زندگی کی عالیشان عمارت کس شے پر تعمیر ہوگی۔ جب لوگوں نے ان بنیادوں کی توسیع و تکمیل اور پختگی کے بغیر ہی تعمیرِ اخلاقِ اسلامی کو ممکن سمجھا تب ہی تو نوبت یہاں تک پہنچی کہ کتاب اللہ

کے خلاف فیصلہ کرنے والے جج، غیر شرعی قوانین کی بنیاد پر مقدمے لڑانے والے وکیل، نظام کفر کے ماتحت معاملات زندگی کا انتظام کرنے والے کارکن، کافرانہ اصول تمدن وسیاست پر زندگی کی تشکیل وتاسیس کے لیے لڑنے والے لیڈر اور پیرو، غرض سب کے لیے تقویٰ واحسان کے مراتب عالیہ کا دروازہ کھل گیا بشرطیکہ وہ اپنی زندگی کے ظاہری انداز واطوار کو ایک خاص نقشے پر ڈھال لیں، اور کچھ نوافل واذکار کی عادت ڈال لیں۔

ایمان کی یہ بنیادیں، جن کا ابھی میں نے آپ سے ذکر کیا ہے، جب مکمل اور گہری ہو جاتی ہیں، تب ان پر اسلام کی منزل تعمیر ہوتی ہے۔ اسلام دراصل ایمان کے عملی ظہور کا دوسرا نام ہے۔ ایمان اور اسلام کا باہمی تعلق ویسا ہی ہے جیسا بیج اور درخت کا تعلق ہوتا ہے۔ بیج میں جو کچھ اور جیسا کچھ موجود ہوتا ہے وہی درخت کی شکل میں ظاہر ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ درخت کا امتحان کر کے بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ بیج میں کیا تھا اور کیا نہ تھا۔ آپ یہ تصور کر سکتے ہیں کہ بیج نہ ہو اور درخت موجود ہو، اور نہ یہ ممکن ہے کہ بیج تو زمین میں ہو اور وہ اس میں موجود بھی ہو پھر بھی درخت پیدا نہ ہو۔ ایسا ہی معاملہ ایمان اور اسلام کا ہے۔ جہاں ایمان موجود ہو گا، لازماً اس کا ظہور آدمی کی عملی زندگی میں، اخلاق میں، برتاؤ میں، تعلقات میں، اٹھنے بیٹھنے میں، دوڑ دھوپ کے رخ میں، مذاق ومزاج کی افتاد میں، سعی وجہد کے راستوں میں، اوقات اور قوتوں اور قابلیتوں کے مصرف میں، غرض مظاہر زندگی کے ہر ہر جز میں ہو کر رہے گا۔ ان میں سے جس پہلو میں بھی اسلام کے بجائے غیر اسلام ظاہر ہو رہا ہو، یقین کر لیجیے کہ اس پہلو میں ایمان موجود نہیں ہے یا ہے تو بالکل بودا اور بے جان ہے۔ اور اگر عملی زندگی ساری کی ساری ہی غیر مسلمانہ شان سے بسر ہو رہی ہو، تو جان لیجیے کہ دل ایمان سے خالی ہے یا زمین اتنی بنجر ہے کہ ایمان کا بیج برگ وبار نہیں لا رہا ہے۔ بہر حال میں نے جہاں تک قرآن اور حدیث کو سمجھا ہے، یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ دل میں ایمان ہو اور عمل میں اسلام نہ ہو۔

(اس موقع پر ایک صاحب نے اٹھ کر پوچھا کہ ایمان اور عمل کو آپ ایک ہی چیز سمجھتے ہیں یا ان دونوں میں کچھ فرق ہے۔ اس کے جواب میں کہا:)

آپ تھوڑی دیر کے لیے اپنے ذہن سے ان بحثوں کو نکال دیں، جو فقہا اور متکلمین نے اس مسئلہ میں کی ہیں اور قرآن سے اس معاملہ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ قرآن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اعتقادی ایمان اور عملی اسلام لازم وملزوم ہیں۔ اللہ تعالیٰ جگہ جگہ ایمان اور عمل صالح کا ساتھ ساتھ ذکر کرتا ہے اور تمام اچھے وعدے جو اس نے اپنے بندوں سے کیے ہیں انہی لوگوں سے متعلق ہیں جو اعتقاداً مومن اور عملاً مسلم ہوں۔ پھر آپ دیکھیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں جہاں منافقین کو پکڑا ہے وہاں ان کے عمل ہی کی خرابیوں سے ان کے ایمان کے نقص پر دلیل قائم کی ہے اور عملی اسلام ہی کو حقیقی ایمان کی علامت ٹھیرایا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قانونی لحاظ سے کسی شخص کو کافر ٹھیرانے اور ملت سے اس کا رشتہ کاٹ دینے کا معاملہ دوسرا ہے اور اس میں انتہائی احتیاط ملحوظ رہنی چاہیے، مگر میں یہاں اس ایمان واسلام کا ذکر نہیں کر رہا ہوں جس پر دنیا میں فقہی احکام مترتب ہوتے نہیں، بلکہ یہاں ذکر اس ایمان واسلام کا ہے جو خدا کے ہاں معتبر ہے اور جس پر اخروی نتائج مترتب ہونے والے ہیں۔ قانونی نقطہ نظر کو چھوڑ کر حقیقت نفس الامری کے لحاظ سے اگر آپ دیکھیں گے تو یقیناً یہی پائیں گے کہ جہاں عملاً خدا کے آگے سپر اندازی اور سپردگی وحوالگی میں کمی ہے، جہاں نفس کی پسند خدا کی پسند سے مختلف ہے، جہاں خدا کی وفاداری کے ساتھ غیر کی وفاداری نبھ رہی ہے، جہاں اقامت دین کی سعی کے بجائے دوسرے مشاغل میں انہماک ہے، جہاں قوتیں اور محنتیں راہ خدا کے بجائے دوسری راہوں میں صرف ہو رہی ہیں، وہاں ضرور ایمان میں نقص ہے اور ظاہر ہے کہ ناقص ایمان پر تقویٰ اور احسان کی تعمیر نہیں ہو سکتی خواہ ظاہر کے اعتبار سے متقیوں کی سی وضع بنانے اور محسنین کے بعض اعمال کی نقل اتارنے کی ... ہی کوشش کی جائے۔ ظاہر فریب شکلیں اگر حقیقت کی روح سے خالی ہوں تو ان کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسی ایک نہایت خوبصورت

آدمی کی لاش بہترین وضع وہیئت میں موجود ہو مگر اس میں جان نہ ہو۔ اس خوبصورت لاش کی ظاہری شان سے دھوکا کھا کر آپ کچھ توقعات اس سے وابستہ کریں گے تو واقعات کی دنیا اپنے پہلے ہی امتحان میں اس کا ناکارہ ہونا ثابت کر دے گی اور تجربے سے آپ کو خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ ایک بدصورت مگر زندہ انسان ایک خوبصورت مگر بے روح لاش سے بہرحال زیادہ کارگر ہوتا ہے۔ ظاہر فریبیوں سے آپ اپنے نفس کو تو ضرور دھوکا دے سکتے ہیں، لیکن عالم واقعہ پر کچھ بھی اثر نہیں ڈال سکتے اور نہ خدا کی میزان ہی میں کوئی وزن حاصل کر سکتے ہیں۔ پس اگر آپ کو ظاہری نہیں بلکہ وہ حقیقی تقویٰ اور احسان مطلوب ہو جو دنیا میں دین کا بول بالا کرنے اور آخرت میں خیر کا پلڑا جھکانے کے لیے درکار ہے، تو میری اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے کہ اوپر کی یہ دونوں منزلیں کبھی نہیں اٹھ سکتیں جب تک ایمان کی بنیاد مضبوط نہ ہو جائے اور اس کی مضبوطی کا ثبوت عملی اسلام یعنی بالفعل اطاعت و فرمانبرداری سے نہ مل جائے۔

تقویٰ کی بات کرنے سے پہلے یہ سمجھنے کی کوشش کیجیے کہ تقویٰ ہے کیا چیز۔ تقویٰ حقیقت میں کسی وضع وہیئت اور کسی خاص طرز معاشرت کا نام نہیں ہے بلکہ دراصل وہ نفس کی اس کیفیت کا نام ہے جو خدا ترسی اور احساس ذمہ داری سے پیدا ہوتی ہے اور زندگی کے ہر پہلو میں ظہور کرتی ہے۔ حقیقی تقویٰ یہ ہے کہ انسان کے دل میں خدا کا خوف ہو، عبدیت کا شعور ہو، خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری و جواب دہی کا احساس ہو، اور اس بات کا زندہ ادراک موجود ہو کہ دنیا ایک امتحان گاہ ہے جہاں خدا نے ایک مہلتِ عمر دے کر مجھے بھیجا ہے اور آخرت میں میرے مستقبل کا فیصلہ بالکل اس چیز پر منحصر ہے کہ میں اس دیے ہوئے وقت کے اندر اس امتحان گاہ میں اپنی قوتوں اور قابلیتوں کو کس طرح استعمال کرتا ہوں، اس سروسامان میں کس طرح تصرف کرتا ہوں جو مشیت الٰہی کے تحت مجھے دیا گیا ہے، اور ان انسانوں کے ساتھ کیا معاملہ کرتا ہوں جن سے قضائے الٰہی نے مختلف حیثیتوں سے میری زندگی متعلق کر دی ہے۔ یہ احساس و شعور جس شخص کے اندر پیدا ہو جائے اُس کا ضمیر بیدار ہو جاتا ہے، اس کی دینی حس تیز ہو جاتی ہے، اس کو ہر وہ چیز کھٹکنے لگتی ہے جو خدا کی رضا کے خلاف ہو، اُس کے مذاق کو ہر وہ شے ناگوار ہونے لگتی ہے جو خدا کی پسند سے مختلف ہو۔ وہ اپنے نفس کا آپ جائزہ لینے لگتا ہے کہ میرے اندر کس قسم کے رجحانات و میلانات پرورش پا رہے ہیں۔ وہ اپنی زندگی کا خود محاسبہ کرنے لگتا ہے کہ میں کن کاموں میں اپنا وقت اور اپنی قوتیں صرف کر رہا ہوں۔ وہ صریح ممنوعات کو تو در کنار، مشتبہ امور میں بھی مبتلا ہوتے ہوئے خود بخود جھجکنے لگتا ہے۔ اس کا احساس فرض اسے مجبور کر دیتا ہے کہ تمام اوامر کو پوری فرمانبرداری کے ساتھ بجا لائے۔ اس کی خدا ترسی ہر اس موقع پر اس کے قدم میں لرزش پیدا کر دیتی ہے جہاں حدود اللہ سے تجاوز کا اندیشہ ہو۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی نگہداشت آپ سے آپ اس کا وتیرہ بن جاتی ہے اور اس خیال سے بھی اس کا ضمیر کانپ اٹھتا ہے کہ کہیں اس سے کوئی بات حق کے خلاف سرزد نہ ہو جائے۔ یہ کیفیت کسی ایک شکل یا کسی مخصوص دائرۂ عمل میں ہی ظاہر نہیں ہوتی بلکہ آدمی کے پورے طرز فکر اور اس کے تمام کارنامۂ زندگی میں اس کا ظہور ہوتا ہے اور اس کے اثر سے ایک ایسی ہموار و یک رنگ سیرت پیدا ہوتی ہے جس میں آپ ہر پہلو سے ایک ہی طرز کی پاکیزگی و صفائی پائیں گے۔ بخلاف اس کے جہاں تقویٰ اس چیز کا نام لیا گیا ہے کہ آدمی چند مخصوص شکلوں کی پابندی اور مخصوص طریقوں کی پیروی اختیار کرنے اور مصنوعی طور پر اپنے آپ کو ایک ایسے سانچے میں ڈھال لے جس کی پیمائش کی جا سکتی ہو، وہاں آپ دیکھیں گے کہ وہ چند اشکالِ تقویٰ جو گنا دی گئی ہیں، ان کی پابندی تو انتہائی اہتمام کے ساتھ ہو رہی ہے، مگر اس کے ساتھ زندگی کے دوسرے پہلوؤں میں وہ اخلاق، وہ طرز فکر اور وہ طرز عمل بھی ظاہر ہو رہے ہیں جو مقام تقویٰ تو درکنار، ایمان کے ابتدائی مقتضیات سے بھی مناسبت نہیں رکھتے، یعنی حضرت مسیحؑ کی تمثیلی زبان میں مچھر چھانے جا رہے ہیں اور اونٹ بے تکلف ... ساتھ نگلے جا رہے ہیں۔

حقیقی تقویٰ اور مصنوعی تقویٰ کے اس فرق کو یوں سمجھیے کہ ایک شخص تو وہ ہے جس کے اندر طہارت و نظافت کی حس موجود ہے اور

پاکیزگی کا ذوق پایا جاتا ہے۔ ایسا شخص گندگی سے فی نفسہٖ نفرت کرے گا خواہ وہ جس شکل میں بھی ہو اور طہارت کو بجائے خود اختیار کرے گا خواہ اس کے مظاہر کا احاطہ نہ ہو سکتا ہو۔ بخلاف اس کے ایک دوسرا شخص ہے جس کے اندر طہارت کی حس موجود نہیں ہے مگر وہ گندگیوں اور طہارتوں کی ایک فہرست لیے پھرتا ہے جو کہیں سے اس نے نقل کر لی ہیں۔ یہ شخص ان گندگیوں سے تو سخت اجتناب کرے گا جو اس کی فہرست میں لکھی ہوئی ہیں، مگر بے شمار ایسی گھناؤنی چیزوں میں آلودہ پایا جائے گا جو ان گندگیوں سے بدرجہا زیادہ ناپاک ہوں گی جن سے وہ بچ رہا ہے صرف اس وجہ سے کہ وہ اس کی فہرست میں درج ہونے سے رہ گئیں۔ یہ فرق جو میں آپ سے عرض کر رہا ہوں، یہ محض ایک نظری فرق نہیں ہے بلکہ آپ اس کو اپنی آنکھوں سے ان حضرات کی زندگیوں میں دیکھ سکتے ہیں جن کے تقویٰ کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ ایک طرف ان کے ہاں جزئیاتِ شرع کا یہ اہتمام ہے کہ داڑھی ایک خاص مقدار سے کچھ بھی کم ہو تو فسق کا فیصلہ نافذ کر دیا جاتا ہے، پائنچہ ٹخنے سے ذرا نیچے ہو جائے تو جہنم کی وعید سنا دی جاتی ہے، اپنے مسلک فقہی کے فروعی احکام سے ہٹنا ان کے نزدیک گویا دین سے نکل جانا ہے، لیکن دوسری طرف دین کے اصول و کلیات سے ان کی غفلت اس حد کو پہنچی ہوئی ہے کہ مسلمانوں کی پوری زندگی کا مدار انھوں نے رخصتوں اور سیاسی مصلحتوں پر رکھ دیا ہے، اقامت دین کی سعی سے گریز کی بے شمار راہیں انھوں نے نکال رکھی ہیں، غلبۂ کفر کے تحت "اسلامی زندگی" کے نقشے بنانے ہی میں ان کی ساری محنتیں اور کوششیں صرف ہو رہی ہیں، اور انہی کی غلط رہنمائی نے مسلمانوں کو اس چیز پر مطمئن کیا ہے کہ ایک غیر اسلامی نظام کے اندر رہتے ہوئے، بلکہ اس کی خدمت کرتے ہوئے بھی ایک محدود دائرے میں مذہبی زندگی بسر کر کے وہ دین کے سارے تقاضے پورے کر سکتے ہیں اور اس سے آگے کچھ مطلوب نہیں ہے جس کے لیے وہ سعی کریں۔ پھر اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ اگر کوئی ان کے سامنے دین کے اصلی مطالبے پیش کرے اور سعی اقامت دین کی طرف توجہ دلائے تو صرف یہی نہیں کہ وہ اس کی بات سنی ان سنی کر دیتے ہیں بلکہ کوئی حیلہ، کوئی بہانہ اور کوئی چال ایسی نہیں چھوڑتے جو اس کام سے خود بچنے اور مسلمانوں کو بچانے کے لیے استعمال نہ کریں۔ اس پر بھی ان کے تقویٰ پر کوئی آنچ نہیں آتی اور نہ مذہبی ذہنیت رکھنے والوں میں سے کسی کو یہ شک ہوتا کہ ان کے تقویٰ میں کوئی کسر ہے۔ اس کے علاوہ حقیقی اور مصنوعی تقویٰ کا فرق بے شمار دوسری شکلوں میں بھی ظاہر ہوتا رہتا ہے جسے آپ محسوس کر سکتے ہیں بشرطیکہ تقویٰ کا اصلی تصور آپ کے ذہن میں واضح طور پر موجود ہو۔

میری ان باتوں کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ وضع قطع، لباس اور معاشرت کے ظاہری پہلوؤں کے متعلق جو آداب و احکام حدیث سے ثابت ہیں، میں ان کا استخفاف کرنا چاہتا ہوں، یا انھیں غیر ضروری قرار دیتا ہوں۔ خدا کی پناہ اس سے کہ میرے دل میں ایسا کوئی خیال ہو۔ دراصل جو کچھ میں آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اصل شے حقیقت تقویٰ ہے نہ کہ مظاہر۔ حقیقت تقویٰ جس کے اندر پیدا ہو گی تو اس کی پوری زندگی ہمواری و یک رنگی کے ساتھ اسلامی زندگی بنے گی اور اسلام اپنی پوری ہمہ گیری کے ساتھ اس کے خیالات میں، اس کے جذبات و رجحانات میں، اس کے مذاقِ طبیعت میں، اس کے اوقات کی تقسیم اور اس کی قوتوں کے مصارف میں، اس کی سعی کی راہوں میں، اس کے طرز زندگی اور معاشرت میں، اس کی کمائی اور خرچ میں، غرض اس کی حیات دنیوی کے سارے ہی پہلوؤں میں رفتہ رفتہ نمایاں ہوتا چلا جائے گا۔ بخلاف اس کے اگر مظاہر کو حقیقت پر مقدم رکھا جائے گا اور ان پر بیجا زور دیا جائے گا اور حقیقی تقویٰ کی تخم ریزی و آبیاری کے بغیر مصنوعی طور پر چند ظاہری احکام کی تعمیل کرا دی جائے گی تو نتائج وہی کچھ ہوں گے جن کا میں نے ابھی آپ سے ذکر کیا ہے۔ پہلی چیز دیر طلب اور صبر آزما ہے، بتدریج نشوونما پاتی اور ایک مدت کے بعد برگ و بار لاتی ہے، جس طرح بیج سے درخت

کے پیدا ہونے اور پھل پھول لانے میں کافی دیر لگا کرتی ہے، اسی لیے عجلت پسند مزاج کے لوگ اس سے اکتاتے ہیں۔ بخلاف اس کے دوسری چیز جلدی اور آسانی سے پیدا کرلی جاتی ہے، جیسے ایک لکڑی میں پتے اور پھل اور پھول باندھ کر درخت کی سی شکل بنادی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ تقویٰ کی پیداوار کا یہی ڈھنگ آج مقبول ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ جو توقعات ایک فطری درخت سے پوری ہوتی ہیں وہ اس قسم کے مصنوعی درختوں سے کبھی پوری نہیں ہوسکتیں۔

اب احسان کو لیجیے جو اسلام کی بلند ترین منزل ہے۔ احسان دراصل اللہ اور اس کے رسول اور اس کے دین کے ساتھ انتہائی لگاؤ، اس گہری محبت، اس سچی وفاداری اور فدویت وجاں نثاری کا نام ہے جو مسلمان کو فنا فی الاسلام کردے۔ تقویٰ کا اساسی تصور خدا کا خوف ہے جو انسان کو اس کی ناراضی سے بچنے پر آمادہ کرے اور احسان کا اساسی تصور خدا کی محبت ہے جو آدمی کو اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ابھارے۔ ان دونوں چیزوں کے فرق کو ایک مثال سے یوں سمجھیے کہ حکومت کے ملازموں میں سے ایک تو وہ لوگ ہیں جو نہایت فرض شناسی وتن دہی سے وہ تمام خدمات ٹھیک ٹھیک بجالاتے ہیں جو ان کے سپرد کی گئی ہوں، تمام ضابطوں اور قاعدوں کی پوری پوری پابندی کرتے ہیں اور کوئی ایسا کام نہیں کرتے جو حکومت کے لیے قابل اعتراض ہو۔ دوسرا طبقہ ان مخلص وفاداروں اور جاں نثاروں کا ہوتا ہے جو دل وجان سے حکومت کے ہواخواہ ہوتے ہیں، صرف وہی خدمات انجام نہیں دیتے جو ان کے سپرد کی گئی ہوں بلکہ ان کے دل کو ہمیشہ یہ فکر لگی رہتی ہے کہ سلطنت کے مفاد کو زیادہ سے زیادہ کس طرح ترقی دی جائے، اور اس دھن میں فرض اور مطالبہ سے زائد کام کرتے ہیں، سلطنت پر کوئی آنچ آئے تو وہ جان ومال اور اولاد سب کچھ قربان کرنے کے لیے آمادہ ہوجاتے ہیں، قانون کی کہیں خلاف ورزی ہو تو ان کے دل کو چوٹ لگتی ہے، کہیں بغاوت کے آثار پائے جائیں تو وہ بے چین ہوجاتے ہیں اور اسے فرو کرنے میں جان لڑادیتے ہیں، جان بوجھ کر خود سلطنت کو نقصان پہنچانا تو درکنار اس کے مفاد کو کسی طرح نقصان پہنچتے دیکھنا بھی ان کے لیے ناقابل برداشت ہوتا ہے اور اس خرابی کے رفع کرنے میں وہ اپنی حد تک کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے، ان کی دلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ دنیا میں بس ان کی سلطنت ہی کا بول بالا ہو اور زمین کا کوئی چپہ ایسا باقی نہ رہے جہاں اس کا پھریرا نہ اڑے۔ ان دونوں میں پہلی قسم کے لوگ حکومت کے متقی ہیں، اور دوسری قسم کے لوگ اس کے محسن۔ اگرچہ ترقیاں متقین کو بھی ملتی ہیں اور بہرحال ان کے نام اچھے ہی ملازموں کی فہرست میں لکھے جاتے ہیں، مگر جو سرفرازیاں محسنین کے لیے ہیں ان میں کوئی دوسرا ان کا شریک نہیں ہوتا۔ پس اسی مثال پر اسلام کے متقیوں اور محسنوں کو بھی قیاس کرلیجیے۔ اگرچہ متقین بھی قابل قدر اور قابل اعتماد لوگ ہیں، مگر اسلام کی اصلی طاقت محسنین کا گروہ ہے اور وہ اصلی کام جو اسلام دنیا میں کرنا چاہتا ہے اسی گروہ سے بن آسکتا ہے۔

احسان کی اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد آپ خود ہی اندازہ کرلیں کہ جو لوگ اپنی آنکھوں سے خدا کے دین کو کفر سے مغلوب دیکھیں، جن کے سامنے حدود اللہ پامال ہی نہیں بلکہ کالعدم کردی جائیں، خدا کا قانون عملاً ہی نہیں بلکہ باضابطہ منسوخ کردیا جائے، خدا کی زمین پر خدا کا نہیں بلکہ اس کے باغیوں کا بول بالا ہو رہا ہو، نظام کفر کے تسلط سے نہ صرف عام انسانی سوسائٹی میں اخلاقی وتمدنی فساد برپا ہو بلکہ خود امت مسلمہ بھی نہایت سرعت کے ساتھ اخلاقی وعملی گمراہیوں میں مبتلا ہو رہی ہو، اور یہ سب کچھ دیکھ کر بھی ان کے دلوں میں نہ کوئی بے چینی پیدا ہو نہ اس حالت کو بدلنے کے لیے کوئی جذبہ بھڑکے بلکہ اس کے برعکس وہ اپنے نفس کو اور عام مسلمانوں کو غیر اسلامی نظام کے غلبے پر اصولاً وعملاً مطمئن کردیں، ان کا شمار آخر کار محسنین میں کس طرح ہوسکتا ہے

اور اس جرمِ عظیم کے ساتھ محض یہ بات انھیں احسان کے مقامِ عالی پر کیسے سرفراز کرسکتی ہے کہ وہ چاشت اور اشراق اور تہجد کے نوافل پڑھتے رہے۔ ذکر و شغل اور مراقبے کرتے رہے، حدیث و قرآن کے درس دیتے رہے، جزئیات فقہ کی پابندی اور چھوٹی چھوٹی سنتوں کے اتباع کا سخت اہتمام فرماتے رہے اور تزکیۂ نفس کی خانقاہوں میں دینداری کا وہ فن سکھاتے رہے جس میں حدیث و فقہ اور تصوف کی باریکیاں تو ساری موجود تھیں مگر ایک نہ تھی تو وہ حقیقی دینداری جو "سر داد نہ داد دست در دستِ یزید" کی کیفیت پیدا کرے اور "بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا" کے مقامِ وفاداری پر پہنچائے۔ آپ دنیوی ریاستوں اور قوموں میں بھی وفادار اور غیر وفادار کی اتنی تمیز ضرور نمایاں پائیں گے کہ اگر ملک میں بغاوت ہو جائے یا ملک کے کسی حصے پر دشمن کا قبضہ ہو جائے تو باغیوں اور دشمنوں کے تسلط کو جو لوگ جائز تسلیم کرلیں، یا ان کے تسلط پر راضی ہو جائیں، اور ان کے ساتھ مغلوبانہ مصالحت کرلیں، یا ان کی سرپرستی میں کوئی ایسا نظام بنائیں جس میں اصلی اقتدار کی باگیں انہی کے ہاتھ میں رہیں اور کچھ ضمنی حقوق و اختیارات انھیں بھی مل جائیں، تو ایسے لوگوں کو کوئی ریاست اور کوئی قوم اپنا وفادار ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتی خواہ وہ قومی فیشن کے کیسے ہی سخت پابند اور جزئی معاملات میں قومی قانون کے کتنے ہی شدید پیرو ہوں۔ آج آپ کے سامنے زندہ مثالیں موجود ہیں کہ جو ملک جرمنی کے تسلط سے نکلے ہیں وہاں ان لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ ہو رہا ہے جنھوں نے جرمن قبضے کے زمانے میں تعاون و مصالحت کی راہیں اختیار کی تھیں۔ ان سب ریاستوں اور قوموں کے پاس وفاداری کو جانچنے کا ایک ہی معیار ہے اور وہ یہ کہ کسی شخص نے دشمن کے تسلط کی مزاحمت کس حد تک کی، اس کو مٹانے کے لیے کیا کام کیا، اور اس اقتدار کو واپس لانے کی کیا کوشش کی جس کی وفاداری کا وہ مدعی تھا۔ پھر کیا معاذ اللہ خدا کے متعلق آپ کا یہ گمان ہے کہ وہ اپنے وفاداروں کو پہچاننے کی اتنی تمیز بھی نہیں رکھتا جتنی دنیا کے اِن کم عقل انسانوں میں پائی جاتی ہے؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ بس داڑھیوں کا طول، ٹخنوں اور پائنچوں کا فاصلہ، تسبیحوں کی گردش، اَوْراد و وظائف اور نوافل اور مراقبے کے مشاغل اور ایسی ہی چند اور چیزیں دیکھ کر ہی دھوکا کھا جائے گا کہ آپ اس کے سچے وفادار و جاں نثار ہیں؟

حضرات! اب میں ایک آخری بات کہہ کر اپنی تقریر ختم کروں گا۔ عام مسلمانوں کے ذہن پر مدتوں کے غلط تصورات کی وجہ سے جزئیات و ظواہر کی اہمیت کچھ اس طرح چھا گئی ہے کہ دین کے اصول و کلیات اور دینداری و اخلاقِ اسلامی کے حقیقی جوہر کی طرف خواہ کتنی ہی توجہ دلائی جائے، مگر لوگوں کے دماغ پھر پھر کر انہی چھوٹے چھوٹے مسائل اور اوراد اور انہی ظاہری چیزوں میں اٹک کر رہ جاتے ہیں جنھیں اصل دین بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس وبائے عام کے اثرات خود ہمارے بہت سے رفقا اور ہمدردوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ میں اپنا پورا زور یہ سمجھانے میں صرف کرتا رہا ہوں کہ دین کی حقیقت کیا ہے، اس میں اصل اہمیت کن چیزوں کی ہے، اور اس میں مقدم کیا ہے اور مؤخر کیا۔ لیکن ان ساری کوششوں کے بعد جب دیکھتا ہوں یہی دیکھتا ہوں کہ وہی ظاہر پرستی اور وہی اصول سے بڑھ کر فروع کی اہمیت دماغوں پر مسلط ہے۔ آج تین روز سے میرے پاس پرچوں کی بھرمار ہو رہی ہے جن میں سارا مطالبہ بس اس کا ہے کہ جماعت کے لوگوں کی داڑھیاں بڑھوائی جائیں، پائنچے ٹخنوں سے اونچے کرائے جائیں، اور ایسے ہی دوسرے جزئیات کا اہتمام کرایا جائے۔ اس کے علاوہ بعض لوگوں کے اس خیال کا بھی مجھے علم ہوا کہ انھیں جماعت میں اس چیز کی بڑی کمی محسوس ہوتی ہے جس کو وہ "روحانیت" سے تعبیر کرتے ہیں مگر شاید خود نہیں بتا سکتے کہ وہ فی الواقع ہے کیا شے۔ اس بنا پر ان کی رائے یہ ہے کہ نصب العین اور طریق کار تو اس جماعت کا اختیار کیا جائے اور تزکیۂ نفس و تربیتِ روحانی کے لیے خانقاہوں کی طرف

رجوع کیا جائے۔ یہ ساری باتیں صاف بتاتی ہیں کہ ابھی تک ہماری تمام کوششوں کے باوجود لوگوں میں دین کا فہم پیدا نہیں ہوا ہے۔ میں ابھی آپ کے سامنے ایمان، اسلام، تقویٰ اور احسان کی جو تشریح عرض کر چکا ہوں اس میں اگر کوئی چیز قرآن وحدیث کی تعلیم سے تجاوز کر کے میں نے خود وضع کر دی ہو تو آپ بے تکلف اس کی نشاندہی فرما دیں۔ لیکن اگر آپ تسلیم کرتے ہیں کہ کتاب اللہ وسنت رسول اللہ کی رو سے یہی ان چاروں چیزوں کی حقیقت ہے تو پھر خود ہی سوچیے کہ جہاں ایمان کے مقتضیات بھی پوری طرح متحقق نہ ہوں اور جہاں تقویٰ اور احسان کی جڑ ہی نہ پائی جاتی ہو وہاں آخر کون سی روحانیت پائی جا سکتی ہے جسے آپ تلاش کرنے جا رہے ہیں۔ رہے وہ جزئیات شرع جن کو آپ نے دین کے اولین مطالبات میں شمار کر رکھا ہے، تو ان کا حقیقی مقام میں آپ کے سامنے پھر ایک مرتبہ صاف صاف واضح کیے دیتا ہوں تاکہ میں اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاؤں۔

سب سے پہلے ٹھنڈے دل سے اس بات پر غور کیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول دنیا میں کس غرض کے لیے بھیجے ہیں۔ دنیا میں آخر کس چیز کی کمی تھی، کیا خرابی پائی جاتی تھی، جسے رفع کرنے کے لیے انبیاء کو مبعوث کرنے کی ضرورت پیش آئی؟ کیا وہ یہ تھی کہ لوگ داڑھیاں نہ رکھتے تھے اور انھیں رکھوانے کے لیے رسول بھیجے گئے؟ یا یہ کہ لوگ ٹخنے ڈھانکے رہتے تھے اور انبیاء کے ذریعہ سے انھیں کھلوانا مقصود تھا؟ یا وہ سنتیں، جن کے اہتمام کا آپ لوگوں میں بہت چرچا ہے، دنیا میں جاری نہ تھیں اور انہی کو جاری کرنے کے لیے انبیاء کی ضرورت تھی؟ ان سوالات پر آپ غور کریں گے تو خود ہی کہہ دیں گے کہ نہ اصل خرابیاں یہ تھیں اور نہ انبیاء کی بعثت کا اصل مقصود یہ تھا۔ پھر سوال یہ ہے کہ وہ اصلی خرابیاں کیا تھیں جنھیں دور کرنا مطلوب تھا اور وہ حقیقی بھلائیاں کیا تھیں جنھیں قائم کرنے کی ضرورت تھی؟ اس کا جواب آپ اس کے سوا اور کیا دے سکتے ہیں کہ خدا کی اطاعت و بندگی سے انحراف، خودساختہ اصول و قوانین کی پیروی، اور خدا کے سامنے ذمہ داری و جوابدہی کا عدم احساس، وہ اصل خرابیاں تھیں جو دنیا میں رونما ہو گئی تھیں۔ اُنہی کی بدولت اخلاقِ فاسدہ پیدا ہوئے، غلط اصولِ زندگی رائج ہوئے اور زمین میں فساد برپا ہوا۔ پھر انبیاء علیہم السلام اس غرض کے لیے بھیجے گئے کہ انسانوں میں خدا کی بندگی و وفاداری اور اس کے سامنے جوابدہی کا احساس پیدا کیا جائے، اخلاقِ فاضلہ کو نشوونما دیا جائے اور انسانی زندگی کا نظام ان اصولوں پر قائم کیا جائے جن سے خیر و صلاح ابھرے اور شر و فساد دبے۔ یہی ایک مقصد تمام انبیاء کی بعثت کا تھا اور آخر کار اسی مقصد کے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔

اب دیکھیے کہ اس مقصد کی تکمیل کے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کس ترتیب و تدریج کے ساتھ کام کیا۔ سب سے پہلے آپ نے ایمان کی دعوت دی اور اس کو وسیع ترین بنیادوں پر پختہ و مستحکم فرمایا۔ پھر اس ایمان کے مقتضیات کے مطابق بتدریج اپنی تعلیم و تربیت کے ذریعے اہلِ ایمان میں عملی اطاعت و فرمانبرداری (یعنی اسلام)، اخلاقی طہارت (یعنی تقویٰ)، اور خدا کی گہری محبت و وفاداری (یعنی احسان) کے اوصاف پیدا کیے۔ پھر ان مخلص مومنوں کی منظم سعی و جہد سے قدیم جاہلیت کے فاسد نظام کو ہٹانا اور اس کی جگہ قانونِ خداوندی کے اخلاقی و تمدنی اصولوں پر ایک نظامِ صالح قائم کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح جب یہ لوگ اپنے دل و دماغ، نفس و اخلاق، افکار و اعمال، جملہ حیثیات سے واقعی مسلم، متقی اور محسن بن گئے اور اس کام میں لگ گئے جو اللہ تعالیٰ کے وفاداروں کو کرنا چاہیے تھا، تب آپ نے ان کو بتانا شروع کیا کہ وضع قطع، لباس، کھانے پینے، رہنے سہنے، اٹھنے بیٹھنے اور دوسرے ظاہری برتاؤ میں وہ مہذب آداب و اطوار کون سے ہیں جو متقیوں کو زیب دیتے ہیں۔ گویا پہلے مس خام

کو کندن بنایا پھر اس پر اشرفی کا ٹھپہ لگایا۔ پہلے سپاہی تیار کیا پھر اسے وردی پہنائی۔ یہی اس کام کی صحیح ترتیب ہے جو قرآن و حدیث کے غائر مطالعہ سے صاف نظر آتی ہے۔ اگر اتباع سنت نام ہے اس طرزِ عمل کا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی مرضی پوری کرنے کے لیے ہدایت الٰہی کے تحت اختیار کیا تھا، تو یقیناً یہ سنت کی پیروی نہیں بلکہ اس کی خلاف ورزی ہے کہ حقیقی مومن، مسلم، متقی اور محسن بنے بغیر اپنے آپ کو تقوٰی کے ظاہری سانچے میں ڈھالا جائے اور محسنوں کے سے چند مشہور و مقبولِ عام افعال کی نقل اتاری جائے۔ یہ پیسے اور تانبے کے ٹکڑوں پر اشرفی کا ٹھپہ لگا کر بازار میں ان کو چلانا اور سپاہیت، وفاداری اور جاں نثاری پیدا کیے بغیر نرے وردی پوش نمائشی سپاہیوں کو میدان میں لا کھڑا کرنا، میرے نزدیک تو ایک کھلی ہوئی جعل سازی ہے، اور اسی جعل سازی کا نتیجہ ہے کہ نہ بازار میں آپ کی ان جعلی اشرفیوں کی کوئی قیمت اٹھتی ہے اور نہ میدان میں آپ کے ان نمائشی سپاہیوں کی بھیڑ سے کوئی معرکہ سر ہوتا ہے۔

پھر آپ کیا سمجھتے ہیں کہ خدا کے ہاں اصلی قدر کس چیز کی ہے۔ فرض کیجیے کہ ایک شخص سچا ایمان رکھتا ہے، فرض شناس ہے، اخلاق صالحہ سے متصف ہے، حدود اللہ کا پابند ہے اور خدا کی وفاداری و جاں نثاری کا حق ادا کر دیتا ہے، مگر ظاہری فیشن کے اعتبار سے ناقص اور ظاہری تہذیب کے معیار سے گرا ہوا ہے۔ اس کی حیثیت زیادہ سے زیادہ بس یہی تو ہو گی کہ ایک اچھا ملازم ہے، مگر ذرا بدتمیز ہے۔ ممکن ہے اس بدتمیزی کی وجہ سے اس کو مراتب عالیہ نصیب نہ ہو سکیں، مگر کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس قصور میں اس کی وفاداری کا اجر بھی مارا جائے گا اور اس کا مالک صرف اس لیے اسے جہنم میں جھونک دیگا کہ وہ خوش وضع اور خوش اطوار نہ تھا؟ فرض کیجیے کہ ایک دوسرا شخص ہے جو بہترین شرعی فیشن میں رہتا ہے اور آدابِ تہذیب کے التزام میں کمال درجہ محتاط ہے، مگر اس کی وفاداری میں نقص ہے، اس کی فرض شناسی میں کمی ہے، اس کی غیرت ایمانی میں خامی ہے۔ آپ کیا اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس نقص کے ساتھ اس ظاہری کمال کی حد سے حد کتنی قدر خدا کے ہاں ہو گی؟ یہ مسئلہ تو کوئی گہرا اور پیچیدہ قانونی مسئلہ نہیں ہے جسے سمجھنے کے لیے کتابیں کھنگالنے کی ضرورت ہو۔ محض عقل عام سے ہی ہر آدمی جان سکتا ہے کہ ان دونوں چیزوں میں سے اصلی قدر کی مستحق کونسی چیز ہے۔ دنیا کے کم عقل لوگ بھی اتنی تمیز ضرور رکھتے ہیں کہ حقیقت میں قابل قدر شے کیا ہے۔ یہ انگریزی حکومت آپ کے سامنے موجود ہے۔ یہ لوگ جیسے کچھ فیشن پرست ہیں، اور ظاہری آداب و اطوار پر جس طرح جان دیتے ہیں اس کا حال آپ کو معلوم ہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ ان کے ہاں اصلی قدر کس چیز کی ہے؟ جو فوجی افسران کی سلطنت کا جھنڈا بلند کرنے میں اپنے دل و دماغ اور جسم و جان کی ساری قوتیں صرف کر دے اور فیصلے کے وقت پر کوئی قربانی دینے میں دریغ نہ کرے وہ خواہ ان کے نقطۂ نظر سے کتنا ہی اجڈ اور گنوار ہو، کئی کئی دن شیو نہ کرتا ہو، بے ڈھنگا لباس پہنتا ہو، کھانے پینے کی ذرا تمیز نہ رکھتا ہو، رقص کے فن سے نابلد ہو، مگر ان سارے عیوب کے باوجود وہ اس کو سر آنکھوں پر بٹھائیں گے اور اسے ترقی کے بلند ترین مرتبے دیں گے۔ بخلاف اس کے جو شخص فیشن، تہذیب، خوش تمیزی اور سوسائٹی کے مقبول عام اطوار کا معیاری مجسمہ ہو لیکن وفاداری و جاں نثاری میں ناقص ہو اور کام کے وقت پر فرض اور تقاضائے غیرتِ قومی کے مقابلہ میں اپنی جان، اپنی راحت اور اپنے مصالح کا زیادہ لحاظ کر جائے اسے وہ کوئی عزت کا مقام دینا تو درکنار شاید اس کا کورٹ مارشل کرنے میں بھی دریغ نہ کریں۔ یہ جب دنیا کے کم عقل انسانوں کی معرفت کا حال ہے تو اپنے خدا کے متعلق آپ کا کیا گمان ہے؟ کیا وہ سونے اور تانبے میں تمیز کرنے کے بجائے محض ٹھپے پر اشرفی کا ٹھپہ دیکھ کر اشرفی کی قیمت اور پیسے کا ٹھپہ دیکھ کر پیسے کی قیمت لگا دے گا؟

میری اس گذارش کو یہ معنی نہ پہنایئے کہ میں ظاہری محاسن کی نفی کرنا چاہتا ہوں، یا ان احکام کی تعمیل کو غیر ضروری قرار دے رہا ہوں جو زندگی کے ظاہری پہلوؤں کی اصلاح و درستی کے متعلق دیے گئے ہیں۔ درحقیقت میں تو اس کا قائل ہوں کہ بندۂ مومن کو ہر اس حکم کی تعمیل کرنی چاہیے جو خدا اور رسول نے دیا ہو، اور یہ بھی مانتا ہوں کہ دین انسان کے باطن اور ظاہر دونوں کو درست کرنا چاہتا ہے۔ لیکن جو چیز میں آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ مقدم چیز باطن ہے نہ کہ ظاہر۔ پہلے باطن میں حقیقت کا جوہر پیدا کرنے کی فکر کیجیے، پھر ظاہر کو حقیقت کے مطابق ڈھالیے۔ آپ کو سب سے بڑھ کر اور سب سے پہلے ان اوصاف کی طرف توجہ کرنی چاہیے جو اللہ کے ہاں اصلی قدر کے مستحق ہیں اور جنہیں نشوونما دینا انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا اصلی مقصود تھا۔ ظاہر کی آراستگی اول تو ان اوصاف کے نتیجے میں نظرۃً خود ہی ہوتی چلی جائے گی اور اگر اس میں کچھ کسر رہ جائے تو تکمیل مراحل میں اس کا اہتمام بھی کیا جا سکتا ہے۔

دوستو اور رفیقو! میں نے بیماری کے اور کمزوری کے باوجود آج یہ طویل تقریر آپکے سامنے صرف اس لیے کی ہے کہ میں امر حق کو پوری وضاحت کے ساتھ آپ تک پہنچا کر خدا کے حضور بری الذمہ ہونا چاہتا ہوں۔ زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ کب اس کی مہلت عمر ان پوری ہو۔ اس لیے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ حق پہنچانے کی جو ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے اس سے سبکدوش ہو جاؤں۔ اگر کوئی امر وضاحت طلب ہو پوچھ لیجیے، اگر میں نے کوئی بات خلاف حق بیان کی ہو تو اس کی تردید کیجیے، اور اگر میں نے ٹھیک ٹھیک حق آپ تک پہنچا دیا ہے تو اس کی گواہی دیجیے۔ (آوازیں: ہم گواہ ہیں)۔ آپ بھی گواہ رہیں اور خدا بھی گواہ ہو۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ مجھے اور آپ سب کو اپنے دین کا صحیح فہم بخشے اور اس فہم کے مطابق دین کے سارے تقاضے اور مطالبے پورے کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

اس کے بعد جلسہ برخاست ہوا اور اجتماع کی کارروائی بھی ختم ہو گئی۔

مقالات

عبادت اور عبودیت

(۴)

از افادات امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ

(ترجمہ مولوی صدرالدین صاحب اصلاحی)

اس توضیح کے بعد یہ بات بآسانی سمجھ میں آجاتی ہے کہ قلبِ انسانی کے اندر اللہ تعالیٰ کی محبت جتنی زیادہ ہوتی جائے گی اتنی ہی اس کی عبودیت بھی بڑھتی جائے گی اور وہ ماسوا سے اسی قدر آزاد اور بے نیاز ہوتا چلا جائے گا۔ علیٰ ہذا القیاس جس قدر اس میں عبدیت کا رنگ گہرا ہوتا جائے گا اتنا ہی اللہ کے عشق اور غیر اللہ سے بے نیازی کا نقش پائیدار ہوتا جائے گا۔

قلبِ انسانی کی خصوصیت انسان فطرۃً اللہ تعالیٰ کی احتیاج محسوس کرتا ہے۔ ایسی احتیاج جس میں عجز اور تذلل کا عنصر بھی شامل ہے۔ اس احتیاج کی دو جہتیں ہیں۔ ایک تو جہت عبادت جس کو علتِ غائی کہنا چاہیے۔ دوسری جہتِ استعانت و توکل، جس کو علتِ فاعلی کہنا چاہیے۔ پس قلبِ انسانی اللہ کی عبادت، محبت اور اس کی طرف انابت کے بغیر نہ تو کبھی حقیقی صلاح و فلاح حاصل کر سکتا ہے، اور نہ ہی سچی لذت اور سرور کی دولت سے بہرہ ور ہو سکتا ہے اور نہ سکونِ خالص اور اطمینانِ صادق کی نعمت سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ اس کو دنیا کی ساری نعمتیں اور لذتیں میسر کیوں نہ آجائیں لیکن پھر بھی اضطراب کی خلش اس کی گہرائیوں میں موجود ہی رہے گی اور حقیقی سکون و اطمینان کی لذت سے محروم ہی رہے گا، کیونکہ اس کے اندر محبوبِ حقیقی کی ایک فطری پیاس موجود ہے اور وہ اپنے اندر اپنے پروردگار کی ایک ذاتی احتیاج اور فطری طلب رکھتا ہے۔ اس لیے کہ فی الواقع وہی اس کا اصلی معبود اور محبوب ہے اور اسی کو پاکر وہ صحیح معنوں میں سکون و طمانیت اور لذت و سرور کی شادکامیوں سے متمتع ہو سکتا ہے۔ اور یہ چیز اس کو حاصل ہو نہیں سکتی جب تک اللہ تعالیٰ ہی اس کی دستگیری نہ کرے۔ اس کے ماسوا اس پوری کائنات میں کوئی نہیں جو اس کے کام آسکے۔ پس انسان کا قلب دائمی طور پر اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ کی روح اور اس کی حقیقت کا فطرۃً محتاج ہے۔ اس لیے اگر اس کے اس محبوب اور مقصودِ حقیقی کے حصول میں اس کی اعانت کر بھی دی جائے لیکن عبادتِ الٰہی کا ایسا سچا ذوق اس میں موجود نہ ہو کہ وہی اس کی طلب و جستجو کا مرکز و منتہا قرار پا چکا ہو، وہ اول و آخر اسی کی محبت اس کا سرمایۂ زندگی بن چکی ہو اور اس کے علاوہ جس کسی سے بھی وہ محبت کرتا ہو، اصالۃً نہ کرتا ہو بلکہ خدا ہی کے لیے کرتا ہو، تو اس کیفیت کے ہوتے ہوئے بھی وہ نہ تو لا الٰہ الا اللہ کا رمز شناس ہو سکتا نہ توحید، عبدیت اور محبتِ الٰہی کے ذروۂ کمال تک اس کی رسائی ہو سکتی ہے۔ اس حالت میں نہ صرف اس میں ایک نقص اور عیب موجود ہوگا بلکہ ہر وقت وہ ایک قسم کی بے چینی اور حسرت اور اندرونی گھٹن محسوس کرتا رہے گا۔

اسی طرح اگر وہ خدا کو اپنا مطلوبِ حقیقی تو سمجھتا ہو اور اس کے حاصل کرنے کے لیے ریاضتیں بھی کرتا ہو مگر اس سعی و جستجو میں تو خدا ہی سے توفیق طلبی کرتا ہو نہ اس مقصد کے حصول میں اس کی اعانتوں کا خود کو حاجتمند سمجھتا ہو اور نہ اس سلسلہ میں تنہا وہی اس کی امیدوں کا ملجا و ماویٰ ہو

تو کبھی بھی گوہر مقصود سے اس کا دامن بھر نہیں سکتا، کیونکہ کسی چیز کا وجود و عدم خدا ہی کی مشیت کے تابع ہے۔

پس انسان دو حیثیتوں سے اللہ جل شانہٗ کا محتاج ٹھیرا، ایک تو یہ کہ وہی اس کا تنہا اور حقیقی مطلوب اور محبوب و معبود ہے، دوسری یہ کہ تنہا وہی اس کا چارہ ساز، پشت پناہ، دست گیر، مرکز، ماں اور مرجع اعتماد ہے۔ یعنی وہی اس کا "الٰہ" ہے جس کے سوا کوئی اس کا معبود نہیں، اور پھر وہی اس کا "رب" ہے جس کے سوا کوئی اس کا مالک و آقا نہیں۔ اور عبودیت انسان کی کامل نہیں ہو سکتی جب تک کہ یہ دونوں چیزیں موجود نہ ہوں۔ ورنہ اگر کوئی شخص کسی بھی غیر اللہ کی محبت بالذات کرتا ہے یا اس سے اعانت کی امیدیں وابستہ رکھتا ہے تو در اصل وہ اس محبت و امید کی مقدار کے مطابق اسی کا بندہ ہے۔ بخلاف اس کے اگر غیر اللہ سے اس کی محبت بالذات نہ ہو بلکہ خدا ہی کے لیے ہو، نیز خدا کے سوا کبھی کسی سے کوئی امید نہ باندھتا ہو اور جن اسباب و ذرائع سے اپنے مقاصد کے حصول میں کام لیتا ہو یا مقاصد کو حاصل کرتا ہو ان کے متعلق پورے شرح صدر کے ساتھ یقین رکھتا ہو کہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے ان اسباب کو پیدا اور مقدر کیا ہے، بجائے خود یہ کوئی قدرت اور تاثیر نہیں رکھتے۔ نہ کسی اور کے اختیار پر یہ معرض وجود میں آتے ہیں، بلکہ اس زمین کی سطح سے لے کر آسمان کی بلندیوں تک جتنی مخلوقات ہیں سب کا پروردگار، سب کا آقا اور سب کا خالق اللہ ہی ہے اور سب کی سب اسی کی بہ وجوہ محتاج ہیں —— اگر انسان ان صفات سے آراستہ ہے تو سمجھنا چاہیے کہ وہ اپنی قسمت کے مطابق کمال عبودیت سے سرفراز ہے۔ اور اس سعادت کے حصول میں لوگوں کے درجے اس قدر مختلف ہیں کہ ان کا صحیح اندازہ اور شمار اللہ ہی کو معلوم ہے اور تمام مخلوق میں فضل و کمال، عظمت و کرامت اور ہدایت و تقرب الٰہی کے لحاظ سے وہی شخص اعلیٰ و افضل ہے جس کی عبدیت مذکورہ بالا وجوہ سے اعلیٰ و اکمل ہو۔

اسلام کی حقیقت | یہی ہے اس دین کی حقیقت جسے اسلام کہا جاتا ہے اور جس کی تعلیم و تبلیغ کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کو مبعوث فرمایا اور اپنی کتابیں نازل کیں۔ یعنی یہ کہ بندہ اپنے آپ کو ہر حیثیت سے خدا ہی کا تابع فرمان بنا دے اور ذرہ برابر بھی کسی غیر کا فرماں بردار نہ رہے۔ ایسا شخص جو خدا کو بھی اطاعت کا مستحق سمجھتا ہے اور ساتھ ہی کسی دوسرے کو بھی، وہ مشرک ہے، اسی طرح اس کے برعکس جو خدائی اطاعت و انقیاد کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتا وہ مستکبر ہے۔

کبر اور عبدیت میں منافات | اور کبر کے بارے میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

"یقین رکھو کہ جنت میں وہ شخص داخل نہیں ہو سکتا جس کے دل میں ذرہ بھر بھی غرور ہو گا۔ بالکل اسی طرح جس
طرح دوزخ میں وہ شخص نہیں جا سکتا جس کے اندر ذرہ برابر بھی ایمان ہو گا۔" (صحیح بخاری)

گویا معلوم ہوا ایمان کے نزدیک غرور اور ایمان ایک دوسرے کی ضد ہیں، کیونکہ غرور عبودیت کی حقیقت کے بالکل منافی ہے جیسا کہ حدیث قدسی کے الفاظ بتلاتے ہیں:۔

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ عظمت میری ازار ہے اور کبریائی میری ردا ہے۔ پس جو شخص ان دونوں میں سے کوئی
چیز بھی مجھ سے چھیننے کی کوشش کرے گا میں اس کو سخت سزا دوں گا۔" (صحیح بخاری)

معلوم ہوا کہ عظمت اور کبریائی ربوبیت کے خصائص میں سے ہیں، کسی مخلوق کو ان صفات جلالی میں سے کوئی حصہ بھی نہیں ملا ہے۔ لیکن ان دونوں میں بھی کبریائی کا مقام عظمت سے اونچا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اسے بمنزلہ ردا قرار دیا ہے اور عظمت کو بمنزلہ ازار کہا ہے۔ ردا، ازار سے بلند مقام پر ہوتی ہے۔ یہی راز ہے کہ اذان، نماز اور عیدین کا شعار "اللہ اکبر" ٹھیرایا گیا ہے اور یہ کلمہ ان کے لیے مستحب قرار دیا گیا ہے۔

کہ جب بندہ بلند مقامات پر مثلاً صفا اور مروہ پر ہو یا کسی اونچائی پر چڑھ رہا ہو یا کسی جانور پر سوار ہو، یا ہو تو تکبیر کہے اور اللہ جل شانہ کی کبریائی کا اعلان کرے۔ اس تکبیر کا یہ اعجاز ہے کہ اس سے بھڑکتی ہوئی آگ کے بلند سے بلند شعلے سرد پڑ جاتے ہیں اور شیطان اس کو سننے کی تاب نہیں لا سکتا۔ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ:

ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ۔

مجھے پکارو میں تمھاری التجائیں سنوں گا۔ یقیناً جو لوگ میری بندگی سے منہ موڑتے ہیں وہ جلد ذلت کے عالم میں داخل جہنم ہوں گے۔

کبر مستلزم شرک ہے | ہر وہ شخص جو خدا کی بندگی سے استکبار کرتا ہے، ضروری ہے کہ وہ کسی نہ کسی غیر اللہ کی بندگی کا قلادہ اپنی گردن میں ڈالے ہوئے ہوگا، کیونکہ انسان کوئی بے حس اور جامد شے نہیں ہے بلکہ وہ فطرتاً ایک حساس اور متحرک ہستی ہے۔ صحیح حدیث میں ہے کہ حارث اور ہمام "سب سے زیادہ سچے اور ثابت الوجود اسما یعنی صفات انسانی ہیں۔ حارث" کے معنی ہیں کمانے والا اور حرکت و عمل کرنے والا۔ اور ہمام" کے معنی ہیں ارادہ کرنے والا۔ پس ارادہ انسان کی ایک ذاتی صفت ہے جس سے وہ کبھی خالی نہیں ہو سکتا۔ پھر ہر ارادہ کا ایک مقصود اور منتہیٰ پایا جانا بھی ضروری ہے۔ ان دونوں مقدموں کو تسلیم کرنے کے بعد اس امر واقعی سے انکار کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ ہر انسان کا ایک محبوب مقصود ہونا چاہیے جو اس کی محبتوں کا محور اور ارادوں کا مرکز ہو۔ پس جس شخص کا معبود و محبوب اللہ تعالیٰ نہ ہو وہ خدا کی محبت اور بیاز مندی سے اپنے کو برتر اور بے نیاز سمجھتا ہو، لازماً کوئی نہ کوئی غیر اللہ اس کا مراد اور محبوب ضرور ہوگا جو اس کو اپنا غلام اور بندہ بنائے ہوئے ہوگا، خواہ وہ مال و زر ہو، یا شان و شوکت ہو یا حسن و جمال ہو، یا خدا کے سوا اس کا خود ساختہ کوئی معبود ہو، مثلاً چاند، سورج، ستارے، مورتیاں، انبیا و صلحا کی قبریں وغیرہ یا کوئی نبی یا فرشتہ یا کوئی اور شے جس کا وہ خدا کو چھوڑ کر پجاری ہو۔ اور جب وہ کسی غیر اللہ کا پرستار بن گیا تو پھر اس کے مشرک ہونے میں کوئی کسر رہ گئی۔ معلوم ہوا کہ جو متکبر ہوگا مشرک ضرور ہوگا۔

فرعون کی مثال | چنانچہ فرعون کی مثال اس حقیقت کی ایک زندہ شہادت ہے، جو دنیا کا عظیم ترین متکبر گزرا ہے لیکن ساتھ ہی مشرک بھی تھا۔ پہلی چیز یعنی اس کے استکبار کا ذکر متعدد آیات میں بالتفصیل موجود ہے:

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُونِي أَقْتُلْ مُوسَىٰ وَلْيَدْعُ رَبَّهُ ...... وَقَالَ مُوسَىٰ إِنِّي عُذْتُ بِرَبِّي وَرَبِّكُم مِّن كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ ..... كَذَٰلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ...

اور فرعون نے کہا مجھے موسیٰ کو قتل کرنے دو اور پکارا ہے وہ اپنے رب کو بلائے .... اور موسیٰ نے کہا کہ میں نے اس متمرد سے، جو حساب کے دن پر ایمان نہیں رکھتا، اپنے اور تمھارے رب کی پناہ مانگتا ہوں ..... اسی طرح اللہ تعالیٰ ہر سخت گیر متکبر کے دل پر مہر کر دیا کرتا ہے۔

وَقَارُونَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامَانَ ۖ وَلَقَدْ جَاءَهُم مُّوسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ وَمَا كَانُوا سَابِقِينَ۔

اور قارون اور فرعون اور ہامان، جن کے پاس موسیٰ روشن دلائل لیکر آئے لیکن انھوں نے خدا کے ماننے اور اس کی بندگی سے انکار کر دیا اور دنیا میں کبر و غرور کی روش اختیار کی، حالانکہ وہ ہم سے بچ نکل جانے والے نہ تھے۔

فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ آيَاتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوا هَٰذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا ۚ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ۔

جب ان کے پاس ہماری نشانیاں بالکل کھلے طور پر آئیں تو انھوں نے کہا یہ تو صریح جادو ہے اور ان کو ماننے سے انھوں نے ظلم اور سرکشی کی بنا پر انکار کر دیا، حالانکہ ان کے دل ان کی صداقت کا یقین کر چکے تھے سو

دیکھو کہ ان فسادیوں کا انجام کیسا ہوا؟۔

دوسری چیز پر یعنی یہ کہ فرعون مشرک تھا، یہ آیت گواہ ہے :-

وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ أَتَذَرُ مُوسَىٰ وَقَوْمَهُ لِيُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَيَذَرَكَ وَآلِهَتَكَ۔

اور فرعون کی قوم میں سے بڑے لوگوں نے فرعون سے کہا کہ آپ موسیٰ اور اس کی قوم کو یوں ہی چھوڑے رہیں گے تاکہ وہ ملک میں فساد انگیزی کریں اور آپ کو اور آپ کے معبودوں کو چھوڑ دیں ؟

اور نہ صرف یہ کہ ہر مستکبر مشرک ہوتا ہے بلکہ استقرار اور تجربہ بتلاتا ہے کہ جو شخص خدا کی بندگی اور اطاعت سے جتنا ہی زیادہ سرکشی کرتا ہے اتنا ہی زیادہ بڑا مشرک ہوتا ہے، کیونکہ عبادت الٰہی سے وہ جس قدر زیادہ سرتابی کرتا ہے گا اسی قدر اپنے کسی نہ کسی ایسے مراد و محبوب کا زیادہ محتاج اور نیاز کیش ہوتا جاتا ہے گا جو اس کے دل و دماغ کا مقصود اوّل اور مطلوب حقیقی ہوگا اور اس طرح وہ اپنے اس لات و منات کا اسی مناسبت سے بندہ بن جاتا ہے گا۔ کیونکہ یہ چیز انسان کی جبلت کے خلاف ہے کہ اس کا دل ایسا کوئی نہ کوئی مقصود و مطلوب نہ رکھتا ہو، اس لیے جب اصل مقصود یعنی اللہ تعالیٰ کو اس نے اپنے قلب سے نکال پھینکا تو ضرور ہے کہ کوئی دوسری شے اس خالی جگہ پر قبضہ کرلے، ورنہ تمام مخلوقات سے قلب انسانی کا خالی اور بے نیاز ہونا اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ اللہ تعالیٰ ہی اس کا آقا و مولیٰ نہ بن جائے — ایسا آقا اور مولیٰ جس کے سوا وہ کسی کی عبادت نہ کرے، کسی سے مدد نہ مانگے، کسی پر توکل نہ کرے اور صرف اسی چیز سے خوش رہے جو خدا کو محبوب ہو اور اسی شے کو بری سمجھے جو خدا کے نزدیک مکروہ و مبغوض ہو، خدا کے دوستوں کو اپنا دوست سمجھے اور اس کے دشمنوں کو اپنا دشمن قرار دے، اسی کے لیے محبت کرے اور اسی کے لیے نفرت۔ اسی صفت باطنی کا نام اخلاص دین ہے، یہ اخلاص جتنا زیادہ عمیق اور استوار ہوگا خدا کی عبدیت اتنی ہی زیادہ کامل، اور ماسوا کی بے نیازی اسی قدر مکمل ہوگی، اور عبدیت کا حصول کمال ہی کبر اور شرک کا واحد علاج ہے۔

یہود و نصاریٰ کی اصلی گمراہیاں یہی دونوں بیماریاں ہیں جو اہل کتاب میں پیدا ہوگئی تھیں۔ نصاریٰ پر شرک غالب تھا اور یہودیوں پر کبر۔ جیسا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے۔ نصاریٰ کے متعلق فرمایا کہ :-

اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا إِلَٰهًا وَاحِدًا لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ سُبْحَانَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ۔

ان لوگوں نے اپنے علماء اور مشائخ کو اللہ کے سوا اپنا رب بنالیا ہے۔ خصوصاً مسیح ابن مریم کو۔ حالانکہ انھیں صرف یہ حکم دیا گیا تھا کہ ایک معبود کی عبادت کریں جس کے سوا کوئی دوسرا معبود ہے ہی نہیں، پاک و برتر ہے اللہ اس چیز سے جس کو یہ خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

یہود کے بارے میں فرمایا کہ :-

أَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰ أَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ۔

تو کیا جب کبھی کوئی رسول تمھاری خواہشوں کے خلاف کوئی پیغام لے کر آئے گا تو تم خودسری کروگے۔ چنانچہ ان میں سے کچھ کو تو تم نے جھٹلا دیا اور کچھ

سَأَصْرِفُ عَنْ آيَاتِيَ الَّذِينَ يَتَكَبَّرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَإِنْ يَرَوْا كُلَّ آيَةٍ لَا يُؤْمِنُوا بِهَا وَإِنْ يَرَوْا سَبِيلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا وَإِنْ يَرَوْا سَبِيلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوهُ

میں اپنی آیتوں (پر ایمان لانے) سے ان لوگوں کو دور ہی رکھوں گا جو زمین میں بغیر کسی استحقاق کے بڑے بنتے ہیں۔ اور اگر یہ لوگ ہر ایک نشانی دیکھ لیں جب بھی ان پر ایمان نہ لائیں گے، اور اگر ہدایت کا راستہ دیکھتے

سَبِيْلًا۔ میں تو اسکو اپنا راستہ نہیں بناتے لیکن اگر گمراہی کی راہ دیکھ پائیں تو اُسی پر چل پڑتے ہیں۔

ہر نبی کا دین اسلام تھا چونکہ کبر شرک کو مستلزم ہے اور شرک اسلام کی ضد اور گناہ عظیم ہے جس کی معافی کا بارگاہ احدیت میں حسب اعلانِ قرآنی، کوئی امکان نہیں، اس لیے ابتدائے آفرینش سے آج تک جتنے انبیاء آئے، سب ہی دین "اسلام" کو لے کر آئے، اس لیے تنہا یہی وہ دین ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہے۔ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو مخاطب کرکے فرمایا:-

فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ۔

اگر تم میری بات ماننے سے انکار کرتے ہو تو جائے تعجب ہے، اس میں میرا کوئی نقصان نہیں کیونکہ) میں تم سے کسی اجر کا طالب نہیں، میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے اور مجھے حکم ہے کہ میں "اسلام" لانے والوں میں سے بنوں۔

ابراہیم علیہ السلام کی دعوت و ارشاد اور طرز عمل کے متعلق قرآن میں ہے کہ:-

إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ۔ وَوَصَّىٰ بِهَا إِبْرَاهِيمُ بَنِيهِ وَيَعْقُوبُ۔ يَا بَنِيَّ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ لَكُمُ الدِّينَ فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ۔

جب اس کے پروردگار نے اس سے کہا "مسلم" (اطاعت گزار) بن جا تو اس نے جواب دیا کہ میں نے پروردگار کائنات کے لیے اپنی گردن جھکا دی اور پھر اسی امر کی اس نے اپنے بیٹوں اور یعقوب کو وصیت کی کہ اے میرے بیٹو! اللہ نے تمہارے لیے اس دین کو پسند فرمایا ہے سو تم مرتے دم تک مسلم (اللہ کے اطاعت گزار) رہنا۔

یوسف علیہ السلام فرماتے ہیں:-

تَوَفَّنِي مُسْلِمًا وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ۔

خدایا! مجھے دنیا سے "مسلم" اٹھا اور نیکوکاروں کے زمرہ میں داخل کر۔

موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم سے خطاب کرتے ہیں:-

يَا قَوْمِ إِنْ كُنْتُمْ آمَنْتُمْ بِاللَّهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوا إِنْ كُنْتُمْ مُسْلِمِينَ۔

اے میری قوم کے لوگو! اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو اسی پر بھروسہ کرو اگر تم "مسلم" ہو۔

توراۃ کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تمام انبیاء بنی اسرائیل، جو توراۃ کی شریعت کے مبلغ اور پیرو تھے، ان کا دین یہی اسلام تھا۔ إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا۔

بلقیس کے سامنے جب صداقت کی تجلی چمکی تو پکار اٹھی:-

رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي وَأَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمَانَ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔

مالک! یقیناً میں نے اب تک اپنے اوپر بڑا ہی ظلم کیا، اور اب سلیمان کے ساتھ تمام جہانوں کے پروردگار اللہ کی "مسلم" بنتی ہوں۔

حواریینِ عیسیٰ کے متعلق اللہ تعالیٰ کہتا ہے:-

وَإِذْ أَوْحَيْتُ إِلَى الْحَوَارِيِّينَ أَنْ آمِنُوا بِي وَبِرَسُولِي۔ قَالُوا آمَنَّا وَاشْهَدْ بِأَنَّنَا مُسْلِمُونَ۔

اور جب میں نے حواریوں کو وحی کی کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ تو انھوں نے جواب دیا ہم ایمان لائے اور اے خدا تو گواہ رہ کہ ہم "مسلم" ہیں۔

قرآن حکیم کی ان تصریحات سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ہر پیغمبر کا دین اسلام تھا۔ یہی وجہ ہے کہ خداوند تعالیٰ کا یہ اعلان ہے

کہ اسلام کی شاہراہ ہی وہ تنہا شاہراہ ہے جو ربی بارگاہ قبولیت تک پہنچاتی ہے۔

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ۔
بے شک دین تو اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے۔

وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ
اور جس شخص نے اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین اختیار کیا اس کا دین ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔

اسلام دینِ کائنات ہے نہ صرف یہ کہ ہر نبی اسلام لے کر آیا اور تمام بنی آدم کا یہی دین رہا ہے بلکہ اسلام ساری کائنات کا دین ہے۔
قرآن کہتا ہے:-

أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْغُونَ وَلَهُ أَسْلَمَ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا۔
کیا یہ لوگ اللہ کے دین کو چھوڑ کر کوئی اور دین چاہتے ہیں، حالانکہ آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی ہے، چار و ناچار اسی کے سامنے سرِ افگندہ ہے۔

"طَوْعًا وَكَرْهًا" کی قید کل کائنات کے اسلام میں اس وجہ سے لگائی ہے کہ تمام مخلوقات اللہ تعالیٰ کی مکمل تابع اور زیرِ فرمان ہیں خواہ کوئی اس فرماں برداری کا اقرار کرے یا نہ کرے، نیز تمام لوگ اس کے سامنے عاجز محض ہیں اور اس کے دستِ تصرف و تدبیر میں ہیں، اس کے فرامین مشیت اور احکامِ تدبیر سے یک سر مو انحراف کسی کے لیے ممکن ہی نہیں، اس لیے چار و ناچار سب ہی اس کے مسلم اور مطیع و منقاد ہیں، ساری طاقتوں اور قدرتوں کا سرچشمہ اسی کی ذات ہے، ایک ذرہ سے لے کر آفتاب تک ہر چھوٹی بڑی چیز کا پروردگار وہی ہے، جس طرح چاہتا ہے ان میں بلا روک ٹوک تصرف کرتا رہتا ہے، سب کا پیدا کرنے والا، سب کو وجود بخشنے والا اور سب کی صورتیں بنانے والا وہی ہے۔ اس جہانِ ہستی میں اس کے سوا جو کچھ ہے سب کا سب مخلوق ہے، مربوب ہے، محتاج ہے، فقیر ہے، غلام ہے، مجبور ہے، مقہور ہے اور ہر حیثیت سے مسخر ہے۔ اللہ ہی اکیلا ہر شے کا خالق اور معبود ہے۔ اگرچہ جس چیز کو بھی اس نے پیدا کیا ہے، اسباب کے ساتھ پیدا کیا ہے لیکن ان اسباب کا خالق اور صاحبِ تقدیر بھی وہی ہے، اس لیے وہ اسباب بھی اسی طرح اس کے محتاج ہیں۔ اور اس عالمِ کون و فساد میں کوئی سبب بھی اپنی تاثیر میں مستقل بالذات نہیں ہے بلکہ ہر سبب ایک دوسرے سبب کا دستِ نگر رہتا ہے جس کی اعانت کے بغیر وہ اپنا عمل اور اثر ظاہر نہیں کر سکتا۔ یہ سبب یعنی علتہ العلل ذاتِ باری تعالیٰ ہے جو اسباب و علل سے مافوق اور ہر شے سے بے نیاز ہے جس کا نہ تو کوئی شریک ہے کہ اس کی اعانت کرے، نہ کوئی مقابل ہے جو میدانِ مقابلہ میں اس کے سامنے آئے:-

قُلْ أَفَرَأَيْتُم مَّا تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ إِنْ أَرَادَنِيَ اللَّهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كَاشِفَاتُ ضُرِّهِ أَوْ أَرَادَنِي بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكَاتُ رَحْمَتِهِ قُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُونَ۔
اے نبی! ان سے کہو کہ کیا تم نے ان کے حال پر کچھ غور کیا جن کو خدا کو چھوڑ کر تم پوجتے ہو؟ اگر اللہ مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو کیا یہ اس کے نقصان کو دور کر سکتی ہیں؟ یا اگر خدا مجھ پر کوئی رحمت کرنی چاہے تو کیا یہ اس کی رحمت کو روک سکتی ہیں؟ کہہ دو کہ اللہ میرے لیے کافی ہے۔ اسی پر بھروسہ رکھنے والوں کو بھروسہ رکھنا چاہیے۔

اس طرح کی بے شمار آیتیں قرآن میں موجود ہیں جو شہادت دیتی ہیں کہ ہر فعل اور ہر سببِ فعل کی باگ ڈور مشیتِ الٰہی کے ہاتھوں میں ہے۔ حضرت ابراہیم خلیل نے اپنی قوم کی کٹ حجتیوں اور دھمکیوں کے جواب میں اسی حقیقت تامہ کو پیش فرمایا تھا کہ "میں تمہارے شریک ٹھیرائے ہوئے معبودانِ باطل سے ڈرنے والا نہیں، ہاں اگر میرے پروردگار ہی کی مشیت کچھ اس قسم کی ہو تو اور بات ہے"۔

ابراہیم خلیل عبدیتِ کاملہ کا نمونہ | عبدیت کے سلسلہ میں حضرت ابراہیم ایک امتیازی شان اور اسوۂ کمال رکھتے ہیں، خدا کی ساری زمین دینِ شرک کی ظلمتوں سے تاریک ہو رہی تھی کہ توحید، عبودیت اور اخلاص کا یہ نورانی پیکر حق پرستوں اور مخلصوں کا امام بن کر نمودار ہوا جس کی عبدیتِ کاملہ کا خود معبود کو اعتراف ہے :۔

وَاِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ ۔

اور جب ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا اور اس نے ان کو پورا کر دیا تو پروردگار نے فرمایا کہ میں تجھ کو لوگوں کا پیشوا بناؤں گا۔ ابراہیم نے کہا اور میری اولاد میں سے ؟ جواب ملا کہ میرا وعدہ ظالموں کے لیے نہیں

دیکھو یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے غیر مبہم طریقہ پر اس امر کی تصریح کر دی ہے کہ یہ وعدۂ امامت صرف مومنوں اور حدودِ عبدیت کی حفاظت کرنے والوں کے لیے ہے ۔ ظالموں اور حدودِ الٰہی سے تجاوز کرنے والوں کے لیے نہیں ہے، اور سب سے بڑا ظلم شرک ہے ۔ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۔ پس ظالموں اور مشرکوں کو یہ رتبہ حاصل نہیں ہو سکتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قوموں کی امامت کے منصب پر سرفراز کیے جائیں ۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو امامتِ اقوام کا شرف کمالِ عبودیت کی آزمائش میں کامیاب ثابت ہونے پر ملا تھا۔ چنانچہ آپ کو خدا پرستی کا اسوہ اور پیشوا قرار دیا گیا اور آپ کی نسل کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کی نعمتِ عظمیٰ سے نوازا، اور آپ کے بعد جو نبی بھی مبعوث ہوا آپ ہی کی ملت پر مبعوث ہوا ۔ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۔ (اے نبی یکسو ہو کر ملتِ ابراہیمی کی پیروی کر)۔ دوسری جگہ یہود و نصاریٰ کی نسبت فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کو یہودیت و نصرانیت کی گروہ بندی سے کوئی علاقہ نہیں، اللہ تعالیٰ کی ہدایت تو ملتِ ابراہیمی کی پیروی میں ہے ۔ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۔

حدیث میں حضرت ابراہیم کی شان میں فرمایا گیا ہے کہ " ابراہیم خیر البریہ ہیں " معلوم ہوا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ تمام مخلوق اور تمام انبیاء سے افضل ہیں، چنانچہ دربارِ خداوندی سے آپ کو " خلیل اللہ " کا خطاب عطا ہوا ہے جس سے بڑا کوئی عزت خطاب کسی کو نہیں

خلت کا مفہوم | اس امر کی دلیل کہ " خلیل " سے بڑھ کر کوئی خطاب نہیں، خود " خلیل " اور " خلت " کے الفاظ کی تہوں میں پوشیدہ ہے ۔ " خلت " نام ہے بندہ کی خدا کے ساتھ انتہائی محبت کا، جو کمالِ عبودیت کو مستلزم ہو نیز بندہ کے ساتھ خدا کی اس کامل محبت کا جو بندے کے لیے اس کی کامل ربوبیت کو لازم ہو ۔ اور لفظ " عبودیت " جیسا کہ آغازِ بحث میں تفصیل کے ساتھ بتلایا جا چکا ہے، انتہائی تذلل اور انتہائی محبت کے مجموعہ کا نام ہے ۔ پس مقامِ خلت، محبت کے مقام سے بلند تر ہوا ۔ اور یہی وہ اعلیٰ کمال ہے جو حضرت ابراہیم اور حضرت محمد علیہما السلام کو اللہ تعالیٰ کے دربار سے مرحمت ہوا تھا اور یہی وجہ ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس زمین پر بسنے والوں میں سے کوئی خلیل نہ تھا، جیسا کہ آپ نے فرمایا ہے کہ " اگر میں اہلِ ارض میں سے کسی کو اپنا خلیل منتخب کرتا تو وہ ابوبکر ہوتے لیکن میں تو اللہ تعالیٰ کا خلیل ہو چکا ہوں " معلوم ہوا کہ انسان کسی ایک ہی کا خلیل بن سکتا ہے اور خلت قابلِ شرکت چیز نہیں، خلت کے مفہوم کو کسی نکتہ داں شاعر نے کس خوبی کے ساتھ واضح کیا ہے :۔

قد تخللت مسلک الروح منی ۔۔۔ و بذا سمی الخلیل خلیلا

(اے میرے محبوب، میری روح کے ایک ایک ریشہ میں تو " متخلل " ہو گئی ہے (یعنی چھا گئی ہے)، اسی وجہ سے خلیل کو خلیل کہتے ہیں ۔)

محبت اور خلت میں فرق محبت اور خلت میں یہی فرق و امتیاز ہے کہ خلت شرکتِ غیر کی متحمل اور روادار نہیں لیکن محبت میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔ خلت صرف ایک سے ہو سکتی ہے اور محبت ایک کے سوا دوسروں سے بھی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ رسول اکرم صلعم نے اللہ تعالےٰ سے رشتہ خلت رکھنے کے باعث کسی ماسوا کو اپنا خلیل بنانے سے انکار فرمایا، مگر اللہ تعالےٰ سے محبت رکھنے کے باوجود بہت سے لوگوں کو اپنا حبیب قرار دیا۔ مثلاً حضرت حسنؓ اور حضرت اسامہؓ کے متعلق فرمایا کہ "خدایا! میں ان سے محبت رکھتا ہوں سو تو بھی ان سے محبت رکھ"۔ اسی طرح عورتوں میں سے حضرت عائشہؓ کو اور مردوں میں سے حضرت ابوبکرؓ کو آپ نے اپنا سب سے بڑھ کر محبوب قرار دیا۔ کلام رسول کے بعد کلام الٰہی پر نظر ڈالیے تو جگہ جگہ دکھائی پڑتا ہے کہ "اللہ متقیوں سے محبت کرتا ہے"، "اللہ محسنوں سے محبت رکھتا ہے"، "اللہ توبہ کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے"، "اللہ ایسے لوگوں کو لائے گا جن کو وہ محبوب رکھتا ہو گا اور جو اس کو محبوب رکھتے ہوں گے"۔ گویا اللہ تعالیٰ بتانا چاہتا ہے کہ سچے مومن وہ ہوتے ہیں جن سے خدا محبت رکھتا ہے اور جو خدا سے محبت رکھتے ہیں۔ دوسری جگہ فرمایا "ایمان والے سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھنے والے ہوتے ہیں"۔ جس سے ثابت ہوا کہ مومن صالح اگرچہ سب سے زیادہ خدا ہی سے محبت رکھتا ہے مگر دوسروں سے بھی محبت رکھ سکتا ہے جس کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ محبت میں وحدت ضروری نہیں۔ بخلاف خلت کے۔

ایک خیال عام کی تردید عام طور پر یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے حبیب تھے اور حضرت ابراہیم اللہ کے خلیل تھے، اور یہ کہ محبت کا مقام خلت کے مقام سے مافوق ہے۔ لیکن یہ خیال کوئی مضبوط بنیاد نہیں رکھتا۔ کیونکہ احادیث صحیحہ سے یہ اچھی طرح ثابت ہے کہ آنحضرت بھی خلیل اللہ تھے۔ صحیح بخاری اور مسلم دونوں میں یہ روایت موجود ہے اور مختلف طرق و اسانید کے ساتھ موجود ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

"یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو اپنا خلیل بنایا ہے جیسا کہ ابراہیم کو اپنا خلیل بنایا تھا۔

ایک دوسری حدیث اوپر گذر چکی ہے جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ میں اللہ کا خلیل ہو چکا ہوں اور اب کسی اور کو خلیل بنانے کا موقع و محل باقی نہیں رہا۔

لذت اور حلاوت ایمانی ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ محبت الٰہی سے مراد یہ ہے کہ ان چیزوں سے محبت کی جائے جو اللہ تعالیٰ کو محبوب ہیں۔ محبت الٰہی کی یہ تاویل ہم نے نصوص شرعیہ کی روشنی میں کی ہے۔ اس سلسلہ میں صحیحین کی مذکورہ بالا حدیث کے پُرحکمت الفاظ پر دوبارہ غور کیجیے جس میں فرمایا گیا ہے کہ "تین چیزیں ہیں کہ جس کسی کے اندر یہ تینوں موجود ہوں گی وہی حلاوت ایمانی سے شادکام ہو گا ... الخ"۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی چیز سے لذت یابی، اس کی محبت کے بعد ہوتی ہے۔ یعنی اگر ایک شخص کسی چیز کی محبت و آرزو رکھتا ہے تو جس وقت وہ چیز اس کو حاصل ہوتی ہے وہ ایک کیفیت، ایک حلاوت، ایک لذت اور ایک سرور محسوس کرتا ہے۔ اور لذت اس خاص کیفیت کا نام ہے جو کسی موافق طبع شے یعنی کسی مرغوب و محبوب شے کے ادراک اور حصول کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ اور بعض خام کار فلسفیوں اور طبیبوں کا یہ خیال کہ لذت شے مرغوب کے نفس ادراک و حصول ہی کا نام ہے، ایسا پھُسپھُسا اور بے اصل ہے کہ جس کی تردید کی بھی ضرورت نہیں۔ کیونکہ "یہ ادراک اور حصول" تو رغبت اور لذت کی بیچ کی کڑی ہے نہ کہ نفس لذت۔ مثال کے طور پر کھانے کا مسئلہ لیجیے۔ کھانا انسان کی ایک مرغوب چیز ہے اور جب وہ اس کھانے کو کھا لیتا ہے تو ایک لذت محسوس کرتا ہے۔ پھر یہ کہنا کس قدر غلط ہے کہ کھانا کھانا ہی لذت ہے۔ اسی طرح قوت باصرہ کو لیجیے۔ جب انسان کسی محبوب شے کی طرف دیکھتا ہے تو دیکھنے کے بعد اس سے لذت پاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ لذت کا حصول دیکھنے اور نظر ڈالنے کے بعد ہوتا ہے اس لیے نظر اور چیز ہوئی اور لذت اور چیز جو نظر کے بعد وجود میں آتی ہے۔ قرآن کے الفاظ بھی اسی حقیقت کی شہادت دیتے ہیں:-

وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ　　اور اس بہشت میں وہ نعمتیں ہیں جن کی دلوں کو آرزو ہوگی اور جن سے آنکھیں لذت گیر ہوں گی۔

معلوم ہوا کہ نفس نظر اور رویت کا نام لذت نہیں ہے ورنہ یوں نہ فرمایا جاتا کہ "آنکھیں ان کو دیکھ کر لذت گیر ہوں گی"۔

یہی حال تمام احساسات نفس کا ہے، نفس کو جو خوشی یا غم وغیرہ کیفیات لذت والم محسوس ہوتی ہیں وہ کسی نہ کسی شے محبوب یا امر مکروہ کے شعور وادراک کا نتیجہ ہوتی ہیں نہ کہ نفس شعور وادراک۔ پس ایمان کی حلاوت اور پھر اس کے ساتھ لذت وسرور کا حصول خدا کے ساتھ کامل محبت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ مقام تین چیزوں میں پورا اترنے کے بعد ہاتھ آتا ہے۔ ایک تو اس محبت کی تکمیل، دوسری اس محبت کی تفریع، تیسری اس محبت کی ضد سے نفرت اور مدافعت۔ تکمیل محبت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اور رسول ساری موجودات سے زیادہ محبوب ہوں، کیونکہ جیسا کہ پہلے گذر چکا، اللہ اور اس کے رسول کی محبت کے باب میں صرف اتنی بات کافی نہیں ہے کہ نفی اجمالا ان سے محبت رکھی جائے بلکہ یہ ضروری ہے کہ ان کی محبت سب سے زیادہ ہو۔ اور تفریع محبت کا مدعا یہ ہے کہ اگر بندہ کسی انسان کی محبت کرے تو وہ محبت بھی للہ ہو، بالاصل نہ ہو۔ اور دفع ضد کا مفہوم یہ ہے کہ ضد ایمان ــــ کفر وشرک ــــ کو آگ میں پڑنے سے بڑھ کر ناپسندیدہ کر سمجھے۔

جب یہ بات معلوم ہو گئی کہ رسول خدا اور مومنوں کی محبت بھی دراصل خدا کی محبت ہے یعنی اسی کا ایک جزیا پرتو ہے اور رسول خدا صلعم ان مومنوں سے محبت رکھتے تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کے انعام سے سرفراز کیا تھا، اور اسی وجہ سے رسول کو ان سے محبت تھی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ محبت تھی اس لیے لازماً اللہ کے محبوبوں کی محبت اور اس کے مبغوضوں کا بغض بھی آپ کے قلب مبارک میں سب سے زیادہ ہونا ہی چاہیے تھا۔ لیکن محبت کے بالمقابل خلت کا حال دیکھیے کہ کس طرح اس میں غیراللہ کے لیے ایک شمہ بھی حصہ نہیں نہ اصالتاً نہ تبعاً، بلکہ وہ اللہ ہی کے لیے مخصوص ہے۔ جس سے محبت مطلق پر خُلت کی فضیلت روز روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے۔

محبت الٰہی کے مفہوم میں افراط وتفریط

خلاصۂ کلام یہ کہ خدا کی محبت اور خلت ہی میں عبودیت الٰہی کی حقیقت پوشیدہ ہے۔ لیکن کتنے ہی اہل علم ونظر ایسے ہیں جو اس حقیقت سے دور جا پڑے۔ ان کا گمان ہے کہ عبودیت تو صرف تذلل اور خضوع کا ایک خشک وظیفہ ہے، اس میں محبت کی چاشنی کہاں؟ محبت تو ایک کی قلبی تمناؤں کی انبساطی کیفیت کا، اور دوسرے کی طرف سے ناز وانداز کے اظہار کا نام ہے، اور ربوبیت اس قسم کی چیزوں سے ماوراء ہے، پھر یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ایک محبوب یا محب کی حیثیت دی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت ذوالنون مصری کے سامنے محبت الٰہی کا ذکر چھڑ گیا تو آپ نے فرمایا کہ "خاموش رہو، اس مسئلہ پر گفتگو مت کیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ عام لوگوں کے کانوں تک یہ بات پہنچے اور وہ محبت الٰہی کا ادعا کرنے لگیں"۔ چنانچہ بعض علما نے ایسے لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا مکروہ قرار دیا ہے جو اللہ تعالیٰ کی خشیت کا ذکر وتصور کیے بغیر صرف اس کی محبت کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ اس معاملہ میں ایک بزرگ کا قول لوح دل پر آب زر سے لکھنے کے قابل ہے جنھوں نے فرمایا کہ جو شخص خدا کی عبادت صرف محبت کے ساتھ کرتا ہے وہ زندیق ہے اور جو صرف رجا کے ساتھ کرتا ہے وہ مرجی ہے اور جو صرف خوف کے ساتھ کرتا ہے وہ حروری ہے۔ مومن موحد وہ ہے جس نے خدا کی عبادت، محبت، خوف اور رجا تینوں کے ساتھ کی۔ واقعات اس حکیمانہ نکتہ کی گواہی دے رہے ہیں۔ صوفیائے متاخرین میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جنھوں نے ادعائے محبت میں حدود کو فراموش کر دیا، آپے سے باہر نکل گئے یہاں تک کہ ان میں ایک طرح کی رعونت پیدا ہو گئی اور وہ ایسے دعوے

کہ مجھے جو عبدیت کے منافی ہیں اور جن میں ایسی شان پروردگاری پائی جاتی ہے جو اللہ جل مجدہ کے سوا کسی کے شایانِ شان نہیں۔ انھوں نے اپنے کو اس مقام پر ظاہر کیا جو نبوت و رسالت کے مقام سے بھی بالاتر ہے اور اپنے لیے خدا سے ایسی صفات کا مطالبہ کر گئے جو خدا ہی کے لیے مخصوص ہیں، اور جو انبیاء و رسل کے لیے بھی موزوں نہیں۔

یہ وہ خطرناک غلطی ہے جس سے شیطانی جال نے بڑے بڑے شیوخ طریقت کو شکار کر لیا۔ اس کا سبب عبودیت کی حقیقت تک فہم کی نارسائی اور تحقیقِ عبادت کی کمی ہے۔ بلکہ دراصل یوں کہنا چاہیے کہ اس کا باعث اس عقل کی کوتاہی ہے جس کے بغیر ایک بندہ اپنی حقیقت پہچان نہیں سکتا۔ پس جب عقل خام کار ہوتی ہے، اور دین کا علم پوری طرح حاصل نہیں رہتا، تو ایسی حالت میں اگر نفس میں محبت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں تو نفس اپنی نادانی کے باعث اپنے آپ سے باہر ہو جاتا ہے، اس کو اپنی حدود یاد نہیں رہتیں، جیسا کہ عشق مجازی میں اس انسانی فطرت کا مشاہدہ ہم جب چاہیں کر سکتے ہیں۔ پھر جب نفس اس فریب شیطانی کا شکار ہو جاتا ہے تو اس کی زبان سے بول نکلنے لگتے ہیں، وہ علانیہ کہنے لگتا ہے کہ میں تو عاشقِ خدا ہوں، میں جو چاہوں کروں، مجھ پر کوئی گرفت نہیں۔ یہ کھلی اور کھلی ہوئی گمراہی ہے اور بالکل وہی بات ہے جو یہود اور نصاریٰ کی زبانوں سے نکلی تھی کہ "ہم تو خدا کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں"۔ اور اس کا جواب خدا نے یہ دیا کہ تم اس کے بیٹے اور پیارے ہونے کا دعویٰ تو کرتے ہو مگر یہ تو بتاؤ کہ وہ تمہیں عذاب پر عذاب کیوں دیا کرتا ہے؟ کیا ابنیت اور محبوبیت کی یہی علامتیں ہیں؟ پس یہ نفس کا ایک خطرناک فریب ہے۔ درحقیقت یہ ہے کہ جو اللہ کا محبوب ہوتا ہے اس کو وہ صرف ایسے ہی کاموں میں لگاتا ہے جو اس کی رضا کے موجب ہوں، وہ کبھی ایسے کام نہیں کرتا جو اس کی ناراضی کا سبب بنیں۔ اور جو گناہ کا ارتکاب کرتا ہے اور نافرمانیوں پر نافرمانیاں کرتا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے ان افعال بد کو اسی طرح نفرت اور غضب کی نگاہ سے دیکھتا ہے جس طرح اس کے اعمال نیک کو قدر و محبت کی نظر سے، کیونکہ خدا کسی بندے سے اتنی ہی محبت کرتا ہے جتنا کہ اس میں ایمان اور تقویٰ ہے۔

اور اس شخص کی مثال، جو گمان کرتا ہے کہ محبوبِ خدا ہونے کے باعث اس کو گناہ کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے، اس خبطی نیم کی سی ہے جو سمجھتا ہو کہ چونکہ میرا مزاج معتدل اور میری صحت جسمانی بالکل ٹھیک ہے، اس لیے خواہ میں کتنا ہی زہر کیوں نہ کھاؤں اور پیتا رہوں لیکن اس سے میرا کچھ نہیں بگڑ سکتا۔ اگر یہ عقل کا دشمن قرآن پر نظر ڈالتا اور انبیاء کے احوال و قصص کو تدبر کی نگاہ سے دیکھتا کہ کس طرح نوعِ انسانی کے ان سرتاجوں کو بھی گناہ کے بعد توبہ و استغفار کی ضرورت پیش آ ہی گئی اور خدا کے ان محبوب ترین بندوں کو بھی اپنے اپنے حالات کے مطابق تزکیۂ نفس کی خاطر ابتلاؤں اور مصیبتوں کی چکی سے گزرنا ہی پڑا، تو اسے معلوم ہو جاتا کہ گناہ کے نقصانات اپنی ضرر رسانی میں کتنے مستعد اور اپنی اثر اندازی میں کتنے بے رحم واقع ہوئے ہیں کہ کسی بڑے سے بڑے مقرب بندہ کو بھی نہیں بخشتے۔ پھر یہ بات بھی عین مقتضائے فطرت ہے۔ خود انسان، انسان کے تعلقات میں اس اصول کی کارفرمائی مشاہدہ کی جا سکتی ہے۔ ایک وجودِ انسانی کا عاشق اگر اپنے محبوب کی مرضی اور مصلحت سے واقف نہ ہو اور اس کے مطابق طریق کار اختیار نہ کرے بلکہ صرف اپنے جذباتِ عشق کے اشاروں پر رقص کرتا رہے تو یقیناً اس کا یہ رویہ اپنے محبوب کی نفرت اور ناراضی کا، بلکہ عداوت اور تعذیب تک کا موجب ہو جاتا ہے۔

لیکن بدقسمتی سے کتنے ہی اہل سلوک ایسے گزرے ہیں جو محبتِ الٰہی کے زعم میں طرح طرح کی خلافِ دین باتیں کر گئے۔ کہیں حدود اللہ کی پاسداری فراموش کر دی گئی، کہیں حقوق اللہ کو پس پشت ڈال دیا گیا، اور کہیں بے سر و پا و باطل دعاوی کر دیے گئے۔ کوئی صاحب فرما گئے "جو میرے جس کسی مرید نے ایک شخص کو بھی دوزخ میں جانے دیا، اس سے میں بری ہوں"۔ کسی نے اعلان کیا

کہ جس کسی مرید نے ایک مومن کو بھی دوزخ میں جانے دیا میں اس سے بیزار ہوں"۔ ایک تیسرے صاحب یہ فرما گئے کہ "قیامت کے دن میرا خیمہ جہنم کے دروازے پر نصب رہے گا تاکہ ایک شخص بھی اس کے اندر داخل نہ ہونے پائے"۔ یہ اور اسی طرح کے بے شمار اقوال بعض مشہور و معروف مشائخ کی بابت بیان کیے جاتے ہیں، جو یا تو ان بزرگوں پر بہتان اور افترائے محض ہیں یا اگر انہیں کے اقوال ہیں تو یقیناً وہ سخت غلط ہیں جو ہوش کی باتیں نہیں بلکہ حالت سکر یا غلبہ یا فنا کی باتیں ہیں جس میں انسان ہوش اور تمیز کھو بیٹھتا ہے یا کم از کم اس کی تمیز اتنی کمزور ہو جاتی ہے کہ وہ نہیں جان سکتا کہ میرے منہ سے کیا نکل رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے حالت خاص کے زائل ہونے اور ہوش و تمیز بجا ہو جانے کے بعد اس قسم کی باتوں سے توبہ و استغفار کیا۔ یہی صورت حال ان صوفیا کے بارے میں بھی پیش آئی ہے جنھوں نے عشقیہ قصائد سننے میں اپنے لیے گنجائش پیدا کی۔

ان لغزشوں کا علاج اور محبت کا معیار

عشق و محبت کی راہ کے یہی وہ خطرات اور مزلات تھے جن سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے محبت کی ایک کسوٹی مقرر فرما دی ہے تاکہ ہر مدعی کا دعوائے محبت اس پر پرکھ کر دیکھا جا سکے، فرمایا:-

اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ — اگر تم واقعی خدا سے محبت رکھنے والے ہو تو میرا اتباع کرو اللہ تم کو محبت کرے گا

گویا وہی شخص خدا کی محبت کا سچا دعویدار کہا جا سکتا ہے جو اس کے رسول کے ایک ایک نقش قدم کو اپنا اسوہ بناتا ہے۔ اور یہ حقیقت کسی بحث یا تشریح کی محتاج نہیں کہ رسول کی اطاعت و عبادت ہی تحقیق عبودیت کا دوسرا نام ہے۔ پھر قرآن نے ایک قدم اور آگے بڑھ کر حب الٰہی اور حب رسول کا ایک اور نمایاں معیار مقرر فرما دیا ہے، اور وہ ہے جہاد فی سبیل اللہ۔ جہاد کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ کے مامورات سے انتہائی شیفتگی اور اس کے منہیات سے مکمل نفرت۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ان خاص بندوں کا جو اس کے محبوب ہیں اور جن کا وہ محبوب ہے، نشان امتیاز یہ قرار دیا ہے کہ:-

اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ یُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ — وہ مومنوں کے سامنے نہایت فروتن ہوتے ہیں لیکن کافروں کے لیے نہایت سخت۔ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے رہتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اس امت کی محبت اور عبودیت امم سابقہ کے مقابلہ میں زیادہ کامل و اکمل ہے۔ اور اس امت کے اندر اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم بہ نسبت اور لوگوں کے زیادہ کامل ہیں یا پھر وہ لوگ جو اصحاب رسول کا سچا نمونہ بن جائیں۔ جو ان سے جتنی ہی زیادہ عملی ہمرنگی پیدا کرے گا اتنا ہی زیادہ کامل العبودیت ہوگا۔

ایک طرف محبت الٰہی کا یہ معیار اور نمونہ عمل سامنے رکھیے، پھر ان لوگوں کے اقوال اور کردار پر نظر ڈالیے جو اپنے کو خدا کی محبت کا اور اس کی محبوبیت کا اجارہ دار سمجھتے ہیں، حالانکہ رسول کی سنت اور اس کی اطاعت کی دن رات دھجیاں اڑاتے رہتے ہیں اور ایسے عقائد و تصورات رکھتے ہیں جو دین و شریعت کی بنیاد ہی ڈھا دیتے ہیں۔

پس اتباع شریعت اور جہاد فی سبیل اللہ ہی وہ سب سے بڑا فرق و امتیاز ہے جو خدا کے سچے عاشقوں اور غلط کار مدعیوں کے درمیان پایا جاتا ہے جس کے ذریعہ ان اولیاء اللہ کے جو واقعۃً خدا کے محب اور محبوب ہیں، اور ان مدعیان محبت کے درمیان تمیز کی جا سکتی ہے جو دعوائے محبت کے ساتھ مخالف شرع امور یعنی اپنی جی کی گھڑی ہوئی بدعات کا اتباع کرتے رہتے ہیں یا محبت کا یہ خود ساختہ مفہوم لیتے ہیں کہ خدا کی پیدا کی ہوئی ہر چیز سے محبت کی جائے حتیٰ کہ کفر و فسق و عصیان جیسی چیزوں سے بھی۔

غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہی وہ خطرناک غلط فہمی تھی جس نے یہود اور نصاریٰ کو ڈبو دیا۔ ان نام نہاد صوفیائے اسلام کا دعوائے محبت بھی انھیں اہل کتاب کے اِدّعائے محبت کی طرح کا ہے جو کہا کرتے تھے کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے لاڈلے ہیں۔ گو اس لحاظ کہ ان کا کفر ان کے کفر کی حد تک نہیں پہنچا ہے، انھیں یہود و نصاریٰ کے برابر گمراہ نہیں کہا جا سکتا لیکن اگر ایک اور پہلو سے دیکھا جائے تو ان کا دعویٰ ان یہودیوں اور نصرانیوں کے دعوے سے بھی بدتر اور مہلک تر ہے کیونکہ اس کے اندر مخالفت شرع کے ساتھ ساتھ نفاق کے جراثیم بھی موجود ہیں اور معلوم ہے کہ منافقین کا مستقر دوزخ کے سب سے نچلے طبقہ میں ہوگا۔

محبت الٰہی کی تعلیم توراۃ اور انجیل میں بھی اسی طرح موجود ہے جس طرح قرآن میں۔ اور ان کتابوں کے الفاظ و عبارات اور اصل تعلیمات کے بارے میں خود ان کے پیروؤں کے درمیان شدید اختلافات ہیں تاہم اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ محبت الٰہی کی تعلیم کے اصلی ہونے میں کسی گروہ کو اختلاف نہیں۔ بلکہ یہ تعلیم ان کے ہاں "ناموس" کی سب سے بڑی اور بنیادی وصیت تسلیم کی جاتی ہے۔ انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰ نے فرمایا، مسیح کی سب سے بڑی وصیت یہ ہے کہ "تو خداوند کی محبت کر، اپنے پورے قلب اور اپنی پوری عقل اور اپنی پوری روح کے ساتھ۔" چنانچہ آج بھی نصاریٰ کو اس امر کا دعویٰ ہے کہ وہ اس حب الٰہی پر قائم ہیں۔ اور ان کے اندر جو زہد اور عبادت پائی جاتی ہے وہ اسی وصیت کا اثر ہے۔ لیکن واقعہ کیا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی محبت سے بالکل تہی دامن ہو چکے ہیں کیونکہ وہ ان چیزوں پر عمل نہیں کرتے جو خدا کو پسند ہیں بلکہ ان چیزوں پر عمل کرتے ہیں جو خدا کو مبغوض ہیں، انھیں رضائے الٰہی کی پروا ہی نہیں، جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کے سارے اعمال حبط کر دیے ہیں۔ ادھر وہ محبوبیت کے نشہ میں مست، ادھر اللہ تعالیٰ انھیں اپنے باغیوں اور ملعونوں کی فہرست میں شامل کر چکا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کو اپنا محبوب اور مورد لطف و کرم رکھتا ہے جو فی الحقیقت اس کے محب ہوں، پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ بندہ تو خدا سے محبت رکھتا ہو اور خدا کو اس سے کوئی محبت نہ ہو! بلکہ واقعہ یہ ہے کہ خدا سے بندہ کو جتنی محبت ہوتی ہے خدا کو بھی اتنی ہی محبت اس سے ہوتی ہے اور عنایت مزید یہ ہوتی ہے کہ اس کا اجر اس کی بہ نسبت کہیں زیادہ دیتا ہے جیسا کہ حدیث قدسی میں ہے کہ:

"جو شخص میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے میں اس کی طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہوں اور جو میری طرف ایک ہاتھ قریب آتا ہے میں اس کی طرف ایک گز قریب ہو جاتا ہوں۔ اور جو میری طرف پیدل آتا ہے میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔"

قرآن کو دیکھیے تو قدم قدم پر یہ الفاظ ملتے ہیں "اللہ متقیوں سے محبت رکھتا ہے"، "اللہ احسان کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے"، "اللہ توبہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے" وغیرہ۔ نہ صرف یہ بلکہ نصوص تو یہ بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انھیں لوگوں کو اپنی محبوبیت کی سند افتخار عطا فرماتا ہے جو واجبات سے گذر کر نوافل پر کثرت سے عمل کرنے لگتے ہیں۔ مشہور حدیث قدسی ہے:

"بندہ نوافل کے ذریعہ میرے قریب ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ میرا محبوب ہو جاتا ہے۔ اس وقت میں ہی اس کے کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے...... الخ"

اہل زہد و ریاضت کی خام خیالیاں۔

اللہ تعالیٰ کی محبوبیت اور محبت کا یہ معیارِ اسلامی نگاہ میں رکھیے اور اس کے بعد ایسے پر خود غلط زہاد کے مزعومات پر نظر ڈالیے جو زہد و عبادت کی چند مخصوص چیزوں پر تندہی کے ساتھ عمل پیرا رہتے ہیں۔ مگر کتنے ہی امور ایسے ہیں

جن میں وہ شریعت کی خلاف ورزی کرتے رہتے ہیں۔ اور اللہ کی راہ میں مجاہدہ کرنے کا تصور تک نہیں رکھتے مگر اس کے باوجود ــــ مخالفتِ شرع اور بےپرواہی کے باوجود ــــ خدا کی محبت کے مدعی ہیں۔ اور بعض ویسی ہی خام خیالیوں میں مبتلا ہیں جس میں نصاریٰ مبتلا تھے۔ یہ لوگ اپنے اس محدود تصورِ دین کے اثبات میں اسی قسم کی باتوں سے حجت پیش کرتے ہیں جن کی نصاریٰ نے آڑ لی ہے، یعنی یا تو قرآن و حدیث کے متشابہ الفاظ کی حسبِ خواہش تاویلیں کرتے ہیں، یا پھر ایسے اقوال و حکایات پر اپنے استدلال کی عمارت اٹھاتے ہیں جن کے قائل کی صداقت اور حق پسندی کا ثبوت نہیں اور اگر بربنائے حسنِ ظن اس کی صداقت شعاری تسلیم ہی کر لی جائے تو بھی اس امر واقعہ سے کون انکار کر سکتا ہے کہ وہ معصوم نہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود یہ لوگ اس کی باتوں کو وحیِ آسمانی کی طرح واجب الاتباع مانتے ہیں جس کا دوسرے لفظوں میں یہ مطلب ہوا کہ جس طرح نصاریٰ نے اپنے علماء اور مشائخ کو شارعینِ دین کا منصب دے رکھا تھا یہ لوگ بھی اپنے مرشدوں اور پیشواؤں کو در اصل اپنا شارعِ دین سمجھتے ہیں۔ اور انجام کار نوبت یہاں تک بھی پہنچ جاتی ہے کہ عبودیت کی جڑ پر آرہ چلا دیتے ہیں اور یہ دعویٰ کرنے لگتے ہیں کہ خواص، عبدیت کی حدود پار کر جاتے ہیں، جیسا کہ عیسائی حضرت مسیحؑ کے بارے میں دعویٰ کرتے ہیں۔ حالانکہ دینِ حق تو نام ہے اللہ تعالیٰ کی کامل و مکمل عبدیت کی تحقیق کا اور عبدیت کا مدعا رت ہے اللہ عز و جل کی انتہائی اور ہمہ گیر محبت سے، ایک کی کمی دوسری شے کی کمی کا ثبوت ہے اور غیر اللہ کی محبت در اصل اس کی عبدیت کا اور غیر اللہ کی عبدیت فی الحقیقت اس کی محبت کا نشان ہے۔ غیر اللہ کی محبت ــــ اگر اللہ ہی کے لیے نہ ہو تو وہ ــــ جبینِ حق کا داغ ہے، اور جس عمل کا ہدف رضائے الٰہی نہ ہو ماسوا ہمہ حسرت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ایمان کی نگاہ میں یہ دنیا و مافیہا سب کا سب ملعون ہے سوا اس کے جو اللہ ہی کے لیے ہو، اور اللہ کے لیے وہی شے ہو سکتی ہے جو اللہ اور اس کے رسول کو پسند ہو اور اللہ اور رسول اللہ کی پسندیدہ چیز وہی ہے جس کی رسول نے اپنے اقوال و افعال کے ذریعہ تعلیم دی ہے۔ پس جو عمل خدا کے لیے نہ ہو وہ بھی مردود (انما الاعمال بالنیات الخ) اور جو عمل اسوۂ رسول کے مطابق نہ ہو وہ بھی مردود (من عمل عملا لیس علیہ امرنا فھو رد)۔

یہی دینِ اسلام کی بنیاد ہے، یہ بنیاد جتنی محکم اور استوار ہوگی اتنی ہی دین کی حقیقت کا وجود ہوگا۔ یہی مقصد تھا آسمانی کتابوں کے نزول کا اور یہی غایت تھی انبیاء کرام کی بعثت کی۔ اسی کا آخری داعیِ اسلام نے بھی پیغام سنایا، اسی کے لیے اس نے اپنے جسم و روح کی ساری قوتیں وقف کر رکھی تھیں۔

آفاتِ نفس (شرک) اس مقامِ عبدیت تک پہنچنے میں نفسِ انسانی کی بعض زبردست کمزوریاں روک بن جاتی ہیں، ان میں سے سب سے بڑی اور بنیادی شے میلانِ شرک ہے۔ شرک نفسِ انسانی کی ایک غالب اور قاہر بیماری ہے، یہاں تک کہ اس امت میں بھی اس کے مخفی جراثیم پائے جاتے ہیں جو توحید کی تنہا علمبردار ہے اور اس کی خبر خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔ چنانچہ صحابہ کرام اس سے محفوظ رہنے کی فکر سے کبھی غافل نہیں رہتے تھے۔ حضرت صدیق اکبر نے پیغمبر صلعم سے پوچھا کہ جب شرک پائے مور کی آہٹ سے بھی زیادہ مخفی ہوتا ہے (جیسا کہ حضور فرماتے ہیں) تو بھلا ہم اس کے حملہ سے کیونکر بچ سکتے ہیں" ارشاد ہوا کہ "آؤ میں ایک ایسا کلمہ شفا بتا دوں جو تمہیں ہر چھوٹے بڑے شرک سے محفوظ رکھے گا، تم خدا سے دعا کیا کرو کہ:۔

اللھم انی اعوذ بک ان اشرک بک وانا اعلم واستغفرک لما لا اعلم۔

خدایا! میں اس بات سے تیری پناہ مانگتا ہوں کہ جان بوجھ کر تیرا ساجھی ٹھیراؤں اور اس شرک سے تیری مغفرت چاہتا ہوں جس کا مجھے علم نہ ہو۔"

حضرت عمرؓ دعا مانگا کرتے تھے کہ :-

اللھم اجعل عملی کلہ صالحاً واجعلہ لوجھک خالصاً ولا تجعل لاحد فیہ شیئاً۔

اے اللہ میرے ہر عمل کو صالح اور اپنے ہی لیے خالص بنا اور اس میں کسی اور کا کوئی حصہ نہ بنا۔

حب جاہ و مال

نفسیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ گو نا نفس انسانی پر ایسی مخفی آرزوئیں چھائی رہتی ہیں جو خدا کی حقیقی محبت و بندگی اور اخلاص کے پودے کو پروان چڑھنے نہیں دیتیں۔ شداد بن اوسؓ نے اہل عرب کو مخاطب کر کے فرمایا کہ " اے اہل عرب ! مجھے تمھارے بارے میں سب سے زیادہ جس چیز کا خوف ہے وہ ریا اور شہوت خفیہ (یعنی جاہ و حشمت کی خواہش) ہے۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عظیم ترین مہلکۂ ایمانی سے ان لفظوں میں تنبیہ کیا ہے :-

" دو ایسے بھوکے بھیڑیے، جو بکریوں کے کسی باڑے میں چھوڑ دیے جائیں، ان بکریوں کے لیے اتنے خطرناک نہیں جتنی مال اور جاہ کی حرص، دین و ایمان کے لیے خطرناک ہے۔" (ترمذی)

معلوم ہوا کہ جس سینہ میں بیچا اور صحیح دین ہوگا اس میں حرص مال و جاہ کا وجود ممکن نہیں۔ جس کا سبب یہ ہے کہ جب دل محبت اور عبودیت الٰہی کا مزا پا لیتا ہے تو پھر اس کی نگاہ میں کوئی شے اس سے بڑھ کر مرغوب نہیں رہ جاتی کہ وہ اس کی طرف مائل ہو سکے۔ یہی وہ چیز ہے جو اہل اخلاص کے لیے برائیوں اور بدکاریوں سے محفوظ رہنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم سے مترشح ہوتا ہے :-

كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ۔

اسی طرح ، تاکہ ہم یوسف سے برائی اور بے حیائی کو دور رکھیں۔ یقیناً وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے تھا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ بندہ مخلص محبت الٰہی اور خدا پرستی کا وہ ذوق رکھتا ہے جو اس کو غیر خدا کی محبت اور بندگی سے روک دیتا ہے کیونکہ اس کے دل کے لیے کوئی شے ایمان سے زیادہ شیریں، لذیذ، خوش آیند اور پرکشش نہیں رہ جاتی اور یہ کیفیت باطن تقاضا کرتی ہے کہ قلب اللہ تعالیٰ کی طرف کھنچ اٹھے اور پھر ہمہ دم اسی کی طرف جھکا رہے، اسی کے ذکر میں مشغول ... ڈ کے خوف سے لرزاں اور اسی کی نوازشوں کا امیدوار رہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :-

مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبِۨ ..... الخ۔

جو غیب میں خدائے رحمٰن سے ڈرتا رہا اور اس کے حضور رجوع و انابت سے بھرا ہوا دل لے کر حاضر ہوا ..... الخ۔

یہ اس لیے کہ محبت کا فطری تقاضا ہی یہ ہے کہ محب اگر ایک طرف وصال محبوب کی امیدوں سے سرشار ہوتا ہے تو ساتھ ہی حصول مراد کی ناکامیوں کے تصور سے مضطرب بھی رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کا بندہ اور اس کا محب ہمیشہ خوف اور رجاء کے مشترکہ یا منفعل جذبات محسوس کرتا ہے۔ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ کے الفاظ اسی حقیقت کے آئینہ دار ہیں۔

اس کے بالمقابل اس شخص کو لو جو اس دولت اخلاص سے بے بہرہ ہے۔ طلب و ارادہ اور محبت مطلق تو بہر حال اس کے دل میں بھی ہوگی کہ طلب و محبت انسانی فطرت کے لوازم میں سے ہے۔ لیکن جس طرح ایک کمزور شاخ ہوا کے ہر اشارے پر جھک جانے کے لیے تیار ہو جاتی ہے، بعینہ اسی طرح ایسا آدمی بھی نور اخلاص سے محرومی کے باعث کسی بھی دروازے پر جھک سکتا ہے اور اپنے اس جذبۂ محبت کو جس آستانہ پر چاہے بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔ کبھی حسن صورت پر ریجھتا ہے تو ایسے ایسے پست اور ذلیل افسانوں

کا غلام بن کر رہ جاتا ہے جو عام حالات میں خود اس کی غلامی کی بھی اہلیت نہیں رکھتے۔ اور کبھی شوقِ نمود اور تمنائے ریاست کا دیوانہ بن جاتا ہے تو ذرا سی بات پر مگن ہو جاتا ہے اور معمولی سی بات پر آپے سے باہر، خوشامدیوں کا غلام بن جاتا ہے، اگر یہ وہ اس کی کتنی ہی جھوٹی تعریف کریں، اور ملامت گروں کے خون کا پیاسا ہو جاتا ہے، اگرچہ ان کی ملامت کتنی ہی مبنی بر صداقت کیوں نہ ہو۔ اور کبھی مال و دولت کا حلقۂ عبدیت اپنی گردن میں ڈال لیتا ہے۔ غرضیکہ جو دل فریب چیز بھی سامنے آگئی اس نے اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا۔ انجام کار اس کی خواہشِ نفس ہی اس کا معبود ہو جاتی ہے، پھر زندگی کا جو قدم بھی وہ اٹھاتا ہے ہدایتِ الٰہی سے بے نیاز ہو کر ہی اٹھاتا ہے۔

نفسِ انسانی کی یہی دو حالتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو وہ اللہ واحد کا مخلص پرستار رہے یا پھر مخلوقات کا بندہ ہو کر رہے اور مختلف قسم کے شیاطین اس کے دل و دماغ پر چھا جائیں۔ تیسری کوئی راہ نہیں ہے۔ کیونکہ قلبِ انسانی اگر ماسوا سے کٹ کر اللہ واحد کا گرویدہ نہیں ہے تو شرک کی نجاستوں سے اس کا آلودہ ہونا ایک امرِ یقینی ہے۔ قرآن مجید جس ایمان کا مطالبہ کرتا ہے اس کی حقیقت اس سے ذرا بھی مختلف یا کم نہیں ہے۔ فرماتا ہے:۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ...... ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔

پس تو اپنے رخ کو، یکسو ہو کر، دینِ اسلام کی طرف سیدھا کر ...... یہی فطری دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اس کی طرف جھکتے ہوئے، اور اس سے ڈرو اور نماز قائم کرو اور مشرکوں میں سے نہ ہو۔

تمام بنی نوعِ انسان انہی دو گروہوں میں منقسم ہیں۔ ایک تو حنیف و مخلص بندوں کا گروہ جو خدا ہی کی محبت اور عبودیت اور مخلصانہ طاعت کا علمبردار ہے۔ دوسرا مشرکین کا گروہ جو ہوائے نفس کا پرستار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم اور آلِ ابراہیم کو پہلے گروہ کا امام قرار دیا ہے، جس طرح اس نے فرعون اور آلِ فرعون کو دوسرے گروہ کا پیشوا قرار دیا ہے:۔

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا ...... الخ

اور ہم نے ابراہیم کو بخشے اسحاق اور یعقوب بطورِ عطیہ، اور ان میں سے ہر ایک کو ہم نے صالح بنایا اور ہم نے ان کو امام بنایا جو ہمارے حکم کے مطابق لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے۔

فرعون اور آلِ فرعون کے متعلق فرمایا:۔

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ... الآیۃ

اور ہم نے ان کو گمراہی کا لیڈر بنایا جو لوگوں کو آگ کی طرف بلاتے تھے۔

فتنۂ وحدۃ الوجود اس گروہ فرعونی کی ضلالت کی ابتداء اس غلط نظریہ سے ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور قضا، مرضی اور مشیت دونوں ایک چیز ہیں، اور انتہا اس کفرِ خالص پر ہوتی ہے کہ خالق اور مخلوق دونوں ایک ہی شے ہیں۔ جو خالق ہے وہی مخلوق ہے اور جو مخلوق ہے وہی خالق ہے۔ ان کو یہ اصرار ہے کہ مخلوق بھی خالق کی ہم پلہ ہے حالانکہ ابراہیمؑ کا اعلان یہ ہے کہ "تم اور تمہارے گمراہ آباؤ اجداد نے جن چیزوں کو معبود بنا رکھا ہے وہ سب کے سب، ماسوا پروردگارِ عالم کے، میرے دشمن ہیں"۔ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ۔

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں، ان لوگوں کے مسلک کی بنیاد بعض مشائخ کے متشابہ اقوال پر ہے، یہ غریب دبتحارتاویل اور زیغ قلب وفکر کی اسی بیماری میں مبتلا ہو گئے جس کے شکار نصاریٰ ہو گئے تھے۔

فنا

ان متشابہ اقوال میں سے مثال کے طور پر ایک مشہور عام لفظ فنا کا لے لو اور دیکھو کہ اس ایک لفظ کے پردہ میں کیسے کیسے خطرناک اور سراپا الحاد فتنے چھپے ہوئے ہیں۔

فنا کے تین درجے ہیں، ایک درجہ تو وہ ہے جو انبیائے کرام اور اولیائے کاملین کو حاصل تھا، دوسرا درجہ عام صلحائے امت اور کم مرتبہ اولیاء کا ہے۔ تیسرا درجہ منافقوں اور ملحدوں کا حصہ ہے۔

پہلے درجہ کی حقیقت یہ ہے کہ عابد کی نگاہ میں اللہ کے سوا ہر شے بے حقیقت ہو کر رہ جائے، خدا ہی سے محبت ہو، اسی کی بندگی ہو، اسی پر بھروسہ ہو اور اسی سے ہر طرح کی مدد چاہی جائے۔ بندگی کا کمال یہ ہے کہ بندہ وہی پسند کرے جو خدا کو پسند ہو اور اسی چیز سے محبت رکھے جو خدا کو محبوب۔ مثلاً ملائکہ، انبیاء اور صلحاء۔ جس دل پر یہ حالت طاری ہو جائے اس کو قرآن نے "قلب سلیم" کہا ہے۔ سلیم کے معنی ہیں محفوظ، قلب سلیم وہ قلب ہے جو ماسوائے اللہ سے یا ماسوائے عبادت الٰہی سے یا ماسوائے مراد الٰہی سے یا ماسوائے محبت الٰہی سے پاک اور محفوظ ہو۔ خدا کی محبت اور بندگی کے اس مقام کو آپ فنا کے لفظ سے تعبیر کریں یا کسی اور لفظ سے، ہمیں اس سے چنداں بحث نہیں ہے، البتہ یہ حقیقت ہے کہ اصلی اسلام یہی ہے۔

دوسری قسم فنا کی یہ ہے کہ ماسوا کے شہود سے قلب یکسر بے نیاز ہو جائے۔ اکثر سالک اسی کیفیت میں رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دل خدا کی محبت، عبادت اور اس کے ذکر کی طرف پوری طرح کھنچ اٹھتے ہیں اور چونکہ دل کمزور ہوتے ہیں اس وجہ سے مشاہدہ جلال وجمال خداوندی سے ایسے مرعوب و متحیر ہو جاتے ہیں کہ ان میں اتنی قوت باقی نہیں رہ جاتی کہ ماسوا کو دیکھ سکیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غیر اللہ کا ان کے دلوں میں سرے سے گذر ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ اس کا احساس تک کھو بیٹھتے ہیں۔ یہی کیفیت قلبی تھی ام موسیٰ کی جب حضرت موسیٰ کو موجوں کے دوش پر بحکم الٰہی سوار کرایا گیا اور جس کے متعلق قرآن نے فرمایا ہے کہ:۔

وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا . . . . الآیہ۔ — موسیٰ کی ماں کا دل "خالی" ہو گیا۔

"خالی ہو گیا" یعنی موسیٰ کے ذکر وفکر کے سوا ہر شے سے خالی ہو گیا۔ اس میں صرف موسیٰ ہی موسیٰ رہ گئے۔ یہ کیفیت ایسے اشخاص پر بالعموم طاری ہو جایا کرتی ہے جن کو محبت یا خوف یا رجا کے کسی غیر معمولی جذبہ سے یکایک سامنا ہو جاتا ہے، اس وقت ان کے دل میں اس شے کے سوا جس سے محبت یا خوف یا رجا کا جذبہ وابستہ ہے کسی اور چیز کا تصور نہیں رہ پاتا۔ پس ذکر الٰہی میں بھی اس صورت حال کا پیش آنا ایک امر واقعہ ہے، اور جب کسی ذاکر کو یہ مرحلہ پیش آ جاتا ہے اس وقت من و تو کی تمیز اٹھ جاتی ہے، وہ اپنے محبوب کو پا کر خود اپنے وجود سے غافل ہو جاتا ہے اور اپنے مشہود میں محو ہو کر اپنے آپ کو بھی فراموش کر بیٹھتا ہے، اس کی نگاہ باطن صرف ایک ذات ازلی و حقیقی یعنی اللہ تعالیٰ ہی کو موجود باقی ہے اور باقی ساری کائنات اس کے لیے فنا ہو جاتی ہے۔ جب یہ کیفیت شدت و قوت اختیار کر لیتی ہے اور ساتھ ہی سالک کا دل اتنا کمزور بھی ہوتا ہے کہ من و تو کے امتیاز میں حیران سا رہ جاتا ہے تو اس کے ذہن پر یہ گمان مستولی ہو جاتا ہے کہ وہی آپ اپنا محبوب ہے۔

یہ وہ مقام ہے جس کی تمیز اور معرفت میں کتنی ہی قوموں نے ٹھوکریں کھا کر اپنے آپ کو گمراہی کے گڑھے میں ڈال دیا

انھوں نے اس کیفیت کو "اتحاد" سمجھ لیا یعنی یہ کہ یہ وہ مقام ہے جہاں عاشق اپنے محبوب میں جا ملتا ہے اور پھر ان دونوں کے وجود میں کوئی فرق، کوئی غیریت اور کوئی دوئی نہیں رہ جاتی بلکہ دونوں مل کر ایک وجود ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ صریح غلطی اور نادانی ہے کیونکہ خالق کے ساتھ کوئی چیز بھی متحد نہیں ہو سکتی اور خالق کیا، کوئی چیز بھی کسی دوسری چیز کے ساتھ متحد نہیں ہو سکتی سوائے اس کے کہ وہ دونوں اپنی ماہیت سے دست کش ہو جائیں یا ان میں فساد رونما ہو جائے یا ان دونوں کے ملنے سے ایک تیسری شے پیدا ہو جائے جو ان دونوں میں سے ہر ایک سے مبائن حقیقت رکھتی ہو، جس طرح پانی اور دودھ یا پانی اور شراب مل کر ایک تیسری شے بن جاتے ہیں کہ پھر نہ اسے پانی کہہ سکتے ہیں نہ دودھ نہ شراب۔ اور ظاہر ہے کہ ذات باری کے متعلق ان میں سے کسی صورت اتحاد کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے عاشق خدا اور خدا کا متحد ہونا ایک امر ناممکن ہے۔ ان دونوں کی مراد اور مرضی میں اتحاد ہو سکتا ہے ان کی پسند اور ناپسند میں یکسانی ہو سکتی ہے کہ جو چیز محبوب کو بھلی معلوم ہو اس کو بھی بھلی لگے اور جس چیز سے محبوب کو نفرت ہو اس کو بھی نفرت ہو، جس کو محبوب دوست رکھتا ہو اس کو وہ بھی دوست رکھے اور جس کو محبوب دشمن سمجھتا ہو اس کو وہ بھی دشمن سمجھے۔ یہی اتحاد ممکن ہے اور واقعہ یہ ہے کہ یہی اور صرف یہی اتحاد ہوتا بھی ہے۔

فنا کی یہ نوعیت اپنے اندر گوناگوں نقائص رکھتی ہے اور اولیائے کاملین مثلاً حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ اور دیگر اکابر مہاجرین و انصار سابقین میں سے کوئی بھی اس میں نہیں پڑا، اور انبیائے کرام کا تو ذکر ہی کیا۔ فنا کی یہ قسم صحابہ کے بعد عالم وجود میں آئی ہے کیونکہ اس فنا کا مولد و منشاء دراصل ضعف قلب ہے اور صحابہ کے قلوب واردات ایمانی کا تحمل کرنے میں اتنے کامل، اتنے قوی اور اتنے ثابت و ضابط تھے کہ کسی حال میں بھی ان کی عقلیں معطل نہ ہوتی تھیں، نہ ان پر کوئی ضعف طاری ہوتا تھا نہ کوئی سُکر، نہ کبھی ان پر غشی کی حیرانی طاری ہوتی تھی، نہ وجد و حال کی وارفتگی۔ ان باتوں کی ابتداء تو بصرہ کے تابعین سے ہوئی ہے۔ سب سے پہلے وہیں یہ بات دیکھنے میں آئی کہ بعض لوگوں نے قرآن سنا اور اس کے جلال کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو گئے۔ اور بعض کی اسی عالم میں روح بھی پرواز کر گئی۔ مثلاً ابوجہیر اور زرارہ بن اوفی قاضی شہر۔ پھر یہ سلسلہ آگے چلا اور شیوخ صوفیہ میں سے بھی ایسے لوگ گذرے ہیں جن پر فنا و سُکر کی ایسی کیفیت طاری ہوئی جس نے ان کی قوت تمیز کو ناکارہ کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ اسی عالم مدہوشی میں ایسی باتیں کہہ گئے جن کی غلطی کا، درستگی حواس کے بعد، انھوں نے خود اعتراف کیا۔ جیسا کہ حضرت ابویزیدؒ، ابوالحسنؒ اور ابوبکر شبلیؒ وغیرہ بزرگوں کی بابت بیان کیا جاتا ہے۔ ان کے برخلاف حضرت ابوسلمان دارانی، معروف کرخی، فضیل بن عیاض اور حضرت جنید وغیرہ جن کے قلوب مضبوط تھے اور جن کے قوائے عقل و تمیز ہر حال میں بحال رہتے تھے کبھی اس کیفیت میں مبتلا نہ ہوئے۔ محبت و بندگی کا حقیقی کمال یہی ہے۔ جو لوگ اس نعمت کمال سے بہرہ ور ہوتے ہیں ان کی فضائے عقل میں خدا کی محبت، عبادت اور طلب کے سوا کسی غیر شے کا گذر نہیں ہوتا۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ علم اور وہ قوت تمیز ان کے ساتھ رہتی ہے جو انھیں تمام امور اور اشیاء کا ان کی اصل صورت میں مشاہدہ کراتی رہتی ہے۔ وہ اپنی بصیرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں کہ تمام کائنات اللہ تعالیٰ ہی کے امر و حکم سے قائم ہے اور اسی کی مشیت ان سب کی مدبر ہے، پھر اس سے بھی آگے بڑھ کر ان کے سامنے یہ راز فطرت بے نقاب ہو جاتا ہے کہ ساری کائنات اللہ جل مجدہ کے سامنے سر بسجدہ اور اس کی تسبیح میں مشغول ہے۔ یہ مشاہدہ ان کے لیے بڑی عبرت و موعظت کا سبب بن جاتا ہے اور ان کے اخلاق دینی، عبادت الٰہی اور خالص خدا پرستی کے جذبات کے لیے مہمیز کا کام کرتا ہے۔

قرآن جس حقیقت عبودیت کی طرف بلاتا ہے وہ یہی ہے۔ سچے مومنوں اور کامل عارفوں نے، جن کے سرتاج ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اسی عبودیت کو اختیار کیا۔ چنانچہ جب شب معراج میں آپ آسمانوں پر تشریف لے گئے اور وہاں آیاتِ الٰہی کا آپ نے نظارہ فرمایا اور پھر عبد و معبود میں ناقابلِ فہم و بیان راز و نیاز ہوئے، تو باوجودیکہ یہ قرب الٰہی کا وہ مقام تھا جو کسی کو بھی نصیب نہ ہوا مگر آپ کی حالت میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا۔ نہ کسی قسم کی خود فراموشی طاری ہوئی اور نہ آپ کی عقل و تمیز معطل ہوئی۔ بخلاف موسیٰ علیہ السلام کے کہ طور پر تجلی رب کا عکس دیکھنے کی بھی تاب نہ لاسکے اور بے ہوش ہو گئے۔

فنا کی تیسری قسم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی معبود دکھائی نہ پڑے اور خالق کا وجود ہی عین مخلوقات کا وجود قرار پا جائے گویا عبد اور معبود میں کوئی فرق نہ رہ جائے۔ فنا کی یہ تعریف ان گمراہوں اور ملحدوں کے نزدیک ہے جو حلول اور اتحاد کے قعرِ ضلالت میں جا گرے۔

کلامِ مشائخ کی صحیح تاویل

اہلِ حق و معرفت شیوخ نے جو اس قسم کے جملے کہے ہیں کہ "ما اریٰ غیر اللہ" یا "لا انظر الیٰ غیر اللہ" وغیر ذلک قرآن کی مراد ان اقوال سے یہ ہے کہ "میں اللہ کے سوا کسی کو کائنات کا پروردگار یا خالق یا مدبر یا الٰہ نہیں دیکھتا" اور "میں کسی غیر کی طرف محبت یا خوف یا امید کی نگاہیں نہیں ڈالتا" کیونکہ انسان کی نگاہ اسی چیز کی طرف اٹھتی ہے جو اس کے دل میں کوئی جگہ رکھتی ہو جس سے اسکو کوئی محبت یا خوف ہو، ورنہ جس چیز سے نہ اس کو کوئی محبت ہو، نہ کوئی عداوت، نہ کوئی طمع ہو نہ کوئی خوف، اس کی طرف اس کا دل کبھی متوجہ نہ ہوگا اور اگر کبھی اس کی نگاہ اس پر اتفاقاً پڑے گی بھی تو بالکل اسی طرح جیسے راہ چلتے کسی اینٹ پتھر پر پڑ جایا کرتی ہے۔ پس یہ ایک حقیقت ہے اور نہایت قابلِ ستائش حقیقت ہے کہ بزرگانِ دین مخلوقات پر اسی حیثیت سے نظر ڈالتے تھے اور ان کے اقوالِ مذکورہ کا یہی مدعا ہے۔ وہ ان جملوں میں توحید اور اخلاص کی اس کامل اور بے آمیز حقیقت کا اعلان فرماتے ہیں کہ بندہ کو غیر اللہ کی طرف التفات نہ کرنا چاہیے۔ اور نہ کسی ماسوا کی طرف محبت یا خوف یا رجا کی آنکھ اٹھانی چاہیے، بلکہ اس کے دل کو تمام مخلوق کے ذکر و فکر سے خالی اور بے نیاز ہونا چاہیے اور جب بھی ان کی طرف دیکھے اللہ کے نور کے ساتھ دیکھے۔ یعنی حق کے کانوں سے سنے، حق کی نظروں سے دیکھے، حق کے ہاتھوں سے پکڑے، حق کے پاؤں سے چلے، اس کائنات کی انہی چیزوں سے محبت رکھے جن سے خدا کو محبت ہو، اور ان سے نفرت کرے جن سے خدا کو نفرت ہو۔ اس دنیا کو برتنے میں اللہ سے ڈرتا رہے اور اللہ کی رضا کے معاملہ میں ساری مخلوق کی مخالفتوں اور عداوتوں سے بے خطر ہو۔ یہی وہ دل ہے جو سلیم اور حنیف ہے، جس کو عارف و موحد کہا گیا ہے اور جس کو مومن و مسلم کا خطاب زیب دیتا ہے۔ جس طرح فنا کی تیسری قسم یعنی فنا فی الوجود فرعون اور اس کے اتباع مثلاً قرامطہ وغیرہ کی تحقیق ہے اسی طرح کی پہلی قسم انبیائے کرام اور ان کے اتباع صالحین کے مخصوصات میں سے ہے۔ اور یہی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک محمود ہے۔ جتنے سچے اور قابلِ اتباع مشائخ گذرے ہیں سب کا اللہ رب السموات والارض کے متعلق یہی تصور اور اعتقاد تھا کہ وہ ساری مخلوق سے بالکل الگ اور جداگانہ ہستی ہے۔ وہ قدیم ہے اور باقی ساری موجودات حادث ہیں اور اس ذاتِ قدیم کا تمام اشیائے حادث سے الگ اور منفرد ہونا ایک امر ضروری ہے۔ انھوں نے راہِ سلوک میں پیش آنے والے امراض و شبہاتِ قلب سے بھی پوری طرح باخبر کر دیا ہے کہ بعض لوگ سلوک باطن کے دوران میں

مشاہدہ تو مخلوقات کا کرتے ہیں لیکن قلب میں قوت تمیز کے فقدان کے باعث انھیں کو خالق گمان کر بیٹھتے ہیں۔ بالکل اسی طرح ایک آدمی سورج کی شعاعوں کو دیکھ کر یہ گمان کر بیٹھے کہ یہی سورج ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہوتی۔

وحدۃ الشہود فنا کی اصطلاح سے ملتی جلتی "فرق اور جمع" کی اصطلاحیں بھی ہیں اور ان میں بھی اسی قسم کے خطرناک رسوم عبادت اور تصورات داخل ہو گئے ہیں جو فنا کی اصطلاح میں موجود ہیں۔ ایک بندہ جب مخلوقات کی گوناگونی اور کثرت پر نگاہ ڈالتا ہے تو اس کی نگاہ اور اس کا قلب دونوں ہی ان میں الجھ کر رہ جاتے ہیں، وہ مختلف چیزوں کو سامنے پاتا ہے اس لیے مختلف سمتوں میں اس کی نظریں اٹکی رہتی ہیں۔ کہیں شوق و محبت کی بنا پر، کہیں خوف کی بنا پر اور کہیں امید کی بنا پر۔ پھر قلب و نظر کے اضطراب اور تفرق کے بعد جب اس کو "جمع" کا منبع اطمینان ہاتھ آجاتا ہے تو اس کی آوارگی نظر جمعیت سے بدل جاتی ہے اور اس کا دل خدا کی وحدانیت اور عبودیت پر آکر جم جاتا ہے۔ اس وقت اس کی محبت، استعانت، خوف، رجا اور توکل کے سارے احساسات اسی ایک ذات والاصفات پر آکر مرتکز ہو جاتے ہیں۔ ایسی حالت استغراق میں بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس کے قلب کو اتنی فرصت نہیں ملتی کہ وہ مخلوقات کی طرف بھی دیکھ سکے تاکہ خالق اور مخلوق میں امتیاز کرے، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ قلب مرکز حق پر منعکف ہو جاتا ہے اور خلق سے بالقصد توجہ پھیر لیتا ہے۔ یہ فنا کی قسم ثانی سے بالکل مشابہ کیفیت ہے اور ضعف قلب کا نتیجہ ہے۔

اس کے بعد "جمع" کی ایک دوسری قسم آتی ہے۔ وہ یہ کہ ذات باری تعالیٰ پر دل سے یکسوئی کے ساتھ جم جانے کے باوجود اس کو یہ دکھائی دیتا ہو کہ تمام کائنات اللہ ہی کی قدرت سے قائم اور اسی کے حکم و تدبیر سے مصروف عمل ہے، اور یہ کہ مخلوقات کی ساری کثرت اور گوناگونی، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت میں گم اور معدوم ہے، اور یہ کہ اللہ ہی ساری مخلوق کا پروردگار، معبود، خالق اور مالک ہے۔ ایسا دل ایک طرف تو اخلاص و محبت، خوف و رجاء، توکل و استعانت، حب للہ اور بغض للہ کے جذبات ملکوتی سے لبریز اور ذات خداوندی پر مجتمع رہتا ہے اور دوسری طرف خالق اور مخلوق کا فرق و امتیاز بھی اس کی نگاہ سے اوجھل نہیں ہونے پاتا۔ یہی حقیقی شہود ہے، یہی سچی عبدیت ہے اور یہی کلمہ طیبہ کی صحیح روح ہے۔ لا الٰہ الا اللہ کی شہادت کا عملی مفہوم اس کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔ کیونکہ یہ چیز قلب میں غیر اللہ کی معبودیت کا کوئی دھندلا سا نشان بھی نہیں چھوڑتی اور حق تعالیٰ کی الٰہیت کا عمیق اور ہمہ گیر نقش اس پر بٹھا دیتی ہے، گویا ہر ایک مخلوق کی معبودیت کی نفی اللہ رب العالمین کی معبودیت کا کامل اور لازوال اثبات کر دیتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دل اسی ایک ذات پر آکر مجتمع ہو جاتا ہے اور غیر اللہ کے اضطراب انگیز تعلقات سے بالکل کنارہ کش ہو کر رہ جاتا ہے۔ پھر اس کی تمام تر توجہات کا مرکز اللہ ہی رہتا ہے اور اس کے ذکر و فکر، عشق و محبت، تعظیم و عبادت، طلب رضا و اطاعت امر اور خوف و رجا کے جذبات اسی ایک کعبۂ مقصود کے طواف میں مشغول رہتے ہیں، لیکن ساتھ ہی وہ ایک لمحے کے لیے بھی اس حقیقت کو فراموش نہیں کرتا کہ مخلوقات عالم واقعہ میں اپنا الگ اور مستقل وجود رکھتی ہیں، ایسا وجود جو وجود باری تعالیٰ سے یکسر مبائن ہے۔

اس مقام تک پہنچ جانے کے بعد وہ صحیح معنوں میں موحد بن جاتا ہے۔ چنانچہ اس راز توحید کی طرف ان احادیث سے کھلی ہوئی رہنمائی ہوتی ہے جن میں فرمایا گیا ہے کہ "سب سے افضل ذکر لا الٰہ الا اللہ ہے"۔

ذکر الٰہی کے بدعی اور غیر مشروع طریقے

بدقسمتی سے لوگوں نے یہاں بھی کج ذہنی کے نہایت خطرناک مظاہرے کیے ہیں اور اتنے واضح ارشاد کے باوجود یہ گمان کر بیٹھے کہ لا الٰہ الا اللہ کا ذکر محض عوام کے لیے ہے، اور خواص کا طریقۂ ذکر یہ ہے کہ صرف لفظ "اللہ" کا ورد کیا جائے اور خاص الخواص کو اس لفظ کے اظہار کی بھی ضرورت نہیں، ان کے لیے "یا ہو" کا ذکر کافی ہے۔ لیکن یہ کھلی ہوئی غلطی اور گمراہی ہے، اور ان کے اپنے ان دعاوی پر آیات قرآنی سے استدلال تو تحریف اور غلط بیانی کا شاہکار ہے۔ مثال کے طور پر ان کے بعض استدلالات کو لیجیے۔ آیت قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِي خَوْضِهِمْ يَلْعَبُونَ۔ سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دیکھو یہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ کہو "اللہ" معلوم ہوا کہ صرف "اللہ" "اللہ" کہنا ہی ذکر میں کافی ہے۔ لیکن ایک معمولی عقل و فہم کا آدمی بھی، جس کو قرآنی تعلیمات اور عربی اسالیب سے ذرا بھی مس ہو، سیاق کلام کو سامنے رکھ کر بادنیٰ تامل محسوس کر سکتا ہے کہ لفظ اللہ یہاں تنہا نہیں ہے بلکہ ایک پورے جملے کا ایک ٹکڑا ہے جس کو سیاق عبارت اور قرینہ مقالی کی بنا پر حذف کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ استفہام کے جواب بالعموم اسی طرح دیے جاتے ہیں کہ جملۂ سوالیہ کے بیشتر الفاظ، جن کو جواب میں دہرانا ہو، حذف کر دیے جاتے ہیں۔ اس جملہ کو اگر ظاہر کر دیا جائے تو یوں ہوگا کہ قل اللہ الذی انزل الکتاب الذی جاء بہ موسیٰ۔ کیونکہ یہ قول ان یہودیوں کے رد میں ارشاد ہوا ہے جو نزول قرآن کے بارے میں کہتے تھے کہ "مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَىٰ بَشَرٍ مِنْ شَيْءٍ۔ یعنی اللہ نے کسی بشر پر کوئی چیز نہیں اتاری ہے۔" اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر یہ حقیقت ہے کہ اللہ بشر پر اپنا کلام نہیں اتارا کرتا تو پھر بتاؤ "وہ کتاب جو موسیٰ لے کر تمہارے پاس آئے تھے کس نے اتاری تھی؟ (مَنْ أَنْزَلَ الْكِتَابَ الَّذِي جَاءَ بِهِ مُوسَىٰ)۔ پھر خود ہی فرمایا ہے کہ "اے پیغمبر کہہ دو" اللہ نے"۔ یعنی کتاب موسیٰ کو اللہ ہی نے نازل کیا تھا۔

اسم ضمیر یعنی "یا ہو" کو ذکر مشروع قرار دینے کے لیے ان لوگوں نے آیت وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللّٰهُ کو اپنی تاویلات فاسدہ کا تختۂ مشق بنایا ہے۔ ان کے نزدیک اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ "ہو" کی تاویل خدا اور راسخین فی العلم کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔" لیکن ظاہر ہے کہ کلام الٰہی کے ساتھ اس سے بڑھ کر ظلم اور کیا ہو سکتا ہے جو یہاں اختیار کیا گیا ہے۔

الغرض لفظ مفرد کے ذریعہ، خواہ وہ ظاہر ہو یا مضمر، خدا کا ذکر نہ تو سلف صالحین سے منقول ہے نہ پیغمبر نے اس کو مشروع قرار دیا ہے۔ کیونکہ ایک لفظ جملہ نہیں ہو سکتا جس کا کوئی مفید یقین مفہوم ہو۔ اس لیے اس کو ایمان یا کفر کا مدار نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ایک لفظ صرف تصور مطلق پیدا کر سکتا ہے جس پر نفی یا اثبات کا حکم نہیں لگایا جا سکتا الا آنکہ قلب میں پہلے سے کوئی ایسی معرفت اور حالت موجود ہو جو اس لفظ سے مل کر ایک متعین مفہوم پیدا کر دے، ورنہ عام حالات میں لفظ مفرد قلب کو ایک مجرد تصور کے سوا کوئی مفید یقین مفہوم نہیں بخشتا۔ اور شریعت نے جتنے اذکار تعلیم فرمائے ہیں وہ سب کے سب ایسے ہی ہیں جو بذات خود، نہ کہ کسی غیر شے کی مدد سے، مفید یقین معرفت پیدا کرنے والے ہیں۔ اس نے ہمیں اس قسم کے ذکر کی دو دھاری تلوار چلانے کی قطعی اجازت نہیں دی ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں نے یہ خطرناک کھیل کھیلا انھوں نے اس تلوار سے خود اپنی گردنیں آپ کاٹ لیں اور توحید و معرفت الٰہی کے مقام رفیع پر پہنچنے کی بجائے طرح طرح کے الحاد و زندقہ میں

اتحاد کے قعرِ ضلالت میں جا گرے۔ خصوصاً اسم مضمر یعنی "یا ہو یا ہو" کا ذکر تو خوفناک فتنوں کا سرچشمہ ہے۔ اس طریقۂ ذکر کو طریقۂ نبوی سے کوئی دور کا علاقہ بھی نہیں بلکہ سرتاپا بدعت اور ضلالت ہے۔ کیونکہ جو شخص "یا ہو یا ہو" کی رٹ لگاتا رہتا ہے اور ذاتِ باری کا اصل نام نہیں لیتا اس کے اس مبہم قول میں "ہو" کی ضمیر کا مرجع صرف وہی چیز ہو سکتی ہے جو اس کے قلب میں پہلے سے متصور ہو۔ اور یہ ایک بدیہی امر ہے کہ ہر قلب کا ہر حال میں، ذاتِ الٰہی کا صحیح تصور رکھنا اور نورِ حق سے معمور ہونا ضروری نہیں۔ وہ کبھی گمراہ ہوتا ہے، کبھی ہدایت یاب، کبھی معبود اور معبودیت کا صحیح تصور رکھتا ہے اور کبھی غلط۔ اس لیے "یا ہو" کہتے رہنے کے معنی لازمی طور پر اللہ واحد ہی کو پکارنے کے نہیں ہو سکتے، بلکہ اس امر کا بھی امکان ہے کہ جس ذات کو وہ پکار رہا ہے اس کا تصور اس کے ذہن میں اس تصور سے بالکل جداگانہ ہو جو اللہ وحدہٗ لاشریک کا ہے۔

پس یہ طریقۂ ذکر گوناگوں دشمنِ ایمان خطرات سے پر ہے اور کوئی ایک لفظ تنِ تنہا، دین میں کوئی اعتبار نہیں رکھتا اور جمہور اہلِ اسلام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ فقط ایک لفظ "اللہ" کہہ دینے پر ایمان کا حکم نہیں لگایا جاسکتا یہی وجہ ہے کہ شریعت بیضاء نے کسی کو لفظ مفرد کے ذریعہ ذکر کرنے کی اجازت نہیں دی ہے۔

یہاں قرآن مجید کی ان آیات سے دھوکا نہ کھانا چاہیے جن میں "ذکر اسم رب" اور "تسبیح اسم رب" کے الفاظ آتے ہیں۔ ان آیات میں "ذکر اسم" سے مراد یہ ہرگز نہیں ہے کہ صرف "اللہ" کا لفظ دہراتے رہو بلکہ خود قرآن کے مبلغ اور شارح نے اس "ذکر" کے مفہوم اور طریقہ کی توضیح فرما کر ہمیں بتا دیا ہے کہ ان جملوں کا ورد کرو جو اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کی تسبیح پر مشتمل ہوں۔ مثلاً جب آیت فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ نازل ہوئی تو رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ "اس حکم پر رکوع میں عمل کرو"، اور جب آیت "سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى" نازل ہوئی تو فرمایا کہ "اس حکم پر سجدہ میں عمل کرو"۔ اور پھر ان احکام پر عمل کرنے کا طریقہ یہ بتایا کہ رکوع میں "سبحان ربی العظیم" اور سجدہ میں "سبحان ربی الاعلیٰ" کہا جائے۔ معلوم ہوا کہ اسم رب کی تسبیح سے مراد ایسے جملوں کا ورد ہے جو اللہ تعالیٰ کی حمد اور پاکی کا مفہوم رکھتے ہوں نہ کہ فقط ایک لفظ "اللہ"۔ چنانچہ مسلمانوں کے لیے نمازوں، اذانوں، عیدوں اور حج کے مراسم میں جو اذکار مقرر اور مشروع کیے گئے ہیں وہ سب کے سب جملۂ تامہ ہیں نہ کہ الفاظ مفردہ۔ الفاظِ مفردہ کا ذکر، خواہ وہ ظاہر ہوں یا مضمر، سرے سے شریعت میں کوئی بنیاد ہی نہیں رکھتا چہ جائے کہ اس کو خواص اولیاء اور عارفین کاملین کا ذکرِ خصوصی کہا جائے۔ یہ تو طرح طرح کی بدعتوں اور گمراہیوں کا سرچشمہ ہے۔

سلامتی دین کی راہ

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، دین کی بنیاد دو چیزوں پر ہے، ایک تو یہ کہ اللہ ہی کی بندگی کی جائے، دوسری یہ کہ اللہ کی بندگی اور عبادت اس طریقہ پر کی جائے جو مشروع ہو، نہ کہ بدعی طریقوں سے۔ یہی حقیقت ہے جو آیت ذیل میں واضح کی گئی ہے:۔

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا۔

سو جو کوئی اپنے پروردگار سے ملنے کا اندیشہ رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ اچھے کام کرے اور اپنے رب کی بندگی میں کسی کو شریک نہ کرے۔

اور پھر یہی وہ جامع معنی ہے جو شہادتین سے ظاہر و باطن میں جلوہ گر ہے۔ کلمۂ اول لا الٰہ الا اللہ میں اس بات کا اقرار ہے کہ ہم خدا کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے اور کلمۂ ثانیہ یعنی محمد رسول اللہ میں اس امر کی شہادت ہے کہ محمد ہی وہ پیامبر ہیں جنھوں نے معبود کے احکام ہم تک پہنچائے ہیں، اس وجہ سے ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ان کے ارشادات کی تصدیق اور ان کے احکام کی اطاعت کریں۔ خدا کے اس پیامبر نے اپنے فرائض نبوت کو ادا کرتے ہوئے ان تمام باتوں اور طریقوں کی، روز روشن کی طرح وضاحت کر دی ہے جن کے ذریعہ ایک بندہ کو اپنے معبود کی عبادت کرنی چاہیے اور ان تمام طرق عبادت سے روک دیا ہے جو من گھڑت ہوں اور جن کی اصل کتاب و سنت میں نہ ملتی ہو۔ بنابریں جس طرح ہم اس امر کے مکلف ہیں کہ صرف اللہ ہی سے ڈریں، اسی پر ہر معاملہ میں بھروسہ رکھیں، اسی سے مدد مانگیں اسی کو پکاریں، اسی کو اپنی رغبتوں کا مرکز بنائیں اور صرف اسی کی بندگی کریں، اسی طرح ہمیں یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ رسول کا اتباع کریں، اس کے احکام کی بلاچون وچرا پابندی کریں اور اس کے نقوش قدم کو اپنا ہادی و رہبر بنائیں، حلال اسے جانیں جس کو اس نے حلال گردانا ہو اور حرام اسے سمجھیں جس کو اس نے حرام ٹھہرایا ہو اور دین صرف اس چیز کو مانیں جس کا اس کے قول وفعل میں نشان ملتا ہو۔

پورا قرآن انہی حقائق اور مبادی دین کی تشریحات سے بھرا ہوا ہے، اس کے جس ورق کو دیکھو عبادت اور عبودیت کا یہی مفہوم بے نقاب نظر آئے گا۔ عبادت، انابت، خشیت، استعانت، توکل، خوف اور تقویٰ کا جہاں بھی ذکر ہوگا ہر ایک کی نسبت اللہ جل مجدہٗ کی طرف ہوگی، صرف دو چیزیں ایسی ہیں جن میں اللہ کے ساتھ اس کے رسول بھی شریک ہیں، ایک تو اطاعت، دوسری محبت۔ یعنی اطاعت اور محبت جس طرح خدا کی کرنی چاہیے، اسی طرح ——— اس کی تبعیت میں ——— رسول کی بھی کرنی چاہیے۔ باقی چیزوں میں رسول کسی معنی میں بھی اللہ کے شریک نہیں بلکہ عام انسانوں کی طرح خود وہ بھی اس پر مامور ہیں کہ اللہ واحد ہی کی عبادت کریں، اسی پر بھروسہ رکھیں، اسی سے طلب اعانت کریں اور اسی کے حضور اپنی التجائیں پیش کریں۔ شیطان نے نصاریٰ وغیرہ کو اسی معاملہ میں گمراہ کیا اور وہ اپنے انبیاء اور اولیاء کو ان کے صحیح موقف پر نہ رکھ سکے، بلکہ اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی مخصوص صفات میں انھیں بھی شریک کر دیا۔ انھیں سے دعائیں اور التجائیں کرنے لگے اور انھیں پر توکل کرنے لگے۔ لیکن مومنین مخلصین کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت بخشی اور وہ صراط مستقیم پر چل کر مغضوبوں اور گمراہوں کے ملعون گروہوں میں شامل ہونے سے محفوظ رہے۔ انھوں نے دین کو اللہ ہی کے لیے خالص کیا، اپنی پیشانیاں اسی کے آستانہ پر جھکائیں، اسی کو مصیبتوں میں پکارا، اسی سے اپنی امیدیں وابستہ کیں، اسی کی بارگاہ میں عاجزانہ جھکے، اپنے معاملات کو اسی کے حوالے کر دیا اور ہر قدم پر اسی پر کامل بھروسہ رکھا۔ پھر اس کے رسولوں کی اطاعت کی، ان سے محبت کی، ان کی تعظیم و تکریم کی، ان سے دوستی اور موالات کا رشتہ استوار کیا، کٹھن گھڑیوں میں ان کے لیے جان کی بازی لگا دی، اپنے اعمال میں ان کی ہدایتوں پر کاربند رہے اور ان کے روشن کیے ہوئے چراغ سے کر زندگی کی منزلیں طے کیں۔

یہی وہ دین اسلام ہے جس کی تبلیغ واشاعت کے لیے تمام انبیاء آتے رہے اور جس کے سوا اللہ کے دربار میں کوئی اور دین مقبول نہیں۔ اور یہی ہے عبادت کی حقیقت۔ اللہ تعالیٰ ہر مومن کو اس حقیقت کی کامل معرفت عطا فرمائے اور اس کے مقتضیات کے مطابق اپنی اپنی زندگیاں ڈھالنے کا عزم اور استقلال مرحمت کرے۔

امامتِ تامّہ

یا

خلافتِ راشدہ کی حقیقت

(ماخوذ از منصب امامت از شاہ اسمٰعیل شہیدؒ)

(مترجمہ نعیم صدیقی)

خلافتِ راشدہ کی دو قسمیں خلافتِ تامہ کی دوسری تعبیر خلافتِ راشدہ یا خلافت علیٰ منہاج النبوۃ یا خلافتِ رحمت سے بھی کی جاتی ہے۔ اس منصب پر خلیفۂ راشد جب متمکن ہو گیا تو یہ قطعی ہے کہ نوعِ انسانی کی پرورش میں خدا تعالیٰ کی رحمت اپنے کمال کو پہنچ گئی۔ لیکن اس رحمتِ ربانی کے کمالِ ظہور کے ساتھ اگر بندوں کے کمالِ روحانی کو بھی فروغ حاصل ہونے لگے تو پھر تو نورٌ علیٰ نور کا سماں بندھ جاتا ہے۔ اس نکتہ کی شرح یہ ہے کہ قیامِ خلافتِ راشدہ کے ساتھ خدا تعالیٰ کی طرف سے تو رحمت و انعام کا اتمام ہو جاتا ہے لیکن اہلِ زمانہ کی سعادت اس بات میں ہے کہ پوری امتِ مسلمہ کامل اتفاق سے خلافتِ راشدہ کو قبول کرے اور خلیفۂ راشد کے اقتدار کو دل و جان سے تسلیم کرے۔ اگر اس طرح خلافتِ ربانی کا ضبط و نظم قائم ہو جائے تو سیاستِ ایمانی[1] کے معاملات صحیح طور پر تکمیل پذیر ہو سکتے ہیں۔ ایسی خلافت کو "خلافتِ منتظمہ" کہتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات زمانہ کے حالات کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ خلیفۂ راشد تو بروئے کار آجاتا ہے اور خلافت کے قیام و حفظ کے لیے سرتوڑ کوشش بھی کرتا ہے، لیکن بدقسمتی سے جمہور اہلِ اسلام کی آرا کسی طرح ایک نقطہ پر مرتکز نہیں ہو پاتیں۔ یعنی پوری امت کی ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکتی۔ پس خلافت کی اس صورت کو کہ خلیفۂ راشد کے موجود ہونے کے باوجود اور اس کی ساری سعیِ قیامِ خلافت کے باوجود نظمِ خلافت کی ہمواری حاصل نہیں ہوتی، "خلافتِ غیر منتظمہ" کہتے ہیں۔

سو اس طرح خلافتِ راشدہ کی دو قسمیں ہو گئیں:-

۱- خلافتِ منتظمہ، مثلاً خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی خلافت۔

۲- خلافتِ غیر منتظمہ، مثلاً حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خلافت۔

---

[1] یہاں شاہ صاحبؒ نے جمہور مسلمین کے اتفاقِ آرا دربارۂ خلیفۂ اسلام کو جو اہمیت دی ہے اسے نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔ اسی اہمیت کا اقتضا یہ ہے کہ حکومت الٰہیہ کا وہی خارجی ڈھانچہ قابلِ ترجیح ہے جس کے اندر جمہور مسلمین کی آرا کو دبانے کی جگہ ابھارنے کے سامان ہوں اور جس میں پراگندگیٔ افکار کے مقابلہ میں مرکزِ افکار کا زیادہ امکان ہو۔ اس کے خلاف کسی دوسری نوعیت کا خارجی ڈھانچہ جس میں امیر یا خلیفہ کے لیے رائے عامہ سے بے نیاز رہنے کی زیادہ گنجائش ہے، خلافتِ راشدہ کے حقیقی مدعا کے لیے سود مند نہیں ہے اور ایسے ڈھانچہ میں جو خلافت برسرِ عمل ہو گی وہ پہلے تو خلافتِ غیر منتظمہ کی شکل اختیار کرے گی اور پھر خلافتِ مفتونہ کی۔ (ن-ص)

ثانی الذکر صورت میں خلیفۂ راشد کے ہوتے ہوئے شیرازۂ خلافت میں جو پراگندگی پائی جاتی ہے وہ اپنی ماہیت کے اعتبار سے کچھ ویسی ہی ہوتی ہے جیسے کسی رسول کی دعوت حق کے باوجود لوگوں میں ہدایت کا ظہور نہ ہو یا کم ہو۔ مثلاً حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کا معاملہ لیجیے کہ سالہا سال کی سعی ہدایت کے باوجود تھوڑے سے نفوس کے سوا کسی نے ان کی دعوت قبول نہیں کی۔ لیکن لوگوں کے دعوت قبول نہ کرنے سے حضرت نوح علیہ السلام کی رسالت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ بالکل اسی طرح اگر لوگ خلافت پر متفق نہ ہو سکیں تو اس سے خلیفۂ راشد کی حیثیت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ پس خلافتِ غیر منتظمہ کو اگر خلیفۂ راشد کی موجودگی کے پہلو سے دیکھا جائے تو یہ خلافتِ راشدہ ہے، لیکن اگر اہل اسلام کے غیر متحد و غیر منظم ہونے کا پہلو رکھا جائے تو یہ خلافتِ راشدہ نہیں ہے چنانچہ وہ پیشینگوئی جو حدیث "الخلافۃ بعدی ثلاثون سنۃ" (خلافت میرے بعد تیس سال تک رہے گی) میں وارد ہے پہلے نقطۂ نظر کے مطابق ہے، اور دوسری طرف جو احادیث حضرت ذی النورینؓ پر خلافت کے ختم ہو جانے کی خبر دیتی ہیں وہ دوسرے نقطۂ نظر کے ماتحت ہیں، مثلاً ابوبکر ثقفی سے روایت ہے:-

ان رجلا قال لرسول اللہ صلعم رأیت کان میزانا نزل من السماء فوزنت انت و ابوبکر فرجحت انت، ووزن ابوبکر وعمر فرجح ابوبکر ووزن عمر وعثمان فرجح عمر، ثم رفع المیزان۔ فاستاءلہا رسول اللہ صلعم. فقال خلافۃ نبوۃ ثم یوتی اللہ الملک من یشاء

ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں نے (خواب میں) دیکھا کہ گویا آسمان سے ایک ترازو اتری، تو آپ اور حضرت ابوبکرؓ اس میں تولے گئے تو آپ کا پلہ بھاری رہا، پھر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ تولے گئے تو حضرت ابوبکرؓ کا پلڑا جھک گیا، پھر حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ تولے گئے تو حضرت عمرؓ وزنی نکلے۔ اس کے بعد ترازو اٹھالی گئی۔ اس پر آنحضور قدرے کبیدہ خاطر ہوئے اور (بطور تاویل) فرمایا یہ خلافت نبوت ہے۔ اس کے بعد اللہ جسے چاہے گا ملک دے دیگا۔

پھر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:-

اُری اللیلۃ رجل صالح کان ابوبکر نیط برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ونیط عمر بابی بکر ونیط عثمان بعمرؓ۔ قال جابر فلما قمنا من عند رسول اللہ صلعم. قلنا اما الرجل الصالح فرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واما نوط بعضہم ببعض فہم ولاۃ ہذا الامر الذی بعث اللہ بہ نبیہ صلعم

ایک مرد صالح کو خواب میں دکھایا گیا کہ حضرت ابوبکرؓ رسول اللہ صلعم کے ساتھ لٹکے ہوئے ہیں اور حضرت عمرؓ حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ اور حضرت عثمانؓ حضرت عمرؓ کے ساتھ۔ جابرؓ نے کہا جب ہم رسولؐ کی مجلس سے اٹھے تو ہم نے کہا کہ وہ مرد صالح تو نبی صلعم ہیں۔ رہا ان حضرات کا ایک دوسرے سے لٹکنا تو یہ اس خلافت کے حاملین ہیں جسے لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔"

خلافت منتظمہ کی دو قسمیں

خود خلافت منتظمہ کی بھی دو حالتیں ہیں۔ کبھی تو خلیفۂ راشد کی عظمت لوگوں کے مختلف گروہوں کے نزدیک مسلّم اور ایسی زبان زد خاص و عام ہو جاتی ہے کہ نہ کسی کو اس کے تسلط سے کوئی عار لاحق ہوتی ہے اور نہ کسی کو اس کے خلاف قیل و قال کی کوئی گنجائش ملتی ہے۔ اس نوعیت کی خلافت کو "خلافت محفوظ" کہتے ہیں۔ کبھی یہ ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کو خلیفہ سے کوئی وجہ شکایت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اس پر نکتہ چینی کرنے لگتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی حفاظت و نصرت کی وجہ سے ان کی فتنہ انگیزی بغاوت کی حد

تک نہیں پہنچتی، یعنی دلوں کی کدورت، انقطاعِ بیعت پر منتج نہیں ہوتی اور نظم خلافت بظاہر خلیفہ کی مرضی کے مطابق چلتا رہتا ہے، چاہے اس کے احکام بعض لوگوں کے دلوں پر گراں ہی کیوں نہ گذریں۔ اس نوعیت کی خلافت "خلافتِ مفتونہ" کہلاتی ہے۔ اس طرح خلافتِ منتظمہ کی بھی دو قسمیں ہوگئیں:-

۱۔ "خلافتِ محفوظہ"، مثلاً خلافتِ شیخینؓ۔

۲۔ خلافتِ مفتونہ، مثلاً خلافت ذی النورینؓ۔

ان میں سے خلافتِ محفوظہ جمہور بنی آدم بلکہ اس پوری دنیا کے لیے نعمت عظمیٰ اور سعادت کبریٰ کا حکم رکھتی اور اس صورت میں خلافتِ راشدہ ہر پہلو سے موجود رہتی ہے، وجود خلیفۂ راشد کے اعتبار سے بھی، ظاہری نظم ملت کے لحاظ سے بھی اور لوگوں کے مطمئن و مطیع ہونے کے پہلو سے بھی۔ لیکن خلافتِ مفتونہ کا معاملہ اس کے خلاف ہے۔ بلاشبہ اس میں خلیفۂ راشد موجود ہوتا ہے اور عوام کے مختلف طبقات میں بظاہر نظم بھی کارفرما ہے، مگر اہل زمانہ کی بے اطمینانی کے پہلو سے دیکھا جائے تو اصولاً یہ شے مفقود کے حکم میں ہے۔ اسی بنا پر بعض حدیثوں میں اشارہ ہے کہ خلافت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ختم ہو گی۔ مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

بینا انا نائم رایتنی فی قلیب، علیہا دلو، فنزعت منہا ما شاء اللہ، ثم اخذھا ابن ابی قحافہ، فنزع منہا ذنوبا او ذنوبین وفی نزعہ ضعف، واللہ یغفر لہ ضعفہ، ثم اخذھا ابن الخطاب عن ید ابی بکر، فاستحالت فی یدہ غرباً فلم ار عبقریا یفری فریہ حتی روی الناس وضربوا بعطن۔

میں سو رہا تھا کہ میں نے اپنے آپ کو ایک کنوئیں پر دیکھا جس پر ایک ڈول رکھا ہوا ہے۔ سو میں نے حسب رضائے الٰہی پانی نکالا، پھر ڈول ابن ابی قحافہ نے لیا اور اس میں سے ایک یا دو ڈول کھینچے اور ان کے کھینچنے میں کمزوری کی تھی، خدا ان کی اس کمزوری سے درگذر کرے۔ پھر ڈول ابی بکرؓ کے ہاتھ سے ابن الخطابؓ نے لے لیا اور ان کے ہاتھوں میں جاکر اس نے چرس کی شکل اختیار کر لی، جسے انھوں نے اس عمدگی سے کھینچا کہ کوئی پہلوان کیا کھینچے گا، یہاں تک کہ لوگوں نے سیراب ہو کر ڈیرے ڈال دیے۔

مگر ان مختلف صورتوں میں خلفائے راشدین کے درمیان جو فرقِ مراتب خلافت کے انتشار و انتظام کے پہلو سے پایا جاتا ہے وہ عارضی ہے۔ اس کو اصل منصب خلافت سے کوئی تعلق نہیں، جس طرح حضرات انبیائے کرام میں جو فرق مراتب ظہور ہدایت کی کمی بیشی کے اعتبار سے ہے، اس کو منصب رسالت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ نبی بہرحال نبی ہے اور خلیفۂ راشد بہرحال خلیفۂ راشد ہے۔

اب یہاں چند حقائق مطلق خلیفۂ راشد کی نسبت بیان کیے جاتے ہیں۔

اصطلاح خلیفۂ راشد کا اطلاق خلیفۂ راشد سے مراد وہ شخص ہے جو منصب امامت (نیابت انبیا) پر فائز ہو اور اس سے سیاست الٰہیہ کے تمام مطالبات پورے ہوں۔ یہ صفت جس شخص میں بھی پائی جائے وہ خلیفۂ برحق ہے، خواہ وہ ماضی میں ظاہر ہو یا مستقبل میں، اوائل امت میں نمودار ہو یا اواخر امت میں، فاطمی الحسب ہو یا ہاشمی النسب، قصوی الاصل ہو یا قریشی النسل۔

یہ وجہ کا نہ کہنا چاہیے کہ لفظ "خلیفہ" (یا خلیفۂ راشد) بمنزلہ "خلیل اللہ"، "کلیم اللہ"، "روح اللہ"، "حبیب اللہ"، "صدیق اکبر"، "فاروق اعظم"، "ذی النورین"، "مرتضیٰ"، "مجتبیٰ"، "سید الشہداء" وغیرہ کے ہے۔ یہ سارے الفاظ مخصوص القاب ہیں، جن سے ہر لقب کسی نہ کسی خاص دینی برگزیدہ ہستی کے لیے مخصوص ہے اور اس کے اطلاق سے وہی خاص ہستی متصور ہوتی ہے۔ اسی بات کو ایک

دوسرے انداز میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ "خلفائے راشدین" کی اصطلاح خلفائے اربعہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کے لیے ہرگز مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ اس لقب کو ویسا ہی ایک لقب سمجھنا چاہیے جیسے "ولی اللہ"، "مجتہد"، "عالم"، "زاہد"، "فقیہ"، "متکلم"، "حافظ"، "بادشاہ"، "امیر"، "وزیر" وغیرہ القاب ہیں۔ ان القاب میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کے اطلاق سے ایک متعین شخص مراد لیا جائے اور خاص اسی کی کسی صفت کی طرف ذہن منتقل ہو سکے۔ یہ بات نہیں، بلکہ ان کا اطلاق جس وصف پر ہوتا ہے اس سے جو بھی متصف ہوگا، اسی کو ان میں سے کوئی لقب دیا جاسکے گا۔

مختصر یہ کہ جیسے کبھی دریائے رحمت جوش میں آیا تو کسی امام ہدایت (یعنی نبی) کا ظہور ہو گیا۔ اسی طرح جب بھی اللہ کا کمالِ بندہ نوازی بروئے کار آتا ہے تو کسی امام برحق کو تخت خلافت پر جلوہ گر کر دیتا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ اسے اپنے وقت کا خلیفۂ راشد قرار دیا جائے۔ حدیث کی پیشینگوئی اس دعویٰ کی تردید نہیں کرتی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت راشدہ فقط تیس سال تک رہے گی اور اس کے بعد سلطنت کا دور آجائے گا۔ کیونکہ درحقیقت اس پیشینگوئی کا مدعا صرف اس قدر ہے کہ خلافت راشدہ بر سبیل اتصال و تواتر تیس سال تک رہے گی، یہ نہیں کہ قیام خلافت صرف اتنے ہی عرصہ کے لیے خاص ہے، بس اس کے بعد ختم۔ دوسرے لفظوں میں حدیث مذکورہ سے صرف اتنی بات اخذ ہوتی ہے کہ خلافت راشدہ کا سلسلہ تیس سال گذرنے کے بعد منقطع ہو جائے گا، مگر یہ بات اخذ نہیں ہوتی کہ اس انقطاع کے بعد ابدالآباد تک اس کا لوٹنا ممکن نہیں ہے۔ ذیل کی حدیث دورِ خلافت راشدہ کے لوٹنے پر صریحاً دلالت کرتی ہے۔

تکون النبوۃ فیکم ما شاء اللہ ان تکون، ثم یرفعھا اللہ تعالیٰ، ثم تکون خلافۃ علیٰ منہاج النبوۃ ما شاء اللہ ان تکون، ثم یرفعھا اللہ تعالیٰ ثم یکون ملکا عاضا فیکون ما شاء اللہ ان یکون ثم یرفعھا اللہ تعالیٰ، ثم تکون ملکا جبریۃ فیکون ما شاء اللہ ان یکون ثم یرفعھا اللہ تعالیٰ۔ ثم تکون خلافۃ علیٰ منہاج النبوۃ ــــ ثم سکت!

جب تک اللہ چاہے گا، دورِ نبوت تم میں رہے گا۔ پھر اللہ اسے اٹھا لے گا پھر جب تک اللہ چاہے گا، خلافت علیٰ منہاج النبوت کا دور رہے گا، پھر اللہ اسے بھی اٹھالے گا۔ پھر بادشاہی کا دور آئے گا اور جب تک اللہ چاہے گا وہ رہے گا، آخر وہ بھی اٹھالیا جائے گا۔ پھر ظلم کی حکومت آئیگی اور رہے گی جب تک اللہ چاہے گا۔ پھر وہ بھی اٹھالی جائے گی اور اس کے بعد پھر خلافت علیٰ منہاج النبوت کا دور آئے گا ــــ یہ کہہ کر آنحضور نے سکوت فرمایا۔

یہی نہیں، بلکہ یہ بات بھی ثابت ہے کہ حضرت مہدی علیہ السلام کی خلافت بہترین قسم خلافت، یعنی "خلافتِ منتظمہ" محفوظ ہوگی۔ انکی توصیف میں حدیث نبویؐ ناطق ہے:۔

لو لم یبق من الدنیا الا یوم لطول اللہ حتی یبعث اللہ فیہ رجلا من اھل بیتی یواطئ اسمہ اسمی واسم ابیہ اسم ابی، یملأ الارض قسطا وعدلا کما ملئت ظلما وجورا

اگر دنیا میں سے ایک ہی دن باقی رہ جائے تو اللہ اسے دراز کرے گا یہاں تک کہ اس میں میرے اہل بیت میں سے ایک آدمی کو اٹھائے گا جس کا نام میرے نام پر اور جس کے باپ کا نام میرے باپ کے نام پر ہوگا۔ وہ زمین کو انصاف و عدل سے ویسے ہی بھر دے گا جیسے وہ ظلم و جور سے بھر چکی ہوگی۔

پھر:۔

اتاہ ابدال الشام وعصائب اہل العراق فیبایعونہ
شام کے ابدال وعراق کی جماعتیں اس کے پاس آئیں گی اور اس کے ہاتھ پر بیعت کریں گی۔

نیز یہ کہ :-

ویعمل فی الناس بسنۃ نبیھم ویلقی الاسلام بجرانہ فی الارض
وہ لوگوں میں ان کے نبی کے طریقے پر عمل کرے گا اور زمین میں اسلام مستحکم کرے گا۔

مزید براں :-

یرضی عنہ ساکن السماء وساکن الارض لاتدع السماء من قطرھا شیئا الا صبتہ مدرارا ولا تدع الارض من نباتھا شیئا الا اخرجتہ حتی یتمنی الاحیاء الاموات
آسمان والے بھی اس سے راضی ہوں گے اور زمین والے بھی۔ آسمان بادلوں میں سے کچھ روک نہیں رکھے گا، بلکہ سب کچھ پوری طرح انڈھا دیگا اور زمین بھی نباتات میں سے کچھ نہ روک رکھے گی، بلکہ سب کچھ اگل دے گی، حتیٰ کہ زندے مردوں کی تمنا کریں گے۔

یہ بھی کہ :-

المھدی علیہ السلام یشبہ فی الخلق
مہدی علیہ السلام صورت میں آنحضورؐ سے مشابہ ہوں گے۔

یہ جس امام برحق اور جس دورِ رحمت کی بشارت احادیث میں دی گئی ہے اسے اگر آنا ہے تو پھر اس امر میں کیا شک رہ گیا کہ خلافتِ راشدہ انقطاع کے بعد لوٹ سکتی ہے[۵۱]

ب۔ ایک غلط فہمی کا ازالہ یہ خیال بھی نہ کرنا چاہیے کہ خلافت راشدہ کے فقط دو ہی ظہور ہیں، ایک وہی دورِ خلافت راشدہ جو اوائل امت میں گذرا یعنی خلفائے اربعہ کا دور اور دوسرا اواخر امت میں خلافتِ مہدی کا دور ـــــ اور ان دو دوروں کے درمیان پورا زمانہ تعطّل کا ہے[۵۲] کہ اس میں کبھی بھی خلافت راشدہ کو ظاہر نہیں ہونا ہے۔ بخلاف اس شبہہ کے اکثر تابعین نے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی خلافت کو خلافت راشدہ کے زیرِ عنوان شمار کیا ہے، بلکہ ان میں سے بعض نے تو عود خلافتِ راشدہ والی خبر (حدیث مذکورہ "تکون النبوۃ فیکم" الخ) کو حضرتِ موصوف کی خلافت کے ظہور ہی پر منطبق کیا ہے۔ مثلاً حضرت حبیب[۵۳] نے اسی حدیث کو نقل کر کے اس کے فٹ نوٹ میں یہ خوش خبری لکھ کر حضرت عمر بن عبد العزیز کو بھیجی کہ :-

ارجوا ان تکون امیر المومنین بعد الملک العاض والجبریۃ ـــــ فسر بہ واعجبہ!
مجھے امید ہے کہ آپ اس سخت اور استبدادی حکومت کے بعد امیر المومنین (خلیفۂ راشد) ہوں گے۔ (اس سے حضرت عمر بن عبد العزیز نہایت خوش ہوئے)

امیر المومنین موصوف نے اس بشارت کو قبول کیا اور یہ کہہ کر رد نہ کر دیا کہ یہ حدیث خلافتِ مہدی کی طرف اشارہ کرتی ہے، تم کیوں اسے دوسروں کی خلافت پر محمول کرتے ہو[۵۴]

[۵۱] اس سلسلہ کی پیشگوئیوں میں آمیزشوں کا بہت قوی شبہہ ہے، مگر ان کا مرکزی مضمون بجائے خود صحیح ہے یعنی نظامِ حق کے دوبارہ قیام کی خبر۔ (ن۔ص) [۵۲] یہی غلط فہمی آج بھی امت کے ناکارہ عناصر کے لیے سہولت پسندی کی ٹٹی بن گئی ہے۔ ان عناصر نے دعوتِ حق کا فریضہ ادا نہ کرنے کی گویا قسم کھائی ہے اور ان کا استدلال یہی ہے کہ مہدیؑ کی بعثت سے پہلے حق کے قیام کا کوئی امکان نہیں۔ (ن۔ص) [۵۳] یعنی شاہ صاحب یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ حدیث مورد بالا (تکون النبوۃ) المہدی کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ اس کا اطلاق اکثر تابعین کے خیال کے مطابق دوسروں پر بھی ہو سکتا ہے[۵۴]

ہمارے مدعا پر ایک اور حدیث نبوی (مسلم) شاہد ہے کہ:-

اذا رأیتم الرایات السود قد جاءت من قبل خراسان فاتوها ولو حبوا علی الثلج فان فیہا خلیفۃ اللہ المہدی

جب تم خراسان کی طرف سے کالی نشانیاں آتی دیکھو تو وہاں پہنچو، چاہے تمہیں برف کے اوپر گھسٹ کر ہی جانا پڑے، کیونکہ وہاں مہدی خلیفۃ اللہ ہوگا۔

بات صاف ہے کہ یہ مہدی مہدیٔ موعود کے علاوہ ہے، کیونکہ مہدیٔ موعود کا ظہور مدینہ منورہ سے ہوتا ہے، نہ کہ خراسان سے نیز یہ بھی ثابت ہے کہ یہ دوسرا مہدی بھی ہوگا خلیفۃ اللہ ہی۔ کیونکہ تمام مسلمانوں کو اس کی اعانت و رفاقت پر مامور کیا گیا ہے۔

ایک اور خبر نبوی بھی ملاحظہ ہو:-

یخرج رجل من وراء النہر یقال لہ الحارث حراث علی مقدمۃ رجل یقال لہ منصور، یمکن لآل محمد کما مکنت قریش لرسول اللہ۔ وجب علی کل مسلم نصرہ[1]

ماوراء النہر سے ایک شخص نکلے گا جسے "حارث حراث" کہیں گے اور منصور نامی شخص اس کا پیش رو ہوگا۔ اسے آل محمد پر قابو دے دیا جائے گا جیسے رسول اللہ کو قریش پر قابو دیا گیا ہے۔ اس کی مدد کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے۔

واضح رہے کہ اہل بیت میں سے یہ بزرگ جن کا مؤید حارث بتایا گیا ہے، مہدیٔ موعود کے علاوہ ہیں، کیونکہ مہدیٔ موعود کی تائید تو سب سے پہلے لشکر عرب کرے گا، نہ کہ ماوراء النہر کی فوجوں کا اجتماع[2]

اب اس امر میں کیا شک رہ جاتا ہے کہ خلافت راشدہ کے اوائل اور اواخری دو ادوار کے علاوہ اور ادوار بھی ہو سکتے ہیں۔ خلافت راشدہ اور مملکت ظاہرہ کا ادل بدل اس طرح ہوتا رہتا ہے، جیسے عام دنیوی نظاموں میں نظام عادلانہ اور نظام جابرانہ کا ادل بدل ہوتا ہے کہ کبھی یہ غالب ہے اور کبھی وہ متسلط۔ یونہی پہلے خلافت راشدہ کا ایک دور آتا ہے اور پھر ایک زمانہ مملکت ظاہرہ[3] کو حاصل ہوتا ہے۔ خلافت کی ان دو قسموں کا یہ ہیر پھیر بالکل گردش لیل و نہار کی مانند ہے کہ رات کی تاریکیوں کا سینہ چیر کر دن برآمد ہوتا ہے اور نور کے دریا بہا کر پھر انہیں تاریکیوں میں جذب ہو جاتا ہے، پھر ابھرتا ہے اور پھر ڈوب جاتا ہے اور یہ سلسلہ یونہی جاری رہتا ہے۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان کسی بھی زمانہ میں نعمت الٰہی کے نزول سے ناامید ہوں اور خلافت راشدہ کے ظہور کو

---

[1] معلوم نہیں کہ شاہ صاحب نے اپنے دعاوی کے استدلال کا دارومدار پیشنگوئیوں والی کمزور روایات پر کیوں جا رکھا ہے جب کہ پورا قرآن خود اس دعوت پر مبنی ہے کہ خدا کے قانون کو نافذ کرنے والا خلافت راشدہ کے سوا اور کوئی سیاسی اقتدار انسانوں کے لیے قابل قبول نہیں ہے، چاہے کوئی سا ملک ہو اور کوئی سا زمانہ، اور مسلمانوں کا کام یہی ہے کہ اگر خلافت حقہ کا نظام درہم برہم ہو جائے تو اسے از سر نو قائم کرنے کی کوشش میں لگ جائیں۔

[2] یہ پیشنگوئیاں جن میں اشخاص اور مقامات کا تعین حد درجہ واضح ہے، انہیں قابل اعتماد قرار نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشنگوئیوں کا مزاج یہ نہیں ہوتا۔ ان میں بالعموم آنے والے واقعات یا اشخاص کی دھندلی نشاندہی ہوتی ہے یہ کھلی کھلی پیشنگوئیاں دور فتنہ میں سیاسی اغراض کے لیے بد دیانت دروغ گو یا تو گھڑی ہیں یا ربما کتاب کی پیشنگوئیوں میں نمایاں علامات گھسیڑ کر انہیں اپنے ممدوحین پر چسپاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ (ن م) [3] "مملکت ظاہرہ" شاہ صاحب کی خاص اصطلاح ہے جس کی تفصیل تو آئندہ ابواب میں آئے گی۔ یہاں مختصراً یہ سمجھ لیا جائے کہ شاہ صاحب اس اصطلاح سے اس نظام سیاست کو مراد لیتے ہیں جو "اسلامی" بھی ہو اور "اسلام" سے دور بھی ہو جائے۔ (ن م)

ناممکن تصور کریں۔ اس نعمت کی بھیک ہر حال میں مجیب الدعوات سے مانگنی چاہیے اور اپنی صدائے گدایانہ کے نتیجہ خیز ہونے کی امید لگائے رکھنی چاہیے۔ ہر لمحہ اور ہر خلیفۂ راشد کے انتظار میں کٹے اور ہر قرن کے متعلق یہی توقع رہے کہ شاید اسی میں خدا کی نعمت کاملہ ظہور پائے اور شاید اسی میں خلافت ربانی کا آفتاب طلوع کرے۔[1]

ج۔ خلیفۂ راشد کی حقیقت[2] خلیفۂ راشد دنیا میں اللہ تعالیٰ کا نمائندہ اور انبیاء کی مسند پر بیٹھنے کی وجہ سے گویا نبی کے گروہ کا ایک فرد ہوتا ہے۔ اس کی ذات دین حق کی ترقی کا وسیلہ ہوتی ہے۔ وہ ملائکہ مقربین کا ہمسایہ بلکہ عالم امکان کی روح رواں ہوتا ہے اور ساری کائنات اس پر فخر کرتی ہے۔ وہ افراد انسانی کا سرتاج اور ارباب[4] عرفان کا سرخیل ہوتا ہے۔ اس کے دل پر تجلیات ربانی کا نزول[5] ہوتا ہے۔ اس کا اقبال جلالِ یزدانی کا پرتو اور اس کی محبوبیت جمال ربانی کا عکس ہوتی ہے۔ اس کا قہر تیغ قضا ہے تو اس کی مہر سرچشمۂ عطا۔ اس سے لڑنا تقدیر سے لڑنا اور اس کی مخالفت خود رب قدیر کی مخالفت ہے[6]۔ اس حیثیت کے پیش نظر اگر کسی صاحب کمالات نے اس کی خدمت[7] و اطاعت میں کمال نہ دکھایا تو اس کے کمالات بالکل رائگاں ہیں اور کسی صاحب علم کے علوم اگر اسی کی عظمت و کرامت کی شرح نہ کر سکے تو وہ قطعاً بے کار ہیں۔ پھر اگر کسی نے کمالات کے غرور میں آ کر اس کی ہم سری[8] کی تو گویا مشارکتِ حق تعالیٰ

---

[1] یہ سطور شاید آج کل کے قنوطی علماء و خواص کے لیے سرچشمہ بصیرت ثابت ہوں۔ ان کی طرف سے بالعموم دعوت حق کے جواب میں یہ اعتراض پیش کیا جاتا ہے کہ نظام حق کا قیام موجودہ دور میں ممکن نہیں ہے، بلکہ اس دور کے لیے سلطنت کفر مقدر ہو چکی ہے۔ یوں تو نظام اسلامی کے حق ماننے کے بعد کسی کے لیے چارہ نہیں رہتا کہ وہ اس کے قیام کے لیے جد و جہد نہ کرے، لیکن راہ انحراف ڈھونڈ نکالنے میں جن لوگوں کو مہارت حاصل ہے، انھوں نے نبوت کی دو ایک پیشینگوئیوں کی ڈھال پر پورے قرآن کی مرکزی دعوت کے وار کو روک دکھایا ہے۔ شاہ صاحب ان سطور کے ذریعہ اسی ڈھال کو توڑ دینا چاہتے ہیں اور مسلمانوں کو نظم حق کے قیام کے لیے اکسا دینا چاہتے ہیں۔ (ن۔ص)

[2] خلیفۂ راشد کی دینی حیثیت کو متعین کرنے سے مقصود یہ ہے کہ مسلمان ٹھیک ٹھیک جان لیں کہ اس سے کس طور سے معاملہ کرنا صحیح ہوگا، اور کس طور سے غلط۔ (ن۔ص)

[3] دین حق کے نفاذ سے نظام تمدن انسانی پورے ہنگامۂ کائنات سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے اور انسان کے تشریعی و طبعی دائرہ ہائے حیات میں کوئی فساد اور کوئی تصادم باقی نہیں رہتا۔ پس دین حق کا حفظ و قیام جس ہستی کا مرہون منت ہوتا ہے اس سے کائنات کا ایک ایک ذرہ طمانیت حاصل کرتا ہے۔ (ن۔ص)

[4] مراد یہ کہ اسلام کے اجتماعی نظم اور اس کی روح کو غالب کرنے اور اسے پروان چڑھانے کا عظیم الشان فریضہ جس نے اپنے ذمہ لیا ہو، تقویٰ و عرفان کی اونچی سے اونچی منزل اس کے قدم چومتی ہے۔ یہی منتہا ہے عبودیت و عرفان کا۔ (ن۔ص)

[5] تجلیات ربانی کے مفہوم میں وہ کیفیاتِ یقین و اذعان، وہ بصیرت دینی اور وہ صلاحیت امتیازِ حق و باطل ہے جو دین حق کے سچے خادموں کے لیے مخصوص ہیں۔ (ن۔ص)

[6] ان جملوں کا منشا واضح ہے کہ خلیفۂ راشد کا اقتدار چنگیز و ہلاکو کے اقتدار کی طرح رضائے الٰہی سے ہٹا ہوا نہیں ہے۔ وہ خدا کی حکومت کا ناظم ہے۔ پس اس ناظم سے جو الجھا اس نے درحقیقت خدا ہی سے الجھنے کی حماقت کی۔ (ن۔ص)

[7] یہاں شخصی و ذاتی خدمت و اطاعت کا ذکر نہیں ہے۔ شخصی طور پر تو خلیفہ یا امیر اگر کوئی چیز کسی سے طلب کرتا ہے یا کسی کی اعانت چاہتا ہے تو اس کی حیثیت محض ایک "سائل" کی ہے۔ (ن۔ص)

[8] قانونی و اخلاقی ہم سری کی نفی نہیں کی جا رہی، بلکہ سیاسی حیثیت میں اس کی ہم سری کو جرم قرار دیا گیا ہے، یعنی بحیثیت صاحب امر اس کو جو خاص مرتبہ نظام دینی میں حاصل ہے اس میں کسی قسم کی حصہ داری کا ادعا جائز نہیں ہے۔ اس مرتبۂ خاص کی توضیح شاہ صاحب نے آئندہ سطور میں نہایت اچھی طرح کر دی ہے۔ (ن۔ص)

راہ میں قدم رکھا۔ اہل کمال کی تو پہچان ہی یہی ہے کہ وہ خلیفۂ راشد کی خدمت و اطاعت میں اپنی پوری قوتیں صرف کردیں اور اس کی برابری کے دعویٰ سے دستبردار ہو جائیں، کیونکہ وہ صحیح معنوں میں حضور رسالتمآب کا جانشین ہے۔

زیادہ صاف لفظوں میں اگر کہنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ خلیفۂ راشد "نبی حکمی" یعنی مجازی ہوتا ہے، یعنی اگرچہ وہ فی الحقیقت نبوت و رسالت کو نہیں پہنچتا لیکن منصب خلافت پر متمکن ہونے کی وجہ سے انبیاء اللہ سے اس کو بعض امور میں مماثلتیں حاصل ہیں۔ ان مماثلتوں کا مفصل بیان تو انشاء اللہ آئندہ ابواب میں آئے گا۔ البتہ یہاں ان میں سے بطور نمونہ دو چار چیزوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ اطاعتِ خلیفہ پر نجات اخروی کا انحصار:۔۔۔ خدا کے رسولوں پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص معرفتِ الٰہی اور تہذیب نفس میں کمال حاصل کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور کیوں نہ لگا دے، نجات اخروی کا حقدار نہیں ہو سکتا۔ اور کوئی طاقت خداوند جبار کے غضب کی دہکتی ہوئی دوزخ سے اسے بچا نہیں سکتی۔ بالکل اسی طرح عبادات شرعیہ اور طاعات دینیہ کی بجا آوری میں کوئی شخص کتنا ہی خون پسینہ ایک کردے، اور اسلام کے امتثالِ امر میں کتنی ہی جد و جہد کا مظاہرہ کرے، امام وقت کی امامت کو صاف صاف تسلیم کیے بغیر اور اس کی اطاعت کے لیے گردن جھکائے بغیر خدائے قہار کی دار و گیر سے مخلصی نہیں پا سکتا۔ وہ زہد و تقدس اور وہ طاعتیں اور عبادتیں جو خلیفۂ راشد کی اطاعت سے باہر رہ کر سرانجام دی جائیں، آخرت میں رائی کے دانے جتنا وزن بھی نہیں پا سکتیں۔

ملاحظہ ہو حدیث:۔

من لم يعرف امام زمانه فقد مات ميتة جاهلية — جس نے اپنے وقت کے امام کو نہ مانا وہ جاہلیت کی موت مرا۔

پھر:۔

صلوا خمسکم وصوموا شهرکم وادوا زکوة اموالکم واطیعوا اذا امرکم تدخلوا جنة ربکم — پانچ وقت کی نمازیں ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو، اپنے مالوں کی زکوٰۃ دو، اپنے امرا کی اطاعت کرو، اپنے رب کی جنت میں داخل ہوگے۔

دوسری حدیث ہے:۔

ان الفاظ سے کوئی غلط فہمی نہ ہو، ان کا مفہوم یہ ہے کہ نبی کی حیثیت نبوت و رسالت (یعنی مورد الہام ہونا، احکام الٰہی کا مستند و عملی شارح ہونا، امت کے لیے دائمی اسوہ ہونا) میں تو خلفا شریک نہیں ہیں مگر اس کی حیثیتِ امارت (یعنی احکام الٰہی کو بندوں پر نافذ کرنے اور رضائے الٰہی کے مطابق سیاستِ ایمانی کو چلانے کا منصب) اس کے مخلص جانشینوں کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نبی کی امارت اور خلیفہ کی امارت میں فرق ہوتا ہے مگر اس فرق کے باوجود دونوں کے منصب امامت میں بہت زیادہ مماثلت پائی جاتی ہے اور دونوں قسم کی امارتوں پر اکثر حالتوں میں ایک ہی حکم لگایا جاتا ہے۔ (ن۔ص)

اسلام ایک اجتماعی دین ہے۔ اس وجہ سے یہ کسی کو اپنے نظم اجتماعی سے علیحدہ ہو کر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس نقطۂ نظر سے کوئی پرزہ خواہ کتنی ہی اچھی دھات سے ڈھالا گیا ہو اور کتنی ہی صفائی سے بنایا گیا ہو اور کتنا ہی خوبی سے اسے صیقل کیا گیا ہو، نظام حق کی مشین میں فٹ نہ ہو تو وہ دو کوڑی کی قیمت بھی نہیں پا سکتا بخلاف اس کے معمولی دھات کا ایک پیچ جو کچھ زیادہ صیقل زدہ بھی نہیں ہے، اگر نظم حق کی کل میں نصب ہو کر اس کے اجتماعی عمل میں اپنا حصہ ادا کر رہا ہے، سونے کے ساتھ تلنے کا مستحق ہے۔ (ن۔ص)

من مات ولیس فی عنقه بیعة مات میتة جاھلیة
جو شخص اس حال میں مرا کر اس کی گردن میں (امام وقت کی) بیعت کا قلادہ نہیں تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔[۱]

۲۔ احکام خلیفہ کی موافقت پر عبادات کی قبولیت کا مدار:—— یہ ظاہر ہے کہ دینی عبادات اور شرعی طاعات اگر نبوت کے مطابق ہوں تو مقبول ہوتی ہیں، ورنہ مردود۔ اسی طرح جمعہ وعیدین اور حدود و تعزیرات، اور جہاد وغیرہ فرائض کی ٹھیک ٹھیک ادائیگی صرف اس صورت میں متصور ہے کہ وہ خلیفۂ راشد کے احکام کے مطابق ہوں۔ اس کے احکام سے بے نیاز ہو کر ان فرائض کو انجام دینا آخرت میں نتیجہ خیز نہیں ہے۔[۲] آنحضور صلعم کا ارشاد ہے:۔

انما الامام جنة یقاتل من ورائه ویتقی به
امام وقت ڈھال ہے جس کی اوٹ میں جنگ کی جاتی ہے اور جس کے ذریعے حفاظت ہوتی ہے۔

نیز فرمایا کہ:۔

الغزو غزوان فاما من ابتغی وجه الله واطاع الامام وانفق الکریمة ویاسر الشریک واجتنب الفساد فان نومه ونبهه اجر کله واما من غزا فخرا ورياء وسمعة وعصى الامام وافسد فی الارض فانه لم یرجع بالکفاف
جہاد دو طرح کا ہوتا ہے۔ جو شخص اللہ کی خوشنودی چاہتا ہے، امیر کی اطاعت کرتا ہے، اپنا عمدہ مال خرچ کرتا ہے اور اپنے ساتھی کے ساتھ نرمی کرتا ہے، فساد سے بچتا ہے تو اس کا سونا اور جاگنا کل کا کل اس کے لیے اجر ہے۔ جو شخص فخر، نمائش اور شہرت طلبی کے لیے جہاد کرتا ہے اور امام کی نافرمانی اور زمین میں فساد کرتا ہے اس کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔

۳۔ معاملات انسانی میں حکم نفاذ:—— نبی وقت جب دو شخصوں کے درمیان کسی قسم کے معاملہ کے انعقاد کا حکم لگاتا ہے، مثلاً نکاح یا بیع وغیرہ امور میں، تو پھر وہ معاملہ اس حکم کی وجہ سے خود بخود منعقد ہو جاتا ہے اور پھر کسی کو اس میں چون و چرا کا حق نہیں رہتا۔ اس حقیقت کو حق جل و علیٰ نے یوں بیان فرمایا ہے:۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ
کسی مسلمان مرد اور کسی مسلمان عورت کے لیے یہ روا نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملہ میں فیصلہ دے دیں، تو اپنے معاملہ میں انھیں (پھر بھی) اختیار [illegible]

نبی کے بعد یہ سارے معاملات خلیفۂ راشد یا اس کے ماتحت قاضی کے حکم سے منعقد ہوتے ہیں۔ اس کے فیصلوں میں بھی کسی کے لیے مجال گفتگو باقی نہیں رہتی۔ جیسا کہ مختلف کتب دینی اور ان کی شرحوں میں مسئلہ "قضاء القاضی ینفذ ظاہرًا و باطنًا" (قاضی کا فیصلہ ظاہر و باطن ہر لحاظ سے نافذ ہے) کا تذکرہ صراحتہً موجود ہے۔

۴۔ حکم خلیفہ کا حجت شرعی ہونا:—— کون نہیں جانتا ہے کہ نبی کا حکم احکام شریعت کو ثابت کرنے میں دلیل کی حیثیت رکھتا ہے

---

[۱] اس نوعیت کی روایات و احادیث کو بہت غلط طریقہ سے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ ان کے متعلق یہ بات طے ہے کہ یہ خلیفۂ راشد یا امام برحق سے مخصوص ہیں۔ ان کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر امام برحق موجود نہ ہو تو ہر کس و ناکس جو بھی سامنے آئے اس کے ہاتھ پر بیعت کر لو۔ (ن۔ ص)

[۲] یعنی جمعہ و عیدین صرف امام یا اس کے نائب مجاز کی امامت میں ادا ہوں گے، اسی طرح حدود و تعزیرات کا اجرا بھی اس کے حکم کے ماتحت ہو گا اور جنگ و صلح کے معاملات بھی اسی کے حکم سے طے پائیں گے۔ یہ جائز نہیں ہے کہ امام کے فیصلہ کے بغیر جس کا جی چاہے جنگ کے لیے نکل کھڑا ہو اور جس کا جی چاہے کسی پر الزام قائم کر کے بطور خود کوئی سزا دے دے۔ (ن۔ ص)

یعنی کسی قول یا فعل میں ہزار فائدے اور نقصان نظر آئیں اور عقل لاکھ کسی امر کے حسن و قبح کو ثابت کرے، لیکن جب تک کتاب منزل اور نبیٔ مرسل کی طرف سے کوئی نص اس کے وجوب یا اس کی حرمت پر دلالت نہ کرے، اس کا فرض یا حرام ہونا شریعت میں ثابت نہیں ہو سکتا۔

بالکل ایسی ہی سیاسی معاملات سے تعلق رکھنے والے کسی قول و فعل میں کتنے ہی فوائد کیوں نہ متصور و متیقن ہوں، امام وقت یا اس کے نائب کے فیصلہ کے بغیر شرعاً انھیں کوئی اہمیت حاصل نہیں ہوگی اور اس قول و فعل کا وجوب ہرگز ثابت نہیں ہوگا۔ علیٰ ہذا القیاس کسی دعویٰ کی صحت و بطلان یا کسی حد و تعزیر کے ثبوت کے لیے سیکڑوں دلائل کا ہونا اور بیسیوں گواہوں کا گواہی دینا بالکل عبث ہے، جب تک کہ امام یا اس کے نائب کا حکم ان پر چسپاں ہو کر انھیں پایۂ ثبوت پر نہ پہنچا دے۔

پس جس طرح اصل احکام شریعت کو نص نبوی ثابت کرتی ہے، اور ان کے ساتھ مختلف امور کے حسن و قبح پر جو عقلی استدلال کیا جاتا ہے وہ محض مخاطبین کی تسلیٔ خاطر اور مخالفین کے اعتراضات کی تردید کے لیے ہوتا ہے، اسی طرح معاہدات و معاملات اور حدود و تعزیرات کا نافذ و منعقد ہونا امام اور اس کے نائب مجاز کے حکم پر منحصر ہے۔ اس حکم کے ساتھ اگر گواہوں کی گواہی کا اظہار اور کسی صورت معاملہ کے نفع و نقصان کی تشریح ہوتی ہے تو وہ صرف متعلقین معاملہ کی تسلیٔ خاطر اور مخالفین کے الزام کو روکنے کے لیے ہوتی ہے کہ وہ کسی صورت معاملہ کو ظلم و جور پر محمول نہ کریں۔

۵۔ خلیفہ کے احکام کا نص مجازی ہونا:— جس طرح مجتہدین کے اجتہادات اور ارباب قیاس کے قیاسات خدا و رسول کی نص قطعی کے خلاف واقع ہونے کی صورت میں پایۂ اعتبار سے گر جاتے ہیں اور اسی مخالفت نص کی وجہ سے عملاً ان کا اتباع نہیں کیا جاتا، اسی طرح امام اور اس کے نائب مجاز کے احکام سے متعارض ہونے کی صورت میں بھی اجتہادات و قیاسات بلاشبہ پایۂ اعتبار سے گر جاتے ہیں۔ پس دو مختلف اجتہادی و قیاسی آراء میں سے حکم امام جس کی تصدیق و تائید کرے گا، اس کو واجب الاذعان جاننا امت کے ہر فرد کے لیے ضروری ہے، چاہے کوئی مجتہد ہو یا مقلد، عالم ہو یا عامی، عارف ہو یا غیر عارف! کسی کو اپنے یا مجتہدین سلف کے اجتہادات، اور اسی طرح اپنے یا شیوخ متقدمین کے مکاشفات کے بل پر امام برحق[1] سے معارضہ کرنا روا نہیں ہے۔ امور مذکورۃ الصدر میں جس کسی نے حکم امام کے خلاف کوئی دوسری راہ اپنے لیے پسند کی وہ یقیناً عند اللہ مجرم ہے اور اس کا کوئی عذر رب العلمین کے حضور میں یا انبیاء و مرسلین کی بارگاہ میں یا علمائے مجتہدین کی نگاہ میں مسموع نہیں ہے، کیونکہ یہ ایک اجماعی مسئلہ ہے اور اہل اسلام میں سے کسی کو اس میں اختلاف نہیں ہے۔

۶۔ خلیفہ کے مقرر کردہ قوانین سیاست کا "سنت" کی تعریف میں ہونا:— نبی خدا کے کسی فرمودہ کے ماتحت جزئی امور میں جو حدود و عمل مقرر کرتا ہے ان سے اسی طرح استدلال و تمسک کیا جاتا ہے، جس طرح فرمودۂ الٰہی سے۔ اسی طرح خلیفۂ ارشد کتاب و سنت کی حدود میں رہتے ہوئے، جن جن سیاسی قوانین اور ریاستی ضوابط کو نافذ کرتا ہے ان سے بالکل سنت نبوی کی

[1] امام برحق کے اجتہادی احکام کی یہ حیثیت "عمل" کے ساتھ مخصوص ہے۔ نظری طور پر استنباطی امور میں اس سے اختلاف رائے کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً خلیفۂ برحق اول وقت پر نماز پڑھنے کا قائل ہے تو مسلمانوں کے لیے یہ لازم ہوگا کہ وہ اس کی امامت میں اول وقت ہی نماز ادا کریں، ہاں اس امر کی گنجائش رہے گی کہ کوئی شخص علمی طور پر نماز کو موخر کرنا پسند کرے۔ (ن۔ ص)

طرح مناظرات و معاملات میں استدلال و تمسک کرنا بجا و درست ہے۔ کیونکہ خلیفۂ راشد کے استنباط کردہ قوانین بدعت کی تعریف میں نہیں آتے۔ بلکہ سنت نبوی کے دائرہ میں شمار ہوتے ہیں۔

اس مضمون پر حدیث نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) گواہ ہے:۔

انہ من یعیش منکم بعدی فسیری اختلافاً کثیرا، فعلیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین۔ تمسکوا بھا وعضوا علیھا بالنواجذ وایاکم ومحدثات الامور، فان کل محدثۃ بدعۃ وکل بدعۃ ضلالۃ

تم میں سے جو لوگ میرے بعد زندہ رہیں گے وہ بہت سے اختلافات دیکھیں گے تو تمہارے اوپر لازم ہے کہ میرے اور خلفائے راشدین کے طریقے کی پیروی کرو۔ ان کو مضبوطی سے پکڑو اور دین میں جو نئی باتیں پیدا کی گئی ہیں ان سے بچو کیونکہ ہر نئی بات جو دین میں پیدا کی گئی وہ بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اختلافات میں کسی خلیفۂ راشد کے طریقہ سے استدلال کرنا موجب ہدایت ہے اور یہ کہ خلیفۂ راشد بدعت سے بری ہے۔

۷۔ احکام خلیفۂ راشد کا متمم سنت ہونا:۔۔۔ حکیم مطلق نے شریعت کے اصولی احکام کو تو اپنی نازل کردہ کتاب میں بیان فرما دیا ہے لیکن ان کی فروع اور شرائط کا تعین نبی کے ذمہ کر دیا۔ مثلاً اس نے اپنی کتاب میں نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کا مجمل حکم دے دیا ہے۔ لیکن نماز کے باب میں اوقات اور رکعات کی تعداد اور ارکان و شرائط و سنن کو، اور اسی طرح زکوٰۃ کے باب میں اموال زکوٰۃ نصاب زکوٰۃ اور شرح زکوٰۃ وغیرہ امور کے تعین کو اپنے رسول مقبول کے سپرد کر دیا۔ چنانچہ دین اللہ خدا کی کتاب کے اصولی احکام اور حدیث مسلسل سے ثابت ہونے والے فروعات، دونوں کے پورے مجموعہ کو کہتے ہیں اور یہ دونوں عناصر مل کر ہی شریعت کے نظام کو مکمل کرتے ہیں۔

مگر اسی طریق سے سوچیں تو شریعت کے کتنے ہی احکام ایسے ملیں گے جن میں اختلاف احوال کی وجہ سے تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً لشکر کشی بعض اوقات رضائے الٰہی کے مطابق ہوتی ہے، بعض اوقات مخالف۔ پھر لشکر کا کسی مقام میں قیام کرنا یا اس سے کوچ کر جانا دینی لحاظ سے مفید بھی ہو سکتا ہے اور مضر بھی۔ پس ایسی صورت میں کسی حکم کو دائمی یا غیر متغیر نہیں قرار دیا جا سکتا کون کہہ سکتا ہے کہ مطلق لشکر کشی واجب ہے یا ممنوع؟ کون کہہ سکتا ہے کہ لشکر کے لیے مطلقاً قیام یا کوچ حلال ہے یا حرام؟ لہٰذا ان امور میں حکم لگانا اور فیصلہ دینا امام وقت کی رائے پر چھوڑ دیا گیا ہے اور امام کے اس طرح کے احکام اور فیصلے یقیناً احکام شرعی ہی میں شمار ہوں گے۔ نہ کہ رسوم و عرف میں!

پس شریعت کے مفہوم میں کتاب اللہ اور حدیث نبوی کے ساتھ اسلام کے ... خلیفۂ راشد کے احکام بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ جس طرح کتاب و سنت دین متین کے لیے اساسی حجت ہیں اسی طرح ... امام کے ... شریعت میں ... کی حیثیت رکھتا ہے۔ پھر جیسے سنت کتاب کے مقابلہ میں دوسرے درجہ پر آتی ہے۔ ویسے ہی حکم امام کو سنت کے مقابلہ میں دوسرا درجہ حاصل ہے۔ آخذ دین و شریعت کی صحیح ترتیب یہی ہے کہ کتاب ... سنت ... ہے، اور حکم امام اس کی صراحت و وضاحت کرنے والا ہے۔ اسی ترتیب کے مطابق ایمان ... درجۂ اول ہوا، ایمان بالرسول دوسرے درجہ پر

اور خلیفۃ اللہ پر کامل اعتماد رکھنا تیسرے درجہ پر؛ بالکل یہی ترتیب کتاب اللہ میں مذکور ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ

اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے ارباب امر کی اطاعت کرو۔

اور اس آیت کی شرح فرمودۂ نبوت سے ہوتی ہے۔

عليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين

تم پر میرے طریقہ کا اور ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کے طریقے کا اتباع لازم ہے۔

انھیں شواہد کی بنا پر علمائے امت نے امور غیر منصوصہ میں امیر کے قیاس و اجتہاد کی صحت کو اطاعت کی شرط نہیں مانا ہے بلکہ اس کے مجتہدانہ فیصلوں کی پیروی ہر صورت لازم قرار دی ہے، چاہے اس کا قیاس ضعیف و ناقص ہی کیوں نہ ہو۔ یعنی امام کے قیاس کو اس سے لاکھ درجہ بہتر قیاس کے بل پر بھی رد نہیں کیا جا سکتا۔ بات صاف ہے کہ مجرد قیاس کتنا ہی مستند اور کتنا ہی صحیح کیوں نہ ہو، حکم امام کے برابر وزنی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ حکم امام اصول دین میں سے ایک اصل اور دلائل شرعی میں سے ایک دلیل ہے۔ خلیفہ کی مخالفت کرنے کے لیے جو قیاس وسیلہ بنتا ہے، اس میں کتنی ہی صحت و راستی ہو، وہ ظنی چیز ہے۔ مگر دوسری طرف اگرچہ خلیفہ کا حکم بھی قیاس ہی سے ماخوذ ہے مگر وہ بالکل قطعی ہے۔ یہ مسئلہ ویسا ہی ہے جیسے "اجماع" کا مسئلہ ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اجماع نظام شرعی میں ایک قطعی حجت ہے مگر غور کیجیے تو وہ بھی اپنی اکثر حالات میں حقیقت نفس الامری کے لحاظ سے فقط ایک قیاس ہے، یا ایک خبر غیر مشہور ہے اور اس وجہ سے اس کے ظنی ہونے میں کوئی کلام نہیں، مگر بہتر سے بہتر قیاس سے بھی اسے رد نہیں کیا جا سکتا۔

۸۔ حکم خلیفہ "نص حکمی" (نص مجازی) ہے:—— اس کی توضیح یہ ہے، کہ کتنی ہی چیزیں ایسی ہیں جن کے متعلق کتاب اللہ میں سکوت اختیار کیا گیا ہے مگر سنت نبوی انھیں حرام یا واجب قرار دیتی ہے۔ یوں ہی بہت سے امور ایسے ہیں جنھیں کتاب و سنت کی رو سے نہ حتمی طور پر حرام کہا جا سکتا ہے، نہ واجب۔ ایسے امور کی حرمت یا وجوب کو حکم امام (نص حکمی ہونے کی وجہ سے) متعین کر سکتا ہے۔ کیونکہ اس کا درجہ نص حقیقی سے فروتر مگر دوسرے تمام دلائل شرعی سے بلند ہے۔

۹۔ تبیین احکام کی ذمہ داری:—— نبی کے امت میں ہوتے ہوئے اگر کوئی اخلاقی و سیاسی مسئلہ پیدا ہو یا مہمات دین میں سے کوئی مہم پیش نظر ہو تو اہل امت کے لیے یہ جائز نہیں رکھا گیا ہے کہ وہ اس کے تصفیہ میں کوئی مسابقت دکھائیں اور بطور خود اس پر قیل و قال کرتے پھریں۔ بارگاہ نبوت سے علیحدہ لوگوں کا مجالس مشاورت منعقد کرنا اور ان میں عقل، تدبیر، رائے اور قیاس کی ترکتازیاں دکھا کر کسی معاملہ کی حیثیت متعین کرنا اور اس پر حکم لگانا جرم ہے۔ اس کے بجائے چاہیے یہ کہ زیر نظر معاملہ میں بطور خود بالکل سکوت اختیار کریں اور اسے براہ راست حضور نبوت میں پہنچا کر اس امر کے منتظر رہیں کہ ادھر سے کیا حکم صادر ہوتا ہے اور کونسا طریق عمل متعین ہوتا ہے، کیونکہ حکم لگانا ہی نبی کا منصب، امت کا کام فرماں برداری ہے۔ اس مدعا پر ذیل کی آیت روشنی ڈالتی ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کے آگے سبقت کی کوشش نہ کرو

وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۔ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ۝ — اور اللہ سے ڈرو۔ بے شک اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔

یہی حیثیت نبی کے بعد امام کی ہے اور مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ اجرائے احکام اور مہمات دینی کی انجام دہی کو امام کے حوالہ کر دیں اور اس کے ساتھ قیل و قال اور بحث و جدال نہ کرتے پھریں۔ امت کو امام کے ہوتے ہوئے، یہی نہیں کہ بطورِ خود کسی مہم میں اقدام نہیں کرنا چاہیے، بلکہ امام کے احترام کا تقاضا یہ ہے کہ زبانیں تک اس کے سامنے بے لگام نہ ہونے پائیں، اور لوگ اپنی آراء سے اس کے تصفیوں اور فیصلوں میں خلل نہ ڈالیں۔ مختصر یہ کہ تعیین احکام کے معاملہ میں کوئی شخص خلیفہ کی ہمسری کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ قرآن بھی اس دعویٰ پر شاہد ہے:-

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ۚ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِی الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ۚ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّیْطٰنَ اِلَّا قَلِیْلًا

اور ان کو امن یا خوف کی کوئی بات پہنچتی ہے تب اس کو مشتہر کر دیتے ہیں۔ اور اگر اس کو رسول اور ارباب امر کے سامنے پیش کرتے تو وہ لوگ اس کو جانتے جو اس پر غور کرتے اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم شیطان کے پیچھے لگ جاتے اور کم ہی بچتے۔

خلیفۂ راشد کی حیثیت کی اس تشریح سے لازم آتا ہے کہ کاروبار خلافت کو بادشاہوں کی سیاست اور جاگیرداروں کی ریاست پر قیاس نہ کیا جائے۔ ان دنیوی اقتداروں کو اس دینی منصب سے کوئی نسبت نہیں۔ ان کی اپنی ایک حیثیت ہے اور اس کی اپنی ایک اہمیت، جن کو آپس میں گڈمڈ نہیں کرنا چاہیے۔

خلاصۂ بحث: خلیفۂ راشد استعارۃً نبی کا فرزند ولی عہد ہوتا ہے اور اس کے مقابلہ میں دوسرے ائمۂ دین عام فرزندوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سعادتمند بیٹوں کی سعادت اس میں ہوتی ہے کہ جس ادب و احترام اور جس خدمت و اطاعت کا مستحق باپ کو سمجھتے ہیں، اسی کو باپ کے جانشین ہونے والے بھائی کے مقابلہ میں بجا لائیں۔ ان کا فرض ہو کہ اسے بجائے والد شمار کرتے ہوئے اس کی برابری کی ڈینگ نہ ماریں۔ ان کے لیے مرتبۂ وزارت سے آگے قدم رکھنا نازیبا ہے۔ بالکل یہی تقاضا امامانِ ہدایت کی امامت کا ہے۔ جیسی اطاعت و اعانت پیغمبر کے مقابلہ میں کی جانی چاہیے۔ ویسی ہی خلیفۂ راشد کے مقابلہ میں بھی واجب ہے۔ ہر امام کو اپنی زمام اختیار اس کے حوالہ کر دینی چاہیے اور تمام معاملات میں اتباع امر کے لیے گردن اس کے سامنے جھکا دینی چاہیے، خواہ خلیفہ کے مقابلہ میں وہ وجاہتِ علم و فضل کی اونچی سے اونچی منزل پر پہنچا ہوا ہو اور مقامات ولایت میں سے بلند ترین مقام پر اس کا قدم کیوں نہ جم چکا ہو۔ کسی شخص پر القاء و مکاشفات کی کتنی ہی بارش کیوں نہ ہو رہی ہو اور کسی کو خطاباتِ الٰہی کی کتنی ہی توجہ کیوں نہ حاصل ہو اور کسی کی چشمِ بصیرت پر کتنے ہی ابواب ہدایت کیوں نہ وا ہو جائیں، اور وہ ان سارے پہلوؤں میں خلیفہ کا ہم پلہ ہی کیوں نہ ہو، مقام اطاعت و اتباع سے آگے بڑھنے کا اسے حق نہیں پہنچتا۔ سیاست کبریٰ کا وارث اور خلافت عظمیٰ کا مالک بہرحال صرف خلیفۂ راشد ہی ہے۔ اسے اپنے جلیل الشان منصب کی وجہ سے انبیاء اولوالعزم سے مماثلت حاصل ہے۔ ادھر دوسرے تمام ارباب امامت کو بھی اگرچہ انبیاء ہی کے منصب ہدایت سے حصہ ملتا ہے مگر انھیں جس سرچشمہ سے یہ عہدۂ امامت ہاتھ آتا ہے، اسی سرچشمہ سے خلیفۂ راشد کی اطاعت و اعانت کا حکم بھی پہنچتا ہے۔ یہ وہی صورت ہے کہ غیر نبی ہوتے ہوئے کوئی شخص نعمت وحی سے قدرے حصہ پالے اور راہِ ہدایت میں رہبری کی سعادت حاصل کرلے مگر اسے جس کریم مطلق کی بارگاہ سے یہ معزز رتبہ ملتا ہے اسی کی طرف سے

انبیاء و مرسلین کی فرماں برداری کا فریضہ انبیاء اس پر عائد ہوتا ہے۔ اسی طرح ائمہ ہدایت کا معاملہ ہے کہ جس بادشاہ مطلق کی جانب سے انھیں منصب امامت عطا ہوتا ہے وہی انھیں خلیفۂ راشد کی اعانت پر مامور فرماتا ہے۔

خلیفۂ راشد کے ساتھ ائمہ ہدیٰ کے حسن معاملہ کی بہترین مثالیں ڈھونڈنی ہوں تو وہ صدیق اکبرؓ و فاروق اعظمؓ یا فاروق اعظمؓ و جناب مرتضیٰؓ یا جناب مرتضیٰؓ و جناب حسن مجتبیٰؓ کے باہمی ربط سے اخذ کی جا سکتی ہیں۔ ان حضرات نے کمالات روحانی اور فضائل نفسانی سے متصف ہونے کے باوجود اپنی زمام اختیار خلیفۂ راشد کے ہاتھوں میں دے دی تھی اور اس کی اطاعت کے لیے اپنی گردنیں جھکا دی تھیں۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔[له]

فہرست کتب موجودہ مکتبہ جماعت اسلامی

مکتبہ جماعت اسلامی کی اپنی مطبوعات میں سے مندرجہ ذیل اسوقت موجود ہیں

تجدید و احیائے دین عہ، پردہ غیر مجلد ۱۲؍، پردہ مجلد ۳؍، سلامتی کا راستہ ۶؍، اسلام اور جاہلیت ۶؍، اسلام کا سیاسی نظریہ ۶؍، ایک اہم استفتاء ۲؍، راہِ عمل ۷؍، جہاد فی سبیل اللہ ۶؍، نشان راہ ۶؍، نیا نظام تعلیم ۶؍، معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل ۸؍، خطبۂ تقسیم اسناد ۲؍، دستور جماعت اسلامی ۲؍، مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ اول عہ، حصہ دوم ۱۲؍، حصہ سوم عہ، روداد جماعت اسلامی ۹؍، حصہ دوم ۱۲؍، اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے ۶؍، اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر ۶؍، خدا کی اطاعت کس لیے ۲؍، عبادت ۲؍، ایمان کی کسوٹی ۲؍، مسلمانوں کی طاقت کا اصلی منبع ۲؍، مسلمان کا بنیادی عقیدہ ۲؍ (سفید اور خاکی)۔ بشکل چارٹ چھوٹا سائز اور جیبی سائز۔ Towords Under Standing Islam. (دینیات کا انگریزی ترجمہ) ۳؍، What is Islam. ۳؍

ہماری نئی مطبوعات

قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں ۱۲؍، اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر عہ، روداد جماعت اسلامی حصہ سوم ۸؍، حقیقت توحید ۱۲؍

[له] مطلب یہ ہے کہ یہ اصحاب کمالِ علم و عمل میں بڑے اونچے مدارج پر فائز تھے اور اصولِ دین کی سمجھ میں اور اجتہاد و قیاس کی مہارت میں کسی سے پیچھے نہ تھے بلکہ ممکن ہے کہ بعض پہلوؤں میں خلیفۂ راشد سے کچھ آگے ہی بڑھے ہوئے ہوں، اس کے باوجود انھوں نے فکر و عمل میں خلیفہ کی سیادت و قیادت اور اطاعت و اعانت سے کبھی گریز کرنے کی جرأت نہیں کی ——— تا بدیگراں چہ رسد۔

شاہ صاحب کی ان توضیحات سے یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ نظام دینی کے ماتحت جس شخص کو امارت و خلافت کا درجہ ملتا ہے اس کی اطاعت و اعانت سیاسی حکمت کے ماتحت نہیں، بلکہ بطور دینی فریضہ کے واجب ہوتی ہے اور اس پر اخروی فلاح و خسران کا دارومدار ہے۔ (ا۔ ح۔)

قانون بقائے انفع

(اجتماعیات میں تحفظِ حق وعدل کا فطری اہتمام)

"ما ینفع الناس فیمکث فی الارض"

"انسان کی ساری قدر وقیمت کا انحصار اس کے مفید انسانیت ہونے پر ہے اور ہمیں وہ رویہ اختیار کرنا چاہیے جو ہمارے وجود کو دنیا کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید بنا سکے!" (گاڈون)

حصہ اول

"تاریخ کے جدلی عمل میں تکرار" کے زیرعنوان ہم نے یہ حقیقت پیش کی تھی کہ عرصۂ تاریخ میں حق اور باطل، ظلم اور عدل، نیکی اور بدی، خیر اور شر باری باری سے غلبہ پاتے چلے آرہے ہیں اور یہ کہ ہماری اجتماعی زندگی کی کائنات میں بھی آفتابِ حق وعدل کا طلوع وغروب صبح وشام کا سماں پیدا کرتا رہتا ہے! —— سوال یہ ہے کہ پھر حق اور باطل میں، خیر وشر میں، ظلم اور عدل میں فرق کیا ہوا؟ اگر ان ضدین میں انسان کے لیے کوئی فرق نہیں ہے اور اس کی فطرت کا ترازو متضاد اخلاقیاتی "اقدار" میں سے کسی ایک نوعیت کے اقدار کو مستقلاً وزن دینے والا نہیں ہے تو پھر حق اور نیکی، خیر اور عدل کے نام پر دنیا کو جمع کرنے کی مساعی سراسر عبث ہیں اور اخلاق اور قانون اور مذہب اور فلسفے، سب تاش اور چوسر اور گنجفے کے کھیلوں سے زیادہ قدر وقیمت نہیں رکھتے۔ آئندہ سطور میں اسی غلط فہمی کے سدباب کے لیے کچھ خیالات آپ کے سامنے پیش کیے جارہے ہیں۔ ان سطور سے یہ واضح ہو جائے گا کہ انسانی فطرت کا جھکاؤ حق ہی کی طرف ہے اور اگر باطل کی طرف وہ جھکتی ہے تو محض فریب خوردگی کی وجہ سے۔ اس کی یہی فریب خوردگی باطل کی تاریکیوں کو حیاتِ اجتماعی میں تسلط پانے کا موقع دیتی ہے اور اس طرح حق وباطل کی وہ دائمی آمیزش جاری رہتی ہے جس سے زندگی کی ساری ہماہمی قائم ہے!

علاوہ بریں اس باب سے توافق للبقا کے اصول کی کچھ مزید وضاحت بھی از خود ہو جائے گی۔ توافق للبقا کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ سوسائٹی کی تشکیل وتعمیر حق وعدل کے اصولوں پر ہو اور یہ فطرتِ انسانی کا ایک قوی ترین مطالبہ ہے جس کا سامنا ہم عملی زندگی میں بداہتہً کرتے ہیں مگر نظری طور پر موجودہ دور نے اسے نظر انداز کر رکھا ہے۔

تعارفِ مدعا یہ کائنات جس کے گہوارے میں حیاتِ انسانی پرورش پا رہی ہے، اس کے ارتقا کے معنی یہ ہیں کہ یہ مضرات کو ختم کرتی ہے، اور مفیدات کی حفاظت کرتی اور ان میں سے "انفع" کو بقا دیتی ہے! اربابِ فلسفہ اسے ذی شعور نہ مانیں، مگر کوئی نہ کوئی شعور اس کے نظم میں دخیل ہے جو جھاگ کو خشک کر کے نابود کرتا اور پانی کو بچا رکھتا ہے، جو خس وخاشاک کو منتشر کرتا اور تخمِ نمو

کو سینے سے چمٹا کر رکھتا ہے، جو خزف ریزوں کو اٹھا اٹھا کے دریائے بقا میں سے باہر پھینکتا اور موتیوں کو اس تہ میں محفوظ کرتا رہتا ہے ہر چیز اس شعور کے سایۂ اقتدار میں اسی وقت تک برقرار رہتی ہے، جب تک اس کا وجود افادیت کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ جہاں افادیت ختم ہوئی، عناصر کی ترتیب و ترکیب پریشانی کے انجام کو پہنچی۔

اصولاً یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ نظام عالم جن اصول و ضوابط پر چل رہا ہے وہ حسن و خیر کو ظہور دینے والے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں، اہتمام جو کائنات کو چلانے والے شعور کی طرف سے کیا گیا ہے، صرف حسن و خیر کی پرورش کے لیے ہے۔ مگر اس نظام میں کچھ رخنے ایسے چھوڑے گئے ہیں جن سے حسن و خیر کی ضد یعنی قبح و شر بھی ابھر سکے۔ کیونکہ کوئی وجود، کوئی وصف اور کوئی کیفیت اپنی ضد رکھے بغیر اور اس کی مزاحمت کے بغیر نہ تو نشوونما پا سکتی ہے اور نہ اس کی امتیازی حیثیت و قدر قائم ہو سکتی ہے۔[1] اب فطرت کا سلوک یہ ہے کہ جمال و خیر کو تو ظہور دینے کے بعد وہ اپنی چھاتیوں کا دودھ پلا پلا کر پالتی اور لوریاں دے دے کر پروان چڑھاتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ایک اہم مقصد کے لیے جو قبح و شر سر اٹھاتا ہے، اسے میدانِ بقا سے باہر دھکیلتی رہتی ہے! مثلاً فطرت کا دہقان ہوا اور سورج کی شعاعوں اور بارش کے جھالوں سے ایک قطعۂ ارضی کو جنبیلی کے پودے اگانے کے لیے تیار کرتا ہے مگر اس میں جنبیلی کے پودوں کی اوٹ میں جھٹ کٹیا بھی زمین سے ابھرنے لگتا ہے۔ اب جمال و قبح پہلو بہ پہلو پلتے ہیں مگر دونوں کو قسمت بقا میں سے یکساں حصہ نہیں دیا جاتا۔ جنبیلی کے پودے بڑھتے ہیں، زندہ رہتے ہیں اور پھیلتے چلے جاتے ہیں اور ادھر جھٹ کٹیا بڑھتا ہے، سوکھتا ہے اور اس کے اجزا منتشر کر دیے جاتے ہیں۔ وہ دوبارہ، سہ بارہ، چار بارہ سعی بقا کو جاری رکھتا ہے مگر ہر بار نظم فطرت کا سلوک اس کے ساتھ وہی رہتا ہے۔ پھر اسی طرح بارش ہوتی ہے تو اس کے ساتھ برق و رعد کا ایک طوفان بھی نمودار ہوتا ہے، مگر اس طوفان کا ظہور وقتی ہوتا ہے، بخلاف اس کے طوفان کے ساتھ جو پانی برسایا جاتا ہے وہ نابود نہیں ہوتا، بلکہ باقی رہتا ہے اور نباتات و حیوانات کی ضروریات پوری کرنے میں صرف ہوتا ہے

دوسری صورت ظہورِ قبح و شر کی یہ ہوتی ہے کہ بعض اشیا یا حوادث اصلاً تو اپنے اندر افادیت یعنی جمال و خیر کی صفت رکھتے ہیں، لیکن جب وہ اپنا مقصد پورا کر چکتے ہیں تو اس کے بعد وہ بیکار ہو کر قبح و شر کی سطح پر آجاتے ہیں۔ اب حکیم فطرت کا جھاڑو انھیں بھی کوڑے کی دوسری اقسام کے ساتھ سمیٹ سماٹ کر بارگاہِ وجود سے باہر نکال دیتا ہے۔ مثلاً پودوں پر بور اس مقصد سے آتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے اس کی شاخیں پھلوں سے مالامال ہو جائیں یا خوشنما پھولوں کا ظہور اس لیے ہوتا ہے کہ بیج نمودار ہوں۔ اب جس وقت پودے میں پھل آنا شروع ہوتا ہے تو بور ختم ہونے لگتا ہے اور اسی طرح جب شاخوں کے سروں پر بیجدان پیدا ہو جاتے ہیں تو پھولوں کی پنکھڑیاں مرجھا مرجھا کر منتشر ہونے لگتی ہیں۔ یہی صورت حیوانات میں بھی ملاحظہ کی جا سکتی ہے انڈے کے خول کی ساری اہمیت اسی وقت تک ہے، جب تک کہ اس کے اندر محفوظ کیا ہوا مواد ایک وجود ذی روح بن کر خول کی حفاظت سے بے نیاز نہ ہو جائے۔ یہی حیثیت دودھ پلانے والے جانوروں میں مشیمہ کی ہوتی ہے کہ جس دن اس کا مقصد وجود پورا ہو چکتا ہے، اس کا تعلق بچہ اور زچہ دونوں سے منقطع ہو جاتا ہے۔

---

[1] اسی بنا کر بعض ارباب فلسفہ نے جمال و خیر کے دو شعبے قرار دیے ہیں، مثبت اور منفی؛ مراد یہ کہ چونکہ جمال و خیر کا احساس منحصر ہے قبح اور شر کے تصور پر لہٰذا قبح اور شر کو بھی بالواسطہ جمال و خیر ہی سمجھنا چاہیے۔

الغرض موجودات کی ساری ہیئت کائنات کے مجموعی مقصد اور اس مقصد کے بھی جزوی مقاصد کے ساتھ وابستہ ہے۔ جو چیز حصولِ مدعا میں جہاں تک معاون ہے، اسے برقرار رکھا جاتا ہے، مگر جہاں وہ بے کار یا مضر ہوجاتی ہے، ایک عضوِ معطل کی طرح کاٹ کر الگ پھینک دی جاتی ہے۔ یہ نظام فطرت اپنی قوتوں کی کوئی رتی بے کار نہیں جانے دینا چاہتا اور ایسے موجودات کی تیاری ( ) اور حفاظت پر ایک لمحہ صرف کرنا نہیں چاہتا جو زندگی کی "منڈی" میں کوئی قیمت نہ پاسکیں!

انسانی زندگی کا جائزہ فطرت انسانی کا ضمیر بھی بالکل اسی نہج پر اٹھایا گیا ہے۔ وہ بھی معاشیات و اخلاقیات میں قبح و شر سے گریزاں اور جمال اور خیر کی طرف دواں رہتی ہے۔ اس کے مختلف پہلوؤں میں سے جس پہلو کو بھی لیا جائے، اس میں یہی اصل الاصول کارفرما نظر آئے گا۔

اولاً اس کے نظام جسمانی کو لیجیے۔ اس کی حیات تنفس کی مقتضی ہے۔ اب دیکھیے کہ عمل تنفس کی شان کیا ہے؟ سانس لیتے وقت ہوا کی مختلف اقسام اندر چلی جاتی ہیں، مگر پھیپھڑے کے واسطے سے خون ان میں سے مفیدِ مطلب قسم یعنی آکسیجن کو قبول کرلیتا ہے اور اس کے پاس عمل استحالہ کے ماتحت جو کاربن جمع ہوچکی ہے، اسے وہ دفع کردیتا ہے۔ پھر نظام تغذیہ میں بھی یہی صورت پائی جاتی ہے کہ معدہ اول تو حواس و شعور کے تعاون سے چھانٹ چھانٹ کر ہی قوت بخش اور صحت افزا غذا کو ہے، پھر اس قبول کردہ غذا میں سے جتنا حصہ کارآمد ہوتا ہے اسے بدن کی ضروریات پوری کرنے کیلیے محفوظ کرلیتا ہے اور بقیہ فضلات کو باہر دھکیل دیتا ہے۔ یہی نہیں، بلکہ بدن کے مختلف حصص میں جو مادی اجزاء کیمیاوی عمل سے متغیر ہوجاتے ہیں، یا اپنا مقصد پورا کرتے کرتے اپنی قوت کھو چکتے ہیں، انھیں بھی قوت مدبرہ الوداع کہہ دیتی ہے! پھر دیکھیے کہ فاسد خارجی اثرات کی روک تھام کس طرح ہوتی ہے۔ پھیپھڑے میں اگر کوئی مضر مواد پہنچ جائے تو وہ "کھانسی" کے عمل سے اسے دور کرتا ہے، اگر غذا کا کوئی ریزہ یا پانی کا کوئی قطرہ اپنی اصل راہ سے ہٹ کر ہوا کی نالی میں چلا جائے تو "اچھو" جیسا چست سنتری اسے راہ پر ڈال دیتا ہے، اگر ناک کی نالیوں میں کوئی چیز حائل ہو رہی ہو تو "چھینک" کا پاسبان راستہ صاف کردیتا ہے، آنکھوں میں ریت کا کوئی ذرہ آپڑے تو اردگرد کی گلٹیاں ایک لعاب اگلنا شروع کردیتی ہیں اور اس کے سیلاب میں اس "چٹان" کو بہالے جاتی ہیں، خون میں کوئی گندہ عنصر شامل ہوجائے تو قوت مدافعت اسے مساموں کی راہ سے باہر نکالنے کے لیے خون پسینہ ایک کردیتی ہے اور اگر یوں کامیابی نہ ہو تو پورے بدن میں حرارت کا ایک تنور دہکا دیا جاتا ہے جس کی تاب نہ لاکر "دشمن" پسپا ہوجائے، پھر کبھی یہ صورت اختیار کی جاتی ہے کہ بیرونی عناصر کو ادھر ادھر ہانک کر زیر جلد پھوڑے پھنسیوں کے "بلیک ہولوں" میں بند کردیا جاتا ہے اور جب ان کا "دماغ درست" ہوچکتا ہے تو ان بلیک ہولوں کی بیرونی دیواریں توڑ کر ان "جنگی قیدیوں" کو رخصت کردیا جاتا ہے۔ الغرض ہمارے بدن کا ایک ایک ذرہ کائنات کے مجموعی نظم کے ماتحت مضرت کا دشمن اور افادیت کا قدرداں ہے!

پھر انسان کی حسی زندگی کا پہلو سامنے آتا ہے۔ اس کے آلات حس جمال و خیر کے دلدادہ اور قبح و شر سے گریزاں ہیں۔ مثلاً اس کی حس لمس سختی اور کھردرے پن کو ناپسند کرتی ہے اور نرمی و نزاکت پر جان دیتی ہے۔ اس کی بصارت گندگی، بدنمائی، بے ترتیبی اور تاریکی سے نفور اور خوبصورتی، صفائی، تناسب اور روشنی کی شیدائی ہے۔ اس کی سماعت ڈراونی اور کریہہ آواز وں سے مجروح ہوتی ہے اور مسرت افزا لطیف صداؤں سے لطف لیتی ہے۔ اس کی قوت ذائقہ تلخی اور کسیلے پن سے ابا کرتی اور شیرینی

اور چیٹ پٹے پن کی مشتاق ہے۔ اس کا مشام تعفن سے تکلیف محسوس کرتا ہے اور خوشبو کو جذب کرکے آسائش پاتا ہے۔ چنانچہ یہ ذائق حس باورچی خانہ میں، دفاتر میں، دکانوں اور بازاروں میں، تعمیرات اور آرائشات میں، لباسوں اور پوشاکوں میں، وضع قطع اور بول چال میں، غرضیکہ زندگی کے ہر کونے اور ہر گوشے میں محرک ارتقاء ہے، کیونکہ یہ مضرت کے رد اور منفعت کے قبول کے فطری اصول کے مطابق کام کرتا ہے۔

اس سے آگے نکلیے تو ادراکی زندگی کا دائرہ آتا ہے۔ یہاں بھی قاعدۂ کلیہ وہی ہے۔ غلط علم یعنی باطل آدمی کے لیے مضر ہے اور صحیح علم یعنی حق اس کے لیے مفید ہے۔ بس انسان یہی نہیں کہ جاننا چاہتا ہے، بلکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ حق جاننا چاہتا ہے، وہ امر واقعہ کو اس کی اصلی شکل میں معلوم کرنے کا مشتاق ہے۔ وہ جھوٹ کو اگر قبول کرتا ہے اور غلط فہمی اس کے ذہن میں راہ پاتی ہے تو محض اس لیے کہ اس کی نظر دھوکا کھا جاتی ہے اور باطل اس کے سامنے حق و صداقت کا جامہ اوڑھ کے آتا ہے۔ باطل کا جو دام بھی اسے پھانسنے کے لیے بچھایا جائے اس کے اوپر حق کے کچھ دانے ضرور بکھیرے جانے چاہئیں، ورنہ یہ "مرغ زریں" ہاتھ نہیں آسکتا۔ کیونکہ اس کے ذہن کی اصلی غذا حق و صداقت اور واقعیت ہی ہے۔ اسی غذا کے نتائج میں یہ اپنے نشیمنِ بلند سے اتر کر باطل کے کسی خفیہ پھندے میں قدم رکھتا ہے۔

اخلاقیاتی زندگی کے دائرہ میں اب ہم انسان کی تہذیبی و تمدنی زندگی کی سرحد پر کھڑے ہیں۔ اس کے جنگلے کو عبور کرنے سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہماری اخلاقی و اجتماعی زندگی کا جالا مطالبات جسم، مطالبات احساس اور مطالبات ادراک ہی سے بنا جاتا ہے۔ پھر جب یہ بات صاف ہو چکی ہے کہ آدمی حیات جسمانی، حیات حسی اور حیات ادراکی، تینوں دائروں میں مضرت کو دفع کرتا اور افادیت کو قبولیت کے اعزاز سے سرفراز کرتا ہے تو یقیناً اخلاقی زندگی میں بھی اس کا اصولِ حرکت یہی ہونا چاہیے۔ چنانچہ ہے بھی یہی!

نظم اجتماعی اسی بنا پر نمودار ہوا کہ فردِ انسانی کی ضروریات اس کی قوتوں سے وسیع تر واقع ہوئی ہیں، جیسا کہ پائن نے اپنی کتاب "انسانی حقوق" (   ) میں لکھا ہے کہ:-

"فطرت نے آدمی کے حیاتی تقاضوں کو اس کے قویٰ سے عظیم تر بنایا ہے"

پس ایک سوسائٹی میں رہتے ہوئے آدمی کے لیے یہ محسوس کرنا ناگزیر ہے کہ جس مجبوری نے اسے اجتماع کا رکن بنایا ہے اسی مجبوری نے دوسروں کو بھی تمدن کی راہ پر گامزن کیا ہے۔ اس احساس کے ماتحت آدمی میں اخلاقی شعور نمودار ہوتا ہے اور وہ زندگی کے مختلف مشاغل میں کوئی اقدام کرتے ہوئے یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ تمدن کے سایہ میں رہنے کی وجہ سے دوسروں کی طرف سے اس پر کیا فرائض عائد ہوتے ہیں۔ وہ خاندان، محلہ، شہر، ملک اور دنیا کی آبادی سے کسی نوعیت کا تعلق رکھتا ہے اور ان کے کن کن حقوق کا سے پاس کرنا ہے؟ اس سوچ کے جواب میں انسان دو رویے اختیار کر سکتا ہے، ایک یہ کہ وہ اپنی پوری توجہ کو اپنے نفع پر مرکز کر دے اور دوسروں کو جہنم میں جھونک دے۔ دوسرا یہ کہ وہ اپنے اور دوسروں کے نفع کو بیک وقت ملحوظ رکھے، بلکہ صاف تر لفظوں میں اپنے نفع کو سوسائٹی کے نفع کے تابع کر دے کیونکہ وہ سوسائٹی کے بدن کا ایک عضو ہونے کی حیثیت سے ہر اس نفع و نقصان میں حصہ دار ہے جو سوسائٹی کو پہنچتا ہے۔ ان میں سے اول الذکر خودغرضانہ رویہ سوسائٹی کے شیرازہ کو

رحم پر ہم کرنے والا ہے اور اسے "ظلم" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور ثانی الذکر رویہ افراد کو مربوط بنا کر سوسائٹی کو اور تعاون دینے والا ہے اور اس وجہ سے اسے "عدل" کا عنوان دیا جا سکتا ہے۔ پھر ان دونوں اصولی رویوں میں سے جس کو بھی پیش نظر رکھا جائے اس کے تحت مختلف جزئیات حیات میں آدمی بے شمار حدود و ضوابط تجویز کرتا ہے۔ ان حدود و ضوابط میں بھی جہاں جہاں نفس پرستی دخل پاتی چلی جاتی ہے ظلم و فساد بروئے کار آتا جاتا ہے اور جتنا میدان خیر خواہی انسانیت کے قبضہ میں رہ جاتا ہے اتنے میں عدل کا تسلط قائم ہو جاتا ہے۔

لیکن انسان اپنے لیے عملی رویہ تجویز کرنے سے پہلے کائنات اور زندگی، تمدن اور شعور وغیرہ کے متعلق کوئی نہ کوئی حکم لگانے پر مجبور ہے۔ قدم قدم پر اس کے سامنے یہ سوالات آتے ہیں کہ یہ ہنگامۂ کائنات کیا ہے؟ اس میں زندگی کی نمود کیونکر ہوئی؟ یہ شعور کدھر سے آگیا؟ یہ تمدن کیا ہے اور اس کے تقاضے کیا کیا ہیں؟ یہ صنفی ربط کیا معنی رکھتا ہے؟ وغیرہ۔ اس معنی کی طرف ایچ، جی، سی، ہیرنشا (انقلابی دور کے بعض مفکرین کے سیاسی و اجتماعی افکار" صفحہ ۱۵۳) کا مقولہ بھی اشارہ کرتا ہے کہ

"کسی شخص کا سیاسی نظریہ بہت بڑی حد تک کائنات اور انسان کی فطرت سے تعلق رکھنے والے ان بنیادی نظریات سے متشخص و متعین کیا جا سکتا ہے جنھیں وہ کسی نظامِ افکار کی تعبیر کے وقت شعوری یا غیر شعوری طور پر اختیار کرتا ہے"۔

تمام الہامی اور عقلی دساتیر حیات، اپنے مخصوص بنیادی نظریات پر قائم ہوتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ انسان خدا کا پیدا کردہ اور اس کا غلام ہے اور کوئی کہتا ہے، نہیں یہ خود بخود مادہ کی شاخ سے پھوٹا ہے۔ ایک طرف سے ہانک لگائی جاتی ہے کہ "انسان پیدائشی گنہ گار ہے" دوسری طرف سے یہ آواز آتی ہے کہ نہیں اسے نیکی کے سوا کچھ آتا ہی نہیں! ایک مسلک کے نمائندے چلاتے ہیں کہ زندگی ایک عذاب ہے جو آدمی پر دیوتاؤں کی طرف سے مسلط کیا گیا ہے۔ ایک دوسرے مسلک کے علمبردار چیخ کر کہتے ہیں کہ نہیں دنیا ایک کلب گھر ہے جس میں چار دن ناچنے کودنے کے لیے ہمیں خوش قسمتی سے موقع مل گیا ہے! نظام تمدن کے متعلق ایک اسٹیج سے یہ کہا جاتا ہے کہ اصل مقصود فرد کی خوشی ہے اور سوسائٹی اس مقصود کے لیے وجود پاتی ہے۔ ادھر دوسرے اسٹیج سے یہ دعویٰ پیش کیا جاتا ہے کہ نہیں فرد کی مسرت اجتماعی مسرت سے الگ نہیں، اس لیے اصل مقصود اجتماع کی مسرت ہے۔

ان مختلف نظریات سے بالکل قدرتی طور پر مختلف عملی رویے نمودار ہوتے ہیں اور اس سلسلہ میں بنیادی اصول یہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ نظریہ اگر "حق" ہوگا تو اس کے نتیجہ میں عملیہ لازماً "عدل" کی تعریف میں آئے گا اور نظریہ اگر باطل ہوگا تو عملیہ لازماً "ظلم و فساد" کی شکل اختیار کرے گا۔ اس طرح گویا نظریۂ حق اور عملیۂ عدل اور نظریۂ باطل اور عملیۂ ظلم مل کر دو متقابل قوتیں بن جاتی ہیں۔ اب سوال یہ حل طلب ہے کہ انسانی فطرت حق و عدل اور ظلم و باطل کے فریقین میں سے کس کی طرف میلان رکھتی ہے؟

آج تک کی تاریخ اس پر گواہ ہے کہ باطل اور ظلم نے ہمیشہ انسانیت کو دکھوں اور مصیبتوں میں مبتلا کیا ہے اور توہم پرستی و فساد انگیزی نے ہر بار اقوام و ملل کو روزِ بد سے دوچار کیا ہے۔ دوسری طرف ہادیٔ تاریخ کا یہ اعلان بھی ہمارے سامنے ہے کہ حق اور انصاف نے ہمیشہ مسرت و اطمینان کے زر دیں پرادے کو فضائے حیات میں بکھیرا ہے اور صداقت و خدمت نے ہر بار جماعتوں اور گروہوں کو مئے بقا پلانے میں کھول کھول کر مظاہرۂ سخاوت کیا ہے۔ تاریخ کے ان دونوں فتووں سے دنیا کا احمق سے احمق انسان بھی آگاہ ہے اور اس کی بصیرت کبھی یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہے کہ حق و عدل مضرِ انسانیت ہیں اور ظلم و

باطل اس کے لیے مفید مطلب ہیں۔ غلطی صرف تعین حق و باطل اور امتیاز ظلم و عدل میں ہوتی ہے اور اس غلطی کے متعدد وجوہ ہیں جن کے بیان کا یہ موقع نہیں۔ ہمیں یہاں جو چیز عرض کرنی مطلوب ہے وہ صرف یہ ہے کہ انسان جو افکار اور جو اعمال اختیار کرتا ہے انھیں دوامًا یا وقتی طور پر اور اسی طرح پوری نوع کے لیے یا جماعت کے لیے یا ذات کے لیے عین حق و عدل پر مؤسس جان کر اختیار کرتا ہے۔

انسانی اخلاقیت کا معدہ کسی طرح غیر حق اور غیر عدل کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتا، کیونکہ صرف حق و عدل ہی اس کی فطری غذا ہے، الا یہ کہ اس کی حس امتیاز کچھ موثرات کے طویل عمل سے معطل ہو چکی ہو یا مسخ کر دی گئی ہو۔ مگر اس صورت میں بھی ظلم و باطل کی بوٹیاں اس سے نگلوانے کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ ان پر حق کا شہد اور عدل کی شکر چڑھا دی جائے۔ چنانچہ ایک ملحد کو انکار خدا کا عقیدہ اختیار کرنے کے لیے کتاب کائنات کی کتنی ہی آیات سے آنکھیں بند کرنی پڑتی ہیں اور انفس و آفاق کی کتنی ہی سورتوں کو محرف کرنا ہوتا ہے، جب کہیں وہ اپنے ذہن کو یہ دھوکا دینے میں کامیاب ہوتا ہے کہ خدا کا انکار ہی امر حق اور مطابق واقعہ ہے۔ اسی طرح ایک چور اور ڈاکو کو اپنے جرم کے لیے وجوہ جواز گھڑنے پڑتے ہیں۔ وہ کسی ڈاکہ زنی کو تو حق انتقام کے ماتحت جائز ٹھیراتا ہے، کسی کو خودداری اور غیرت کے نام پر مباح کرتا ہے، کسی کو مجبوری و بیچارگی کے عنوان سے معقول قرار دیتا ہے، تب کہیں اس کی حس اخلاقیت اسے آرام کی نیند سونے دیتی ہے، ورنہ وہ ہر ظالمانہ اقدام پر ویسا ہی اضطراب اس کے ذہن میں برپا کر دیتی ہے جیسا زندہ مکھی نگل لینے سے معدہ میں برپا ہوا کرتا ہے۔ اس اضطراب سے سلیم الفطرت آدمی تو غلطی فکر و عمل پر متنبہ ہو کر آئندہ احتیاط کرتا ہے مگر احمق اس "اخلاقی متلی" کو دبا دینے کے لیے قسم قسم کے چورن اندر اتارتا جاتا ہے تا آنکہ متلی رک جاتی ہے اور مکھی ہضم ہو جاتی ہے۔ پھر جب ایسی حماقت بار بار کی جاتی ہے تو ذہنی معدہ کی فطرت ہی بدل جاتی ہے اور وہ خوشی خوشی مکھیاں ہضم کرنے لگ جاتا ہے اور کج فطرت آدمی باقاعدہ مگس خور ہو کے رہ جاتا ہے۔

پس غیر مسخ شدہ فطرت انسانی کا مطالبہ حق و عدل کے سوا کچھ نہیں ہے اور انسانیت ہمیشہ اخلاقی ردیہ کے پس پردہ کام کرنے والے نظریات میں سے نظریۂ حق کو قبول کرنا چاہتی ہے اور اسی طرح اجتماعی اعمال کی اشکال میں سے وہ عادلانہ اشکال کو پسند کرتی ہے۔ اس غرض کے لیے فطرت نے جو پراسرار انتظام کر رکھا ہے، ذرا اس کا جائزہ لیتے چلیں اور اس امر پر غور کریں کہ نفس انسانی کس کس ذریعہ سے ظلم و باطل کی مدافعت کرتا ہوا حق و عدل کی طرف لپکتا رہتا ہے۔

ذہن انسانی کی بارگاہ میں کسی نظری یا عملی اصول کا بار پانا جن مختلف سنتریوں کی اجازت پر منحصر ہوتا ہے ان میں سب سے پہلے "تشکیک" کا نام آتا ہے۔ کوئی نیا خیال چاہے اندر سے ابھرے یا باہر سے گھسے، دربار نفس میں اگر کوئی مستند حیثیت حاصل کرنا چاہتا ہو تو تشکیک پہلے اسے ترچھی نظروں سے دیکھتا ہے اور پھر اسے اپنے دوسرے ساتھی "تنقید" کے حوالہ کرتا ہے کہ ذرا لینا اس کی جامہ تلاشی اور دیکھنا اس کی سندات کو کہ یہ حضرت حق و عدل کے علمبردار ہیں یا ظلم و باطل کے نمائندے؟ چنانچہ تنقید کا پہرہ دار اس نووارد کا "پروانۂ رہداری" دیکھتا ہے اور ذہنی بارگاہ میں جگہ پانے کے لیے اس کے پاس جتنے دلائل ہوتے ہیں ان سب کا جائزہ لیتا ہے، نیز ایک حد تک یہ اطمینان کرنے کی بھی کوشش کرتا ہے کہ اس کے ظاہر فریب لباس حق و عدل کے اندر کہیں ظلم و باطل کے اسلحہ تو چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ پھر اگر تنقید کا سنتری نووارد نظریہ یا عملیہ کو باریابی کی اجازت دیتا ہے تو اسے دربار میں ایک مناسب

درجہ کی نشست حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد حس اخلاقی (ضمیر) کی مستقل نگرانی جاری رہتی ہے اور وہ دیکھتی رہتی ہے کہ کہیں ایسے اصول و نظریات تو نہیں ابھر رہے ہیں جو تجربہ میں کھوٹے ثابت ہوں۔ یہ قوت نظریۂ باطل اور عملیۂ ظلم کے ذہن پر دخیل ہو جانے پر ایک تہلکہ مچا دیتی ہے اور وہ کیفیت پیدا نہیں ہونے دیتی جسے اطمینان کہا جاتا ہے۔ یہ بے اطمینانی گویا ذہنی اسمبلی کے ارکان عاملہ کے خلاف "ملامت کا ووٹ" ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ارکان عاملہ کی آمریت اس ووٹ کی کوئی پروا نہ کرے یا بہ جبر حس اخلاقی کا منہ بند کر دے، یا "مکارانہ بیانات" سے اس عدم اطمینان کی کیفیت کو ایک حد تک دبا دے، بہر حال یہ خفیہ پاسبان اپنا فرض ادا کیے بغیر نہیں رہتا۔[۱]

لیکن اگر ضمیر غلطی ہی کھا جائے یا اس کی آواز کو دبا دیا جائے تو پھر نتائج اعمال آدمی پر دباؤ ڈال کر اسے اصلاح کے لیے مجبور کرتے ہیں، یعنی فطرت اس کی غلط کاریوں پر اپنے قوانین کے ماتحت کچھ سزا دینا شروع کرتی ہے اور اس سزا کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ آدمی ظلم و باطل سے ہٹ کر حق و عدل کی طرف رجوع کرے۔ لیکن تمدنی دنیا میں چونکہ فطرت فرد کو سوسائٹی سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھتی ہے، اس لیے اکثر اوقات ایک فرد کے نتائج اعمال براہ راست خود اس پر مترتب ہونے کے بجائے سوسائٹی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس صورت میں سوسائٹی اس پر قانونی اور اخلاقی دباؤ ڈالتی ہے کہ وہ اپنی اصلاح کرے۔ پھر اگر بالفرض کوئی فرد ایسا موقع آنے سے پہلے ہی چل بسے یا سوسائٹی کے دباؤ کے باوجود اپنی اصلاح نہ کرے تو بھی مختلف افکار و کردار کے نتائج کا ایسا ریکارڈ تاریخ کے پاس جمع ہو جاتا ہے جس سے نوع انسانی فائدہ اٹھاتی ہے۔

یہ سارے فطری انتظامات یہ بتاتے ہیں کہ انسان کی روح ظلم و باطل کا نہیں، بلکہ حق و عدل کا مطالبہ کرتی ہے۔ اور اس دعویٰ پر سب سے بڑی شہادت یہ ہے کہ آج تک انسان نے کبھی کسی نظریہ کو یہ کہہ کر پیش نہیں کیا ہے کہ یہ چونکہ باطل ہے، اس لیے پیش کیا جا رہا ہے اور نہ کبھی کسی نظریہ کو یہ مان کر قبول کیا ہے کہ چونکہ یہ غلط ہے، اس لیے قبول کیا جاتا ہے۔ اسی طرح کسی ظالم سے ظالم انسان نے بھی کسی طریق عمل کی طرف اس بنیاد پر دعوت نہیں دی ہے کہ یہ چونکہ عدل نہیں ہے اس لیے اسے اختیار کیا جانا چاہیے اور نہ کسی چنگیز اور ہلاکو نے بھی کسی کردار کو اس دلیل سے پسند کیا ہے کہ یہ چونکہ ظلم ہے اس لیے یہی موزوں ترین کردار ہے۔ نظریے ہمیشہ حق کے نام سے اور عملیے ہمیشہ عدل کے نام سے پیش اور قبول کیے گئے ہیں۔ یہ ہے بقائے اصول کے ماتحت تحفظ حق و عدل کے لیے فطرت کا اہتمام:

مگر "بقائے انفع" کے اصول کے ماتحت حق و عدل کے تحفظ کے اتنے انتظامات کے باوجود یہ ظلم و باطل اپنی شر انگیزیوں اور ضرر پاشیوں کے ساتھ کہاں سے آ ابھرتے ہیں؟ اس سوال کے جواب میں ہم ان رخنوں کی طرف مختصراً اشارہ کرتے ہیں جو شے کے ذہن

---

[۱] جدید فلاسفی ضمیر کی اس پاسبانی کو معتبر نہیں سمجھتی، کیونکہ ضمیر کے مطالبات مختلف سوسائٹیوں میں مختلف ہو جاتے ہیں، لیکن اس سے ضمیر کی اہمیت ختم نہیں ہو جاتی۔ ضمیر کا کام دراصل یوں ہوتا ہے کہ وہ کسی عقلی و اخلاقی غلطی کو قبول کرنے سے پورے زور کے ساتھ ابا کرتا ہے مگر جب کوئی غلطی مضمون "مسلمات" میں داخل ہو جاتی ہے تو پھر جیسے کچھ مسلمات ہوتے ہیں ضمیر انھیں کے معیار پر عقلی و اخلاقی اقدار کو قبول کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ انسانی معدہ "شراب" جیسی بدبودار و ہوش ربا چیز کو فطری غذا تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہے مگر جب متواتر اسے اس کے قبول کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے تو شراب کی خواہش فطری غذاؤں کے مقابلہ میں کچھ زیادہ تیز ہی ہو جاتی ہے۔

انسانی میں در آنے کے چور دروازے ہیں ــــ تاکہ وہ "خیر" کی قوتوں کو چیلنج کرے، ان کو بیدار اور برسر عمل رکھے اور انسان نیکی یا بدی کو باہر سے بہ جبر مسلط ہوتا ہوا نہ پائے بلکہ دونوں میں سے کسی ایک کو اپنی پسند سے انتخاب کرے اور اس کے تحفظ و ارتقاء کی خاطر نظریات و عملیات کی عالمگیر دوامی معرکہ آرائیوں میں شریک ہو۔ صرف یہی صورت اس کے شعور کو ارتقاء کے راستہ پر رواں رکھنے والی ہے

خیر تو فرد کی ذہنی و عملی لغزشوں کی وجوہ بالعموم حسب ذیل ہوتی ہیں۔

میدانِ نظریات ــــ !

(۱) خواہش پرستانہ طرزِ فکر[له]: ــــ یعنی آدمی اپنا رویہ تو پہلے تجویز کر لے اور اسے موزوں و معقول قرار دینے کے لیے اساسی نظریہ بعد میں گھڑے، وہ بھی یوں کہ نظریہ حسب ضرورت پہلے متعین کرے اور اس کے لیے دلائل بعد میں ادھر ادھر سے ٹٹولتا پھرے "نظام المنطق" میں مِل نے بھی اس انسانی کمزوری کو تسلیم کیا ہے کہ اس کے جذبات اور اس کی خواہشات سے اس کا استدلال متاثر ہوتا ہے۔ علاوہ بریں متعدد دوسرے فلسفیوں نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے کہ آدمی پہلے نتائج ذہن میں رکھ لیتا ہے اور دلائل و قضایا بعد میں مترتب کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ عملی زندگی کے تقاضے فوری ہوتے ہیں اور وہ آدمی کو دو اقدامات میں سے کسی ایک کو انتخاب کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ پس آدمی وقتی ضروریات کے ماتحت اقدام کی سمت تو پہلے متعین کر لیتا ہے اور نظریہ بعد میں اس کے ساتھ نصب کرنے کی کوشش کرتا ہے، نیز اس نظریہ کے لیے دلائل سوچتا رہتا ہے۔ ایسی صورت میں عمل میں اعتدال کا بحال رہنا ممکن نہیں ہے۔ بجز ایک خوش اتفاقی کے اور خوش اتفاقی اخلاقیات میں شاذ ہی پائی جاتی ہے۔

(۲) اپنی محدود عقل پر کلی انحصار: ــــ یعنی جن امور میں حسی و تجربی عقل کی رسائی نہ ہو ان کی گرہ کشائی کے لیے بھی عقل ہی کے کمزور ناخنوں کو استعمال کرنا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اساسی نظریات جن امور سے تعلق رکھتے ہیں ان کا ایک سرا مادی دنیا میں محسوس کیا جا سکتا ہے مگر ان کا دوسرا سرا تو پردۂ غیب کے پیچھے مستور ہے۔ لیکن محسوس سرے کی غلط سلط نمائش میں جب انسانی عقل کچھ جوہر دکھانے لگتی ہے تو غیبی صداقتوں کو پا لینے کیلئے بھی انسان اسی آلہ پر انحصار کرنے لگتا ہے۔ کچھ اسی طرح جیسے نالہ میں تیر سکنے والی کاغذ کی ناؤ کو سمندر میں ڈال دیا جائے۔

(۳) ناکافی علم کے بل پر فیصلہ دینا: ــــ یعنی کسی حقیقت کو اس کے جملہ پہلوؤں کا احاطہ کرنے سے پہلے متعین و متشخص کر لینا۔ یہ صورت بھی فوری عملی تقاضوں کے ماتحت ظہور پاتی ہے۔ اور آدمی مجبور ہوتا ہے کہ جتنا علم اسے حاصل ہے، اسی کے بل پر خیر و شر کی تحدید کرے، چنانچہ وہ نظام تمدن کے پرپیچ اجزاء و عناصر کا کلی احاطہ نہ کر سکنے کی وجہ سے ٹھوکریں کھاتا ہے۔

(۴) قیاسات و مفروضات کو ثابت شدہ حقائق کا درجہ دینا: ــــ یعنی حقائق کو احاطہ کرنے کے پورے ذرائع موجود نہیں ہوتے ہیں، اس لیے ان کے معاملہ میں ظن و تخمین کے نتائج مستحضر کو واجب التسلیم تعبیر حقیقت مان لیا جاتا ہے۔ یہ چیز بھی زندگی کے فوری عملی تقاضوں کی وجہ سے واقع ہوتی ہے۔

له میکیاولی "پرنس" میں لکھتا ہے کہ لوگ مسائل کو ان کی واقعی شکل میں نہیں دیکھتے بلکہ اس شکل میں دیکھتے ہیں جو انھیں مرغوب ہوتی ہے اور پھر تباہ ہو کے رہ جاتے ہیں۔

میدان عمل میں ——!

(۱) سوسائٹی میں تفریق :— یعنی اپنے آپ کو یا اپنے کسی محبوب شخص یا مجموعۂ اشخاص کو عام سوسائٹی سے بالاتر سمجھنا اور اسی طرح کسی مبغوض شخص یا اشخاص کو عام انسان کی سطح سے فروتر قرار دینا اور پھر اسی تفریق کے مطابق اپنے عمل کو دو دخایا سہ دخایا صد دخا بنا لینا یہاں آدمی اپنے جذبات محبت و نفرت، اخوت و عداوت وغیرہ کا آلۂ کار بنجاتا ہے۔

(۲) اعمال حیات کی تقسیم :—— یعنی ہمہ بیں نگاہ سے محروم ہونے کی وجہ سے زندگی کے پورے عمل اور اسکے مجموعی نتائج کو کسی مرکزی نصب العین کے ماتحت رکھ کر دیکھنے کے بجائے اس کے ایک ایک جزئی عمل کے لیے الگ الگ سمت اقدام متعین کرنے کی شکل اختیار کر لی جاتی ہے۔

(۳) فطرتِ انسانی کو متغیر قرار دینا :— یعنی آدمی فطرتِ انسانی کے مطالبات اور انھیں پورا کرنے کے اصولوں کو دوامی اور عالمگیر ماننے کی جگہ تاریخ ماحول اور "وقتی" تسلیم کر کے بے اصولے پن پر اتر آتا ہے اور اس طرح اپنے ایک ایک جذبہ اور ایک ایک خواہش کا اتباع کرنے لگتا ہے۔

یہ ہیں وہ خفیہ شاہ رہے جن سے عالم افکار اور عالم کردار میں باطل اور ظلم کا داخلہ ہوتا ہے۔ یہ شاہ رہے کیوں کر بند کیے جا سکتے ہیں اور اس مقصد کے لیے فطرت نے کیا سامان فراہم کیے ہیں۔ اس کا مفصل جواب آگے چل کے دیا جا رہا ہے۔[۱]

یہاں اتنی بات ذہن نشین ہو جانی چاہیے کہ قانون بقائے انفع کے تحت سوسائٹی میں قبولیت صرف اسی فرد کے لیے ہے جو معاملات و تعلقات میں حق اور عدل کا لحاظ کرتا ہے اور جو اپنے انفرادی مطالبات کو پورا کرنے کے لیے دوسروں کے مفاد کو کچل ڈالنے کی جسارت نہیں کرتا۔ بخلاف اس کے اگر کوئی فرد ظلم کی برچھی لیکر کھڑا ہوتا ہے تو سوسائٹی کبھی بھی اسے سینے سے لگانے پر تیار نہیں ہوتی۔ آخر ایک شخص جو اسی کی چھاتی پر مونگ دلتا ہے، اسی کا خون چوس چوس کر پھلتا پھولتا ہے، اور اسی کا گوشت کھا کر موٹا ہوتا ہے، وہ اسے کیونکر سر آنکھوں پر جگہ دے سکتی ہے۔ —— بجز اس صورت کے کہ کوئی دشمن انسانیت "خدمت" ہی کی قبا اوڑھ کے نمودار ہو اور کوئی "قاتلِ امن" شرافت ہی کا جبہ زیب بدن کر کے سامنے آئے اور روپے کے زور سے، طلاقت لسانی کے زور سے اور جاہ و منصب کے زور سے شر و فساد پھیلاتا رہے مگر کوئی اس کا بازو پکڑنے والا نہ ہو۔ یہ ہو سکتا ہے، مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ انسانیت صدق دل سے کسی قدر و قیمت کا مستحق قرار دے۔ سوسائٹی میں اصلاً قدر صرف "خدمت پیشہ" افراد کی ہے جو حق پر قائم اور عدل پر مستقیم ہوں، اور یہی وجہ ہے کہ ناجائز انتفاع پیشہ" افراد بھی بالعموم خدمت یعنی اتباع حق و عدل ہی کا جھنڈا اٹھائے ہوئے آگے بڑھتے ہیں، کیونکہ انھیں معلوم ہے کہ جانا پہچانا "ظلم" اور کھلا کھلا باطل کبھی بھی سندِ قبولیت حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ صحیح ہے کہ ظلم کو اس کے خوفناک اسلحہ کے ساتھ کام کرتے ہوئے مختلف سوسائٹیوں میں دیکھا جا سکتا ہے مگر افسوس یہ ہے کہ سطح بیں لوگوں کی نگاہیں ان دبے دبے جذبات نفرت و حقارت کو نہیں دیکھ سکتیں جو مظلوم عناصر کے اندر پرورش پاتے رہتے ہیں اور فطری وقت پر جب وہ پھٹ پڑتے ہیں تو سوسائٹی کا نظام تہ و بالا ہو جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے دور آغاز میں اس کے علمبردار یہ کہاں مان سکتے تھے کہ ان کے کارخانوں میں بیلوں گایوں کی طرح کے بے بس انسانوں کا جو ریوڑ دن رات مصروف کار رہتا ہے یہ کل خود ان کے سروں پر اپنی ڈکٹیٹر شپ کا تخت بچھانا چاہے گا مگر قانون فطرت یہی ہے کہ ظلم اگر ابھرے تو اسے مظلوموں کے ذریعہ کچلوا دیا جائے —— دیر ہے مگر اندھیر نہیں!

(باقی آئندہ)

[۱] یہ سوال اس مضمون کے دوران میں حل نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اسی سلسلہ کے آئندہ مضمون "شاہ راہِ ارتقا" کو اسی سوال کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے۔

رسائل و مسائل

مفتوح فاتح کی عدالت میں

سوال: آج کل جنگی مجرموں (War criminals) کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کا بہت چرچا ہے۔ اسلام کا اس ضمن میں کیا حکم ہے؟

جواب: یہ "جنگی مجرم" کی اصطلاح بھی ایک عجیب اصطلاح ہے جسے یورپ کے مکارانہ اخلاق نے موجودہ زمانہ میں ایجاد کیا ہے۔ اس کی اصلیت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ایک قوم جس سے کسی دوسری قوم کی لڑائی محض قومی اغراض کے لیے ہوئی تھی، جنگ میں فتح یاب ہونے کے بعد مفتوح قوم کے جنگی و سیاسی لیڈروں سے انتقام لینا چاہتی ہے۔ لڑائی دونوں طرف سے اقتدار اور منفعت طلبی کی خاطر ہوئی تھی۔ ایک دنیا پر پہلے مسلط ہو چکا تھا اور چاہتا تھا کہ اپنے تسلط کو اور ان فائدوں کو جو اس جابرانہ و ظالمانہ تسلط کی بدولت اسے حاصل ہو رہے تھے، محفوظ رکھے، اور دوسرا بعد میں آیا اور اس نے پہلے کے تسلط و اقتدار کو اپنی راہ میں رکاوٹ دیکھ کر اسے ہٹانا چاہا۔ اس لحاظ سے دونوں کی لڑائی کسی پاکیزہ اخلاقی غرض پر مبنی نہ تھی۔ لیکن اب جبکہ ایک فریق غالب آ گیا تو وہ اپنے اس غصہ اور اس انتقامی جذبہ کو جو اس کے دل میں محض اس لیے بھڑکا تھا کہ مخالف فریق نے اس کے اقتدار کو چیلنج کیوں کیا، اخلاق کا رنگ دینے کی کوشش کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ ہم تو نہیں مگر ہمارا فریق مخالف ایک ڈاکو اور بدمعاش تھا اور اس نے دنیا کے امن کو غارت کیا (گویا کہ خود انھوں نے دنیا کے امن کو کبھی غارت نہیں کیا تھا) اس نے بستیوں پر ظلم ڈھائے (گویا کہ ظلم و ستم ڈھانے کا ارتکاب ان سے خود کبھی نہ ہوا تھا) اور اس نے عہد و پیمان توڑے (گویا کہ یہ ہمیشہ عہد و پیمان کے بڑے پابند تھے)۔ اس لیے اس کے بڑے بڑے لیڈر اور فوجی کمانڈر مجرم ہیں اور انھیں اسیر جنگ کے بجائے اخلاقی مجرم کی حیثیت سے سزا دی جانی چاہیے حالانکہ فی الواقع جس قومی جذبہ میں یہ خود سرشار ہیں اور ان کے لیڈر جس جذبے کے تحت اپنی قومی سربلندی کو برقرار رکھنے کے لیے کوشش کرتے رہے ہیں، اسی جذبے سے ان کی مخالف قوم کے لیڈر بھی سرشار تھے اور اپنی قوم کے لیے سربلندی حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے، اور کوشش کے طریقوں میں اخلاقی نقطۂ نظر سے دونوں کے درمیان کوئی فرق نہ تھا۔ اب اصل غرض تو صرف یہ ہے کہ حریف قوم کے اندر جن لوگوں نے قومی جذبہ کو بھڑکایا تھا، اور جو اس امر کی قابلیت رکھتے تھے کہ اپنی قوم کو منظم کر کے اور اس کے وسائل کو ترقی دے کر میدان مقابلہ میں استعمال کر سکیں، انھیں ختم کر دیا جائے تاکہ یہ قوم ہمارے اقتدار اور ہمارے تسلط علی الارض کو پھر چیلنج کرنے کے قابل نہ ہو سکے، لیکن اس خالص انتقامی جذبہ کی گھناؤنی صورت کو اخلاقی عدل کی خوشنما نقاب میں چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

یہ اخلاقی عدل کا ڈھونگ جس طرح ایک فریق کامیاب ہو جانے کے بعد رچا سکتا ہے، بعینہٖ اسی طرح دوسرا فریق بھی فتح یاب ہونے کے بعد رچا سکتا تھا، اور اس صورت میں بھی اخلاقی حیثیت سے یہ ایک نہایت ذلیل قسم کا مکر و فریب ہی ہوتا۔ میں حیران ہوں کہ موجودہ تہذیب نے دنیا کی بڑی بڑی متمدن اور ذی عزت قوموں اور ان کے مدبرینِ سلطنت کے اندر کس قسم کی بے حیائی پیدا کر دی ہے اور ان قوموں کے علماء و فضلاء اور فلاسفر

اخلاق کی اخلاقی حس کو کیسا کند کر دیا ہے کہ ایسی ایسی صریح مکارانہ باتیں علی الاعلان کی جاتی ہیں اور کسی کو ان کے اندر نہ شرم محسوس ہوتی ہے اور نہ کوئی ان کے گھناؤنے پن کو محسوس کرتا ہے۔ کون صاحب عقل و تمیز آدمی، جو عدل کے معنی کا ذرہ برابر شعور رکھتا ہو، یہ تصور کر سکتا ہے کہ جنگ کا ایک فریق عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر دوسرے فریق کے ساتھ واقعی انصاف کر سکے گا؟ — اگر انفرادی زندگی میں کسی مقدمہ کا ایک فریق دوسرے فریق کے لیے جج نہیں بن سکتا تو قومی زندگی میں آخر ایک فریق جنگ دوسرے فریق جنگ کے لیے جج کیسے بن سکتا ہے؟

آپ پوچھتے ہیں کہ اسلام کا اس معاملہ میں کیا حکم ہے؟ میں کہتا ہوں کہ اسلام اس قسم کے کر کو مکر ہی سمجھتا ہے۔ اس کے نقطۂ نظر سے تمام وہ لوگ جو فریقین جنگ میں سے ایک دوسرے کے ہاتھ آئیں، اسیر جنگ ہیں اور اسیران جنگ کے متعلق اسلام کے احکام جو کچھ ہیں وہ واضح طور پر میں اپنی کتاب "الجہاد فی الاسلام" میں بیان کر چکا ہوں۔ لڑائی کے بعد عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر مجرم کی حیثیت سے دشمن کو بلانا اور اس کا فیصلہ کرنے کے لیے خود بیٹھ جانا بہت بڑے پیمانے کی اخلاقی بے حیائی چاہتا ہے اور اسلام وہ دین ہے جو حیا کو محض شعبۂ اخلاق ہی نہیں، بلکہ شعبۂ ایمان قرار دیتا ہے۔

میدان جنگ میں قحبہ گری کے انتظامات اور اسلام

سوال:۔ آج کل جنگ میں جہاں سپاہیوں کو وطن سے ہزاروں میل دور جانا پڑتا ہے اور ان کی واپسی کم از کم دو سال سے پہلے ناممکن ہو جاتی ہے، سوشل قباحتیں مثلاً زنا وغیرہ کا پھیل جانا لازمی ہے، کیونکہ جنگ کے جذبہ کی بیداری کے ساتھ تمام جذبات سفلی بھی بھڑک اٹھتے ہیں۔ اس چیز کو روکنے کے لیے یا قابو میں لانے کے لیے فوجیوں کے لیے رجسٹرڈ رنڈیاں بہم پہنچانے کی اسکیم پر عمل ہو رہا ہے اور ان کے دلوں کو خوش رکھنے کے لیے (W.A.C.I) دفتروں میں ملازم رکھی جا رہی ہیں۔ یہ دونوں صورتیں قابل نفرین ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ ان کی تردید کے بعد اسلام اس عقدہ کے حل کا کیا طریق بتاتا ہے۔ کنیزوں کا سسٹم کس حد تک اس قباحت کا ازالہ کر سکتا ہے اور کیا وہ بھی ایک طرح کی جائز کردہ قحبہ گری (Prostitution) نہیں ہے؟

جواب:۔ آپ کے دوسرے سوال میں ایک پیچیدگی ہے جسے شائد آپ نے اپنا سوال تحریر کرتے وقت محسوس نہیں کیا۔ آپ جس مسئلہ کا حل دریافت کرنا چاہتے ہیں اس میں آپ کے پیش نظر تو ہیں موجودہ زمانہ کی فوجیں اور ان کی ضروریات، لیکن اس کا حل چاہتے ہیں آپ اسلام سے۔ حالانکہ اسلام جن فوجوں کی ضروریات کا ذمہ لیتا ہے وہ اس کی اپنی فوجیں ہیں نہ کہ فساق و فجار اور جبابرہ کی فوجیں۔

موجودہ زمانہ کی فوجوں کا حال یہ ہے کہ انھیں محض لڑنے کے لیے تیار کیا جاتا ہے اور جو سلطنتیں ان کو تیار کرتی ہیں، خود ان کے پیش نظر بھی کوئی پاکیزہ اخلاقی نصب العین نہیں ہوتا۔ اگر وہ اپنی قومی فوج تیار کرتی ہیں تو ان کے اندر صرف وہ اخلاقیات پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں جو قوم کا جھنڈا بلند کرنے اور بلند رکھنے کے لیے درکار ہیں، اور ظاہر ہے کہ ان اخلاقیات میں طہارت اخلاق کے عنصر کا کوئی مقام نہیں ہے — اور اگر وہ اپنی محکوم قوموں میں سے اپنی اغراض کے لیے فوجیں تیار کرتی ہیں تو انھیں صرف اس اخلاق کی تربیت دیتی ہیں جو پالتو شکاری کتوں میں پیدا کیا جاتا ہے (یعنی یہ کہ روٹی دینے والے کے وفادار رہیں اور شکار اس کے لیے ماریں

ذکر اپنے لیے) اس کے سوا کسی دوسرے اخلاق کی اہمیت سرے سے ان "مہذب" قوموں میں ہے ہی نہیں اور زنا، شراب، جوا اور دوسری قسم کی بداخلاقیاں تو نیچے سے لے کر اونچے طبقوں تک خود ان کے اندر پھیلی ہوئی ہیں۔ نیز جبکہ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر ہی یہ ہے کہ "بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کی فوجوں میں کسی قسم کا اخلاقی انضباط پایا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی فوجیں مار دھاڑ کے فنون میں تو انتہائی کمال کے درجہ تک پہنچ جاتی ہیں، لیکن طہارتِ اخلاق کے نقطۂ نظر سے پستی کی اس حد تک گری ہوئی ہوتی ہیں جس کا مشکل ہی سے کوئی انسان تصور کر سکتا ہے۔ انھیں کھانے کے لیے دل کھول کر راشن دیا جاتا ہے، پینے کے لیے خم شراب کا منہ ہر وقت کھلا رکھا جاتا ہے، خرچ کرنے کے لیے پیسے بھی کافی دے دیے جاتے ہیں، پھر سانڈوں کی طرح انھیں چھوڑ دیا جاتا ہے کہ اپنی خواہشات نفس جہاں اور جس طرح چاہیں پوری کرتے پھریں۔ حکومتیں خود بھی ان کے لیے قحبہ خانے تیار رکھتی ہیں، قوم کی لڑکیوں میں بھی یہ جذبہ پیدا کیا جاتا ہے کہ وہ ملک و قوم کے لیے لڑنے والے سپاہیوں کی خاطر اپنے جسم رضاکارانہ طور پر پیش کرنے کو قومی ایثار اور سرمایۂ افتخار سمجھیں اور اس پر بھی جب ان انسانی نروں کے بھڑکے ہوئے جذبات ٹھنڈے نہیں ہو سکتے تو ان کو پوری آزادی حاصل ہوتی ہے کہ انسانی گلہ میں جہاں بھی مادائیں ان کو نظر آئیں، ان سے "بزور" یا "بزر" ان کے جسم خرید لیں یا چھین لیں۔ اس طرح جن فوجوں کو پالا گیا ہو، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ جب وہ دشمنوں کے ممالک میں فاتحانہ داخل ہوتی ہوں گی تو وہاں ان کی شہوانی ضروریات کتنی بڑھ جاتی ہوں گی اور کس قیامت خیز صورت میں وہ پوری کی جاتی ہوں گی!

اب آپ خود ہی سوچ لیں کہ ایسی فوجوں کے مسائل اور ان کی ضروریات کا حل اسلام کیسے بتا سکتا ہے۔ انھیں مغرب ہی کے مادہ پرستانہ اخلاق نے پیدا کیا ہے اور ان کے شرمناک مسائل کا حل بھی وہی پیش کر سکتا ہے۔ اسلام جن فوجوں کو تیار کرتا ہے وہ سیاسی و معاشی جغرافیہ کے اوراق بھاڑنے اور جوڑنے کے لیے تیار نہیں کی جاتیں، بلکہ صرف اس لیے تیار کی جاتی ہیں کہ دنیا اگر خدا کی اطاعت سے پھری ہوئی ہو اور دعوت و تبلیغ سے راہ راست پر نہ آئے تو اسے بزورِ شمشیر اتباعِ نور کر دیا جائے کہ وہ کم از کم فتنہ و فساد سے تو باز آجائے۔ اس متعین مقصود کے لیے جو فوجیں جہاد کرتی ہیں، ان کا جہاد فی سبیل النفس نہیں بلکہ فی سبیل اللہ ہوتا ہے اور وہ میدانِ جنگ میں بھی اسی جذبۂ عبادت کے ساتھ جاتی ہیں جس کے ساتھ وہ صحنِ مسجد میں قدم رکھتی ہیں۔ پھر اس میدان میں ان کو اتارنے سے پہلے تزکیۂ نفس اور تطہیرِ اخلاق کے ایک پورے کورس سے انھیں گزارا جاتا ہے۔ انھیں خدا سے پھرے ہوئے لوگوں کی سرکوبی کا کام سکھانے کے ساتھ یہ بھی سکھایا جاتا ہے کہ وہ اپنے نفس کو، اگر خدا سے پھرا ہوا ہو، کس طرح زیر کریں اور دوسروں کو احکامِ الٰہی کا مطیع بنانے سے پہلے خود اپنے آپ کو کس طرح مطیع بنائیں۔ انھیں یہ سکھایا جاتا ہے کہ میدانِ جنگ میں قدم قدم پر خدا کو یاد کرتے ہوئے بڑھیں، عین لڑائی کی حالت تک میں نماز اپنے وقت پر ادا کریں اور دن ان کے گھوڑے یا ٹینک کی پشت پر گزریں تو راتیں مصلے پر۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی تربیت یافتہ فوج جو ایک پاکیزہ اخلاقی مقصد کے لیے لڑے اور اپنے عقیدہ کے مطابق زمانۂ جنگ کو زمانۂ عبادت سمجھتی ہوئی رقبۂ جنگ میں رہے، اس کی شہوانی ضروریات بھی موجودہ فوجوں کی ضروریات جیسی نہیں ہو سکتیں اور نہ وہ اپنی ان ضروریات کو پورا کرنے میں ان فوجوں کی طرح آزادی کی خواہشمند ہو سکتی ہے۔

اگرچہ بعض روایات کے مطابق زمانۂ جنگ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے متعہ کو جائز رکھا تھا (جسے عرب میں پہلے جائز سمجھا جاتا تھا)، لیکن یہ بات ثابت ہے کہ بہت جلدی آپ نے اس کو ممنوع قرار دے دیا۔ اس میں شک نہیں کہ زمانۂ جنگ میں پکڑی ہوئی کنیزوں کو

استعمال کرنے کی اجازت اسلام میں دی گئی ہے، لیکن وہ بھی صرف اس صورت میں ہے جبکہ امام وقت اس کو سپاہیوں میں تقسیم کرکے انھیں سپاہیوں کی ملک قرار دے دے، تاکہ ایک سپاہی کا تعلق جس کنیز یا جن کنیزوں سے ہو، انھیں تک اس کا تعلق شہوانی محدود رہے، اور دوسرے کسی شخص کے لیے ان کے ساتھ یہ تعلق جائز نہ ہو، نیز حکومت کے توسط سے قانونی طور پر یہ تعلق قائم ہونے کے بعد سوسائٹی میں یہ بات معلوم و معروف رہے کہ یہ خاص عورت فلاں خاص مرد کی ہے (یعنی وہی فائدہ جو نکاح کا ہے) اس سے یہ امر بالکل واضح ہوجاتا ہے کہ اسلام حالت جنگ میں اپنی فوجوں کی شہوانی ضروریات پوری کرنے کے لیے اخلاقی قیود میں ذرہ برابر بھی کوئی ڈھیل پیدا نہیں کرتا بلکہ اس کے برعکس وہ چاہتا ہے کہ جائز تعلق شہوانی کے مواقع میسر آنے تک وہ ضبط نفس سے کام لیں، خواہ یہ موقع میسر آنے میں کتنے برس لگ جائیں۔ البتہ حدیث کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسانی کمزوریوں کا لحاظ کرتے ہوئے حکومت کا فرض یہ دیکھنا بھی ہے کہ اس کے سپاہی زیادہ مدت تک اپنی عورتوں سے علٰحدہ رہنے اور اسی طرح ان کی عورتیں اپنے مردوں سے جدا رہنے کی بنا پر کسی بداخلاقی میں مبتلا نہ ہونے پائیں۔ یہی غرض تھی جس کی خاطر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:-

حرمت نساء المجاھدین علی القاعدین کحرمۃ امھاتھم — مجاہدین کی بیویاں پیچھے رہنے والے مردوں کے لیے اپنی ماؤں کی طرح حرام ہیں۔

اور یہ کہ:-

ما من رجل من القاعدین یخلف رجلًا من المجاھدین فی اھلہ فیخونہ فیھم الا وقف لہ یوم القیامۃ فیاخذ من عملہ ما شاء — فما ظنکم؟ — جو شخص پیچھے رہنے والوں میں سے کسی مجاہد کی بیوی کے معاملہ میں خیانت کا ارتکاب کرے گا وہ قیامت کے روز اس مجاہد کے سامنے پیش کردیا جائے گا کہ اس خائن کے اعمال خیر میں سے جو کچھ چاہے لے لے۔ پھر تم کیا گمان کرتے ہو کہ وہ اس کے

اور یہی غرض تھی جس کی وجہ سے حضرت عمرؓ نے ایک مجاہد کی بیوی کو اس کے فراق میں عشقانہ اشعار گاتے ہوئے سن کر یہ حکم دیا تھا کہ سپاہیوں کو اتنی زیادہ طویل مدت تک ان کی بیویوں سے جدا نہ رکھا جائے جس میں ان کے بداخلاقی سے ملوث ہوجانے کا احتمال ہو۔ بالفاظ دیگر فوج میں رخصت (   ) کا سسٹم اسلامی حکومت میں زیادہ تر اسی غرض کے لیے جاری کیا گیا تھا۔

آپ کا یہ سوال کہ کنیزوں کے استعمال کی اجازت کیا قحبہ گری (   ) کو قانونی جواز دینے کی ہم معنی نہیں ہے؟ یہ معنی رکھتا ہے کہ آپ یا تو قحبہ گری کے معنی سے ذہول برت رہے ہیں، یا کنیزوں سے تمتع کی صحیح حیثیت آپ کے سامنے نہیں ہے۔ قحبہ گری دراصل اس چیز کو کہتے ہیں کہ ایک مرد کسی عورت کا جسم کرایہ پر مستعار حاصل کرے۔ اور شوقیہ قحبہ گری یہ ہے کہ کسی متعین کرایہ کے بغیر (جاہے ہدیوں اور تحفوں کی مقدار مارکیٹ ریٹ سے بہت زیادہ ہی کیوں نہ ہو) یہ مستعار تعلق قائم ہو۔ لیکن کنیز کے ساتھ تمتع سرے سے مستعار ہوتا ہی نہیں، بلکہ جب تک وہ کنیز اس شخص کی ملکیت میں ہے، وہ ایسا ہی ایک مستقل تعلق ہے جیسا زوجین میں ہوا کرتا ہے اور اسی از روئے قانون اولاد کا نسب اسی طرح ثابت ہوتا ہے جس طرح نکاح سے ثابت ہوتا ہے۔

المہدی کی علامات اور نظامِ دین میں اسکی حیثیت

سوال:- ظہور مہدی کے متعلق آپ نے رسالہ تجدید احیائے دین میں جو کچھ لکھا ہے اس میں اختلاف کا ایک پہلو یہ ہے کہ

کہ آپ مہدی موعود کے لیے کوئی امتیازی و اختصاصی علامات تسلیم نہیں کرتے، حالانکہ احادیث میں واضح طور پر علامات مہدی کا تذکرہ موجود ہے۔ آخر اس سلسلہ روایات سے چشم پوشی کیسے کی جا سکتی ہے؟

جواب: ظہور مہدی کے متعلق جو روایات ہیں، ان کے متعلق ناقدین حدیث نے اس قدر سخت تنقید کی ہے کہ ایک گروہ سرے سے اس بات کا قائل ہی نہیں رہا ہے کہ امام مہدی کا ظہور ہوگا۔ اسماء الرجال کی تنقید سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان احادیث کے اکثر رواۃ شیعہ ہیں۔ تاریخ سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر گروہ نے سیاسی و مذہبی اغراض کے لیے ان احادیث کو استعمال کیا ہے اور اپنے کسی آدمی پر ان کی مندرجہ علامات کو چسپاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان وجوہ سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ نفس ظہور مہدی کی خبر کی حد تک تو یہ روایات صحیح ہیں لیکن تفصیلی علامات کا بیشتر بیان غالباً وضعی ہے اور اہل غرض نے شاید بعد میں ان چیزوں کو اصل ارشاد نبوی پر اضافہ کیا ہے۔ مختلف زمانوں میں جن لوگوں نے مہدی موعود ہونے کے جھوٹے دعوے کیے ہیں، ان کے لٹریچر میں بھی آپ دیکھیں گے کہ ان کی ساری فتنہ پردازی کے لیے مواد انھیں روایات نے بہم پہنچایا ہے۔

میں نے جہاں تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشنگوئیوں پر غور کیا ہے، ان کا انداز یہ نہیں ہوتا کہ کسی آنے والی چیز کی علامات و تفصیلات اس طریقے سے کبھی آپ نے بیان کی ہوں جس طرح ظہور مہدی کی احادیث میں پائی جاتی ہیں۔ آپ بڑی بڑی اصولی علامات تو ضرور بیان فرمایا کرتے تھے، لیکن جزئی تفصیلات بیان کرنا آپ کا طریقہ نہ تھا۔

سوال: ضرورت بعثت مہدی کو "تجدید و احیائے دین" میں تسلیم تو کر لیا گیا ہے، لیکن مہدی کا کیا کام ہوگا، اس مسئلہ کو نقلی تائید کے بغیر محض اپنے لفظوں میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ احادیث شریفہ کی روشنی میں اس کی تفصیل کی جائے تو مناسب ہے۔ نیز مہدی موعود کے مراتب و خصوصیات اور ضرورت اطاعت مہدی وغیرہ پر کوئی بحث نہیں کی گئی ہے، بلکہ عام مجددین میں شمار کر دیا گیا ہے۔ اگرچہ مجدد کامل اور مجدد ناقص کی تقسیم سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ غالباً یہاں "مجدد" کا لفظ بربنائے لغت استعمال ہوا ہے، اصطلاحاً نہیں۔ تاہم جبکہ مجدد معصوم عن الخطا نہیں ہوتا اور مہدی موعود کو معصوم عن الخطا ہونا ضروری ہے تو پھر اس بین فرق کے ہوتے ہوئے مہدی موعود کو مجدد کی فہرست میں کیسے شمار کیا جا سکتا ہے؟

جواب: اول تو خود لفظ "مہدی" پر غور کرنا چاہیے جو حدیث میں استعمال کیا گیا ہے۔ حضور نے مہدی کا لفظ استعمال فرمایا ہے جس کے معنی ہیں ہدایت یافتہ کے، "ہادی" کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے۔ مہدی ہر وہ سردار، لیڈر اور امیر ہو سکتا ہے جو راہ راست پر ہو۔ "المہدی" زیادہ سے زیادہ خصوصیت کے لیے استعمال ہوگا جس سے آنے والے کی کسی خاص امتیازی شان کا اظہار مقصود ہے۔ اور وہ امتیازی شان حدیث میں اس طرح بیان کر دی گئی ہے کہ آنے والا خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا نظام درہم برہم ہو جانے اور ظلم و جور سے زمین کے بھر جانے کے بعد از سر نو خلافت کو منہاج نبوت پر قائم کرے گا اور زمین کو عدل سے بھر دے گا۔ پس یہی چیز ہے جس کی وجہ سے اس کو مختص و ممتاز کرنے کے لیے "مہدی" پر "ال" داخل کیا گیا ہے۔ لیکن یہ سمجھنا بالکل غلط ہے کہ مہدی کے نام سے دین میں کوئی خاص منصب قائم کیا گیا ہے، جس پر ایمان لانا اور جس کی معرفت حاصل کرنا ویسا ہی ضروری ہو جیسا انبیاء پر ایمان لانا، اور اس کی اطاعت بھی شرط نجات اور شرط اسلام و ایمان ہو۔ نیز اس خیال کے لیے بھی حدیث میں کوئی دلیل نہیں ہے کہ مہدی کوئی امام معصوم ہوگا۔ در اصل یہ معصومیت غیر انبیاء کا تخیل ایک خالص شیعی تخیل ہے جس کی کوئی سند کتاب و سنت میں موجود نہیں ہے۔

یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ جن چیزوں پر اسلام و کفر کا مدار ہے اور جن پر انسان کی نجات موقوف ہے وہ سب قرآن میں موجود ہیں اور ان کا ثبوت قرآن ہی سے ملنا چاہیے۔ مجرد حدیث پر ایسی کسی چیز کی بنا نہیں رکھی جا سکتی جسے مدارِ کفر و ایمان قرار دیا جائے۔ احادیث چند انسانوں سے چند انسانوں تک پہنچتی ہوئی آئی ہیں، جن سے حد سے حد اگر کوئی چیز حاصل ہوتی ہے تو وہ محض گمانِ صحت ہے نہ کہ علم یقین۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اس خطرہ میں ڈالنا کبھی پسند نہیں کر سکتا کہ جو امور دین میں اتنے اہم ہیں کہ ان سے کفر و ایمان کا فرق قائم ہوتا ہو، انھیں صرف چند آدمیوں کی روایت پر منحصر کر دیا جائے۔ ایسے امور کو تو اللہ نے خود اپنی کتاب میں بیان کیا ہے اور اللہ کے رسول نے انھیں اپنے مشن کا اصل کام قرار دیتے ہوئے ان کی تبلیغ عام کی ہے، حتیٰ کہ وہ بالکل غیر مشتبہ طریقہ سے ہر ہر مسلمان تک پہنچائے گئے۔ پس مہدی کے متعلق خواہ کتنی ہی کھینچ تان کی جائے، بہرحال اس کی یہ حیثیت کبھی قرار نہیں دی جا سکتی کہ اس کے جاننے اور اس پر ایمان لانے کے بغیر کوئی شخص مسلمان نہ ہو سکتا ہو یا بالفاظِ دیگر نجات ہی نہ پا سکتا ہو۔ یہ حیثیت اس کی اگر ہوتی تو قرآن میں پوری صراحت کے ساتھ اس کا ذکر کیا جاتا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی دو چار آدمیوں تک نہیں بلکہ پوری امت تک اسے پہنچانے کی سعیِ بلیغ فرماتے اور اس کی خبر کو اپنے مشن کا ایک جز سمجھتے ہوئے اسے پھیلانے کی کوشش فرماتے۔ یہ کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی ایک اہم چیز کو اخبارِ احاد پر چھوڑا جا سکتا تھا اور وہ اخبارِ احاد بھی اس درجہ کی کہ امام مالک اور امام بخاری اور امام مسلم جیسے لوگ اپنے مجموعہ ہائے احادیث میں سرے سے ان کو لینا بھی پسند نہ کریں۔

خدا کے حضور میں دعا کرتے ہوئے ہاتھ اٹھانا

سوال:۔ میرے متعلق مقامی حلقوں میں چہ میگوئیاں بڑھ رہی ہیں۔ خصوصاً بعد نماز ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے پر بہت لے دے ہو رہی ہے۔ یہاں بہت زیادہ آبادی ایک ایسے خاص مسلک کے پیرووں کی ہے جن کا امتیازی گروہی شعار یہی ہے کہ خدا سے دعا کرتے ہوئے ہاتھ بلند نہ کیے جائیں۔ یہ حضرات اپنے اعتراض کے ساتھ دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ "ادعوا ربکم تضرعا وخفیۃ" کے ارشاد کا تقاضا یہی ہے کہ دعا میں حد درجہ اخفا برتا جائے اور ہاتھ اٹھانے سے اظہار ہوتا ہے۔ بریں وجہ دعا میں ہاتھ اٹھانا قرآن کے منشا کے خلاف ہے۔ نیز احادیث سے بھی یہ ثابت نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اس کا التزام کیا ہو۔ اب عوام کو دلائل سے تو کچھ مطلب ہوتا نہیں، وہ لکیر کی فقیری کا مطالبہ کرتے ہیں۔ چنانچہ مجھے صاف صاف کہہ دیا گیا ہے کہ ہمیں ان کی جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا حق نہیں رکھتا۔ اس حکم کے نافذ کرنے والوں میں بعض حضرات خوب اچھے تعلیم یافتہ بھی ہیں۔ خیر یہ تو جاہلیت کے کرشمے ہیں۔ مجھے صرف مذکورۃ الصدر آیت کی روشنی میں اصل مسئلہ کو سمجھنا ہے۔

جواب:۔ ان حضرات سے یہ دریافت کیجیے کہ "ادعوا ربکم تضرعا وخفیۃ" کا اگر یہی تقاضا ہے جو آپ لوگ سمجھتے ہیں تو یہ نماز کے لیے بلند آواز سے اذان اور پھر علانیہ مسجد میں لوگوں کا جانا، جماعت سے نماز پڑھنا، جہری قرأت کرنا، یہ سب بھی تو آیت کے خلاف ہوں گے، کیونکہ نماز اصل میں تو ایک دعا ہی ہے اور دعا کے لیے اگر اخفا ایسا ہی لازمی ہے کہ اظہار کی کوئی شکل اس میں نہ ہو تو نماز باجماعت کی یہ پوری صورت اس آیت کے خلاف ہو جائے گی۔

علاوہ بریں احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہدایت پائی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے جب دعا مانگی جائے تو ہاتھ اٹھا کر مانگی جائے اور دعا سے فارغ ہو کر چہرے پر ہاتھ مل لیے جائیں۔ چنانچہ ابوداؤد، ترمذی اور بیہقی میں اس کے متعلق متعدد روایات موجود ہیں۔ ایک حدیث میں حضرت سلمان فارسیؓ سے روایت ہے کہ ان ربکم حیی کریم یستحیی من عبدہ اذا رفع یدیہ ان یردھما صفراً یعنی تمہارا رب ایسا باحیا اور کریم ہے کہ جب بندہ اس کی طرف ہاتھ اٹھاتا ہے تو اسے شرم آتی ہے کہ اپنے بندے کو خالی ہاتھ واپس کرے۔ دوسری روایت میں حضرت عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود جب دعا مانگتے تھے تو ہاتھ اٹھا کر مانگتے تھے اور اس کے بعد چہرے پر ہاتھ مل لیا کرتے تھے۔ پھر حاکم نے مستدرک میں حضرت علیؓ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ دعا میں ہاتھ اٹھانا اللہ کے سامنے عاجزی اور مسکنت کے اظہار کے لیے ہے۔

اس کے بعد اگر کوئی شخص ہاتھ اٹھانے پر اعتراض کرتا ہے تو وہ دراصل ایک ایسی چیز پر اعتراض کرتا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول اور فعل سے ثابت ہے اور جس کے خلاف بجز قیاس اور گروہ بندی کے تعصب کے اور کوئی چیز نہیں ہے۔ اس قسم کے لوگ اگر خدا سے ڈرتے ہیں تو وہ اپنی گروہ بندیوں اور اپنے گروہی شعاروں کی بہ نسبت سنت کو زیادہ وزنی سمجھیں۔

تاثرات اجتماع (دارالاسلام) کے تحت کچھ سوالات

سوال: میں نے اجتماع کے موقع پر یہ محسوس کیا ہے کہ ہمارے رفقاء میں علمائے اسلام کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات پیدا ہو رہے ہیں۔ اس سے مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ ہم لوگ کہیں تعصب و تحزب میں مبتلا نہ ہو جائیں جیسے کہ پہلے بھی متعدد تحریکیں صحیح خطوط پر چل کر آخرکار فرقہ بندی پر جا ختم ہوئیں۔ اس فتنہ کا بروقت سدباب ہونا چاہیے۔ علماء اپنے رویہ میں ایک حد تک معذور ہیں کیونکہ انھوں نے ایک خاص ماحول میں دماغی تربیت پائی ہے اور ایک خاص طرز فکر سے وہ مسائل کو سوچنے کے عادی ہیں۔ ہمیں ان کی اس معذوری کا لحاظ رکھنا چاہیے۔

جواب: علماء کے متعلق جس رویہ کی شکایت آپ نے کی ہے، وہ یقیناً ایک حد تک پایا جاتا ہے اور میں خود بھی اس کو محسوس کرتا ہوں لیکن ابھی تک میرے نزدیک وہ اپنی فطری حد کے اندر ہے۔ جب دین کے لیے کوئی کام کیا جائے اور وہ بالکل صحیح دینی طرز پر بھی ہو، اعتقادی و عملی حیثیت سے کوئی قباحت بھی اس میں نہ بتائی جا سکے اور کسی کھوٹ یا غرض دنیوی کی نشاندہی بھی اس میں نہ کی گئی ہو اور پھر بھی علماء کی طرف سے اس کا صرف یہی نہیں کہ ساتھ نہ دیا جائے، بلکہ مخالفت کا رویہ اختیار کیا جائے تو میں نہیں سمجھتا کہ اس پر لوگوں کے رنجیدہ ہونے کی آخر کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ اور لوگ جب رنجیدہ ہوں تو ان کے رنج کا اظہار آخر کس شکل میں ہو؟ تاہم میں ہر وقت اس معاملہ میں چوکنا ہوں اور آپ یقین رکھیں کہ جب کبھی اسے قابل برداشت حد سے بڑھتا دیکھوں گا تو پوری قوت کے ساتھ رد کروں گا۔

آپ خود چونکہ علماء کے اس گروہ سے وابستگی رکھتے ہیں اور کچھ نہ کچھ عقیدت مندی کی لگاوٹ بھی ابھی تک لگی ہوئی ہے، اس لیے ان حضرات کی غلط روش پر جن لوگوں کو رنج ہے، ان کے رنج پر تو آپ کو شکایت ہے، لیکن خود اس غلط روش پر آپ ان حضرات کو ایک حد تک معذور پاتے ہیں۔ کاش زمانہ کے سینہ میں بھی آپ کا سا دل ہوتا کہ وہ بھی اس قسم کی معذوریوں کا لحاظ کر کے کسی کے ساتھ

رحم کرنے پر تیار ہو جاتا! لیکن آپ یقین رکھیے کہ آپ کے دل میں غلط کاروں کے لیے خواہ کتنے ہی نرم گوشے ہوں، زمانہ ایسے نرم گوشے اپنے سینے میں نہیں رکھتا۔ جو غلطیاں ترکستان، ترکی اور ایران کے علماء نے کیں، ان پر زمانہ نے کوئی رعایت نہیں کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ علماء کے ساتھ اسلام بھی ڈوب گیا۔ اب جرمنی کی شکست اور روس کی فتح کی بدولت کمیونزم کو وہ طاقت حاصل ہو گئی ہے کہ جس خطرہ کا امکان میں نے سیاسی کشمکش حصہ اول میں ظاہر کیا تھا، وہ بالکل قریب آ پہنچا ہے۔ اب اگر علمائے کرام ہمارے چونکانے سے نہ چونکیں گے اور ہمارے سمجھائے نہ مانیں گے تو کمیونزم انھیں چونکائے گا اور افسوس یہ ہے کہ اس وقت چونکنے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

سوال:- اجتماع میں شرکت کرنے اور مختلف جماعتوں کی رپورٹیں سننے سے مجھے اور میرے رفقا کو اس بات کا پوری طرح احساس ہو گیا ہے کہ ہم نے جماعت کے لٹریچر کی اشاعت و تبلیغ میں بہت معمولی درجہ کا کام کیا ہے۔ اس سفر نے گذشتہ کوتاہیوں پر ندامت اور مستقبل میں کامل عزم و استقلال اور اخلاص کے ساتھ کام کرنے پر آمادہ کر دیا ہے۔ دعا فرمائیں کہ جماعتی ذمہ داریاں پوری پابندی اور ہمت و جرأت کے ساتھ ادا ہوتی رہیں۔

اس امید افزا اور خوش کن منظر کے ساتھ اختتامی تقریر کے بعض فقرے میرے بعض ہمدرد رفقا کے لیے باعث تکدر ہی ثابت ہوئے اور دوسرے مقامات کے مخلص ارکان و ہمدردوں میں بھی بددلی پھیل گئی۔ عرض یہ ہے کہ منکرین خدا کا گروہ جب اپنی بیباکی اور دریدہ دہنی کے باوجود حلم، تحمل اور موعظۂ حسنہ کا مستحق ہے تو کیا یہ دینداروں کا متقشف تنگ نظر طبقہ اس سلوک کے لائق نہیں ہے؟ کیا ان کے اعتراضات و شبہات حکمت و موعظۂ حسنہ اور حلم و بردباری کے ذریعہ رفع نہیں کیے جا سکتے؟ اختتامی تقریر کے آخری فقرے کچھ مغلوبیت جذبات کا پتہ دے رہے تھے۔

تقریر کی صحت میں کلام نہیں، صرف انداز تعبیر اور طرز بیان سے اختلاف ہے۔ قرآن کا اصول تبلیغ "فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ" سے اخذ کیا جا سکتا ہے اور اس پر عمل پیرا ہونے سے ساری مشکلات حل ہو سکتی ہیں۔ مجھے اس سے بھی انکار نہیں کہ آپ کی عام عادت تبلیغ و تفہیم میں حکیمانہ ہے۔ اسی بنا پر اس دفعہ خلاف عادت لب و لہجہ کو سخت دیکھ کر تعجب ہوا۔

دوسری گزارش یہ ہے کہ حکمت و مصلحت شرعی کا تقاضا ہے کہ فروعی مسائل اور ظواہر سنن کی تغیر و تبدیل پر ابتداءً اصرار نہ کیا جائے اور نہ خود عملاً ایسا طرز اختیار کیا جائے جس سے مسلمانوں میں توحش و تنفر پیدا ہو۔ اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قتل منافقین اور تغییر بنائے کعبہ سے محترز رہے۔ مجھے یہ تسلیم ہے کہ اعفاء اور تقصیر لحیہ کے بارے میں سلف میں اختلاف پایا جاتا ہے اور جو طرز عمل آپ نے اختیار کیا ہے اس کی گنجائش نکلتی ہے۔ ادھر مقدار قبضہ تک اعفاء کے جواز سے آپ کو بھی انکار نہ ہوگا۔ پھر کیا یہ مناسب اور حکیمانہ فعل نہ ہوگا کہ عوام کو توحش سے بچانے کے لیے آپ بھی اسی جواز پر عمل کر لیں، کیونکہ ظاہری وضع قطع میں جو غلو کی صورت ہے، اس کی اصلاح بنیادی امور اور مہمات مسائل کے ذہن نشین کرانے کے بعد بھی ہو سکتی ہے۔ جماعت اسلامی سے مخلصانہ وابستگی اور دلی تعلق کی بنا پر چند سطور لکھ رہا ہوں۔ امید ہے کہ غور فرمائیں گے۔

جواب:- مجھے یہ معلوم کر کے تعجب ہوا کہ آپ اہل مذہب کے ساتھ بھی چاہتے ہیں کہ وہی سلوک کیا جائے جو منکرین کے ساتھ ہونا چاہیے۔ نیز یہ کہ آپ نے فقط نرمی ہی کو تقاضائے حکمت سمجھ رکھا ہے، حالانکہ قرآن و سنت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حق کے

مان لینے والوں سے جب خلافِ حق باتوں کا صدور ہو تو ان کے ساتھ ان لوگوں کی بہ نسبت مختلف برتاؤ کیا جاتا ہے جو سرے سے حق کو نہ ماننے والوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ نیز یہ کہ اللہ اور رسول نے جہاں بعض مواقع پر انتہائی نرمی برتی ہے اور وہ عین مقتضائے حکمت ہے، بعض دوسرے مواقع پر سخت لب و لہجہ بھی اختیار کیا ہے اور تیز و تند الفاظ سے بھی کام لیا ہے اور وہ بھی مقتضائے حکمت ہی رہا ہے۔ میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ جو باتیں میں نے آخری تقریر میں کہی ہیں، کیا ان میں کوئی لفظ خلافِ حق تھا؟ نیز یہ کہ اس تقریر میں جو باتیں کہی گئی ہیں، کیا فی الواقع اس مرحلہ پر ان کا کہنا ضروری نہیں تھا؟ اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک بات بھی ہو تو آپ اسے ضرور تحریر فرمائیں، لیکن اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ باتیں جو کہی گئی ہیں وہ حق تھیں اور لوگوں کو اصل مقتضیاتِ دین کی طرف توجہ دلانے کے لیے اس وقت انھیں صاف صاف بیان کرنے کی ضرورت بھی تھی تو پھر لب و لہجہ کی شکایت فضول ہے۔ میں آپ کو اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ میں جذبات سے مغلوب ہونے والا آدمی نہیں ہوں۔ نرمی اور سختی جو کچھ بھی اختیار کرتا ہوں، جذبات کی بنا پر نہیں، بلکہ ٹھنڈے دل سے یہ رائے قائم کرنے کے بعد اختیار کرتا ہوں کہ اس موقع پر واقعی ایسا کرنا چاہیے۔

آپ کے سامنے صرف اپنا قریبی ماحول ہے، مگر مجھ پر جس ذمہ داری کا بار ہے، اس کی وجہ سے میں پوری جماعت اور تحریک کے حالات پر نگاہ رکھتا ہوں۔ مجھے یہ اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ اگر اس موقع پر میں مقتضیاتِ دین کو صاف اور واضح طریقہ پر بیان نہ کر دوں اور ان لوگوں کی غلطی کو بالکل کھول کر نہ رکھ دوں جو فروع کو اب تک اصلِ دین بنائے بیٹھے ہیں اور دین کے اصلی تقاضوں سے غفلت برتتے رہے ہیں تو اس کا نتیجہ ہماری تحریک کے حق میں نہایت مہلک ہو گا، کیونکہ اس قسم کا ایک اچھا خاصہ گروہ ہماری تحریک سے محض سطحی طور پر متاثر ہو کر ہماری طرف کھنچنے لگا ہے۔ لیکن اپنے سابق تعصبات اور اپنی سابق غلطیوں میں سے کسی چیز میں بھی ذرہ برابر ترمیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے بلکہ الٹا ہم سے طالب ہے کہ ہم بھی ان غلطیوں میں مبتلا ہو کر وہی خرابیاں برپا کریں جو یہ لوگ اصلاح کے نام سے کرتے رہے ہیں۔ لہٰذا اگر اس مرحلہ پر میں صاف صاف ان کو متنبہ نہ کر دیتا تو مجھے اندیشہ تھا کہ یہ لوگ جماعت کے اندر آ کر یا جماعت کے دروازہ پر کھڑے ہو کر ایسی پیچیدگیاں پیدا کر دیتے جن سے کام بننے کے بجائے الٹا خراب ہوتا۔ دراصل جو باتیں میری اس تقریر کو سننے کے بعد اس گروہ کے لوگوں نے کی ہیں، ان سے تو مجھے یہ یقین حاصل ہو گیا ہے کہ یہ لوگ فی الواقع دین کے کسی کام کے نہیں اور یہ کہ ان کا ہمارے قریب آنا ان کے دور رہنے بلکہ مخالفت کرنے سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ آپ خود ہی اندازہ کیجیے کہ جو لوگ قرآن و سنت کے لحاظ سے میری تقریر کے اندر کوئی لفظ بھی قابلِ گرفت نہیں بتا سکتے، بلکہ اس کے برعکس جو یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ جس چیز کو میں نے دین کا اصل مدعا بتایا ہے، واقعی قرآن و سنت کی رو سے دین کا اصل مدعا وہی ہے اور جن چیزوں کو میں مقدم و موخر کر رہا ہوں وہ واقعی مقدم و موخر ہیں، مگر اس کے باوجود جنھیں میری اس تقریر پر اعتراض کرنے اور بددلی اور رنجش کا اظہار کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا، وہ آخر کس قدر عزت کے مستحق ہیں کہ ان کے جذبات و خیالات کا لحاظ کیا جائے۔ ایسے لوگ دراصل بندۂ حق نہیں، بلکہ بندۂ نفس ہیں۔ ان کے اندر خدا کا اتنا خوف نہیں ہے کہ اپنی غلطیوں پر متنبہ ہونے کے بعد اپنی اصلاح کریں اور حق کے واضح طور پر سامنے آ جانے کے بعد اسے قبول کریں۔ اس کے بجائے وہ شکایت یہ کرتے ہیں کہ حق بات انھیں صاف صاف کیوں کہہ دی گئی اور کہنے والا انھی تعصبات میں کیوں مبتلا نہیں ہے جن میں وہ خود مبتلا ہیں۔ اس قسم کے لوگ اگر منکرین میں سے ہوتے تو ہم ان کی رعایت کچھ نہ کچھ کر سکتے تھے، مگر یہ لوگ اپنی اس نفس پرستی کے باوجود حق پرستوں کی صفِ اول میں کھڑے ہیں اور دینداری

ڈھونگ رچاتے ہیں، اس لیے نہ یہ کسی رعایت کے مستحق ہیں اور نہ ایسے لوگوں کے دور ہو جانے پر کوئی ایسا شخص افسوس کر سکتا ہے جو حق کے لیے کام کرنا چاہتا ہے۔ یہ لوگ جو کچھ اب تک مذہب کے نام پر کرتے رہے ہیں، اس سے دین کی کوئی بات بن نہیں آئی ہے، بلکہ کچھ بگڑتا رہا ہے۔ اب میں نے چاہا کہ ان کو صاف صاف بتاؤں کہ اگر واقعی دین کی بات بنانا چاہتے ہو تو اس کا طریقہ کیا ہے، اور تمھارے فہمِ دین میں کیا قصور ہے جس کی وجہ سے تم اب تک کچھ نہیں کر سکے۔ اگر یہ لوگ واقعی دین کے ساتھ کوئی قلبی تعلق رکھنے والے ہوتے تو میری باتیں سن کر ان کی آنکھیں کھل جاتیں اور ان کے اندر توبہ و انابت کا جذبہ پیدا ہوتا، لیکن اس کے بجائے یہ لوگ الٹا مجھ سے بگڑ گئے اور اب بھی ان کے نزدیک مرجح یہی ہے کہ انھی تعصبات اور جزئیات پرستیوں میں مبتلا رہیں جن میں اب تک مبتلا رہے ہیں۔ ان کی اس کیفیت کو دیکھ لینے کے بعد میں بہت خوش ہوں اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ یہ فتنہ پسند گروہ قریب آنے کے بجائے دور جا رہا ہے۔

اگر خدانخواستہ میں اس اجتماع کے موقع پر ان باتوں کو صاف صاف بیان کرنے میں کوئی کسر اٹھا رکھتا تو البتہ یہ میری ایسی کوتاہی ہوتی جس پر میں بعد میں افسوس کرتا۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خود ان لوگوں کو یہ توفیق ہی نہیں دینا چاہتا کہ یہ لوگ اس کے دین کی کوئی خدمت کریں۔ جن فتنوں کی یہ خدمت کرتے رہے ہیں، اللہ نے بھی غالباً یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ ان کو انھی فتنوں کی توفیق عطا فرماتا رہے۔

ڈاڑھی کے متعلق جو آپ نے تحریر فرمایا ہے اس کے متعلق یہ گزارش ہے کہ میں اپنے عمل سے اس ذہنیت کو غذا دینا پسند نہیں کرتا جس نے بدعت کو عین سنت بنا دینے تک نوبت پہنچا دی ہے۔ میرے نزدیک کسی غیر منصوص چیز کو منصوص کی طرح قرار دینا اور کسی غیر مسنون چیز کو (جو اصطلاحِ شرعی کے لحاظ سے سنت نہ ہو) سنت قرار دینا بدعت ہے اور ان خطرناک بدعتوں میں سے ہے جو معلوم و معروف بدعتوں کی بہ نسبت زیادہ تحریفِ دین کی موجب ہوتی ہیں۔ اسی قبیل سے یہ ڈاڑھی کا معاملہ ہے۔ لوگوں نے غیر منصوص مقدار کو ایسی حیثیت دے دی ہے اور اس پر ایسا اصرار کرتے ہیں جیسا کسی منصوص چیز پر ہونا چاہیے، پھر اس سے زیادہ خطرناک غلطی یہ کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت کو بعینہٖ وہ سنت قرار دیتے ہیں جس کے قائم و جاری کرنے کے لیے آپ مبعوث ہوئے تھے، درانحالیکہ جو امور آپ نے عادۃً کیے ہیں انھیں سنت بنا دینا اور تمام دنیا کے انسانوں سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ سب ان عادات کو اختیار کریں، اللہ اور اس کے رسول کا ہرگز یہ منشا نہ تھا۔ یہ تحریف جو دین میں کی جا رہی ہے، اگر میں اس کے آگے سپر ڈال دوں اور جس وضع اور قطع میں لوگ مجھے دیکھنا چاہتے ہیں، اس میں اپنے آپ کو ڈھال لوں تو میرے نزدیک میں ایک ایسے جرم کا مرتکب ہوں گا جس کے لیے اللہ کے یہاں مجھ سے سخت بازپرس ہوگی اور اس بازپرس میں کوئی میری مدد کے لیے نہ آ سکے گا۔ لہٰذا میں اپنے آپ کو لوگوں کے مذاق کے خلاف بنائے رکھنا بدرجہا بہتر سمجھتا ہوں، بجائے اس کے کہ اپنے آپ کو اس اخروی خطرے میں ڈالوں۔

سوال:- حالیہ اجتماعِ دارالاسلام کے بعد میں نے زبانی بھی عرض کیا تھا اور اب بھی اقامتِ دین کے فریضہ کو فوق الفرائض بلکہ اصل الفرائض اور اسی راہ میں جدوجہد کرنے کو تقویٰ کی روح سمجھنے کے بعد عرض ہے کہ "مظاہرِ تقویٰ" کی اہمیت کی نفی میں جو شدت آپ نے اپنی افتتاحی تقریر میں برتی تھی وہ ناتربیت یافتہ ارکینِ جماعت میں "عدمِ اعتنا بالسنۃ" کے جذبات پیدا کرنے کا موجب ہوگی، اور میں دیانۃً عرض کرتا ہوں کہ اس کے مظاہر میں نے بعد از اجلاس ملاحظہ کیے۔ اس شدت کا نتیجہ بیرونی حلقوں میں اور فی الواقع یہ ہوگا کہ تحریک کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا جائے گا، کیونکہ اس سے پہلے بھی بعض داعیین تحریکِ "استخفاف بالسنۃ" کی ابتدا اسی طرح کی تھی کہ بعض مظاہر

تقویٰ کو اہمیت دینے اور ان کا مطالبہ کرنے میں شدت اختیار کرنے کی مخالفت جوش و خروش سے کی۔ دوسرے یہ کہ شرارت پسند عناصر کو ہم خود گویا ایک ایسا ہوائی پستول فراہم کر دیں گے جو چاہے درحقیقت گولی چلانے کا کام ہرگز نہ کر سکے مگر اس کے فائر کی خالی آواز سے حق کی طرف بڑھنے والوں کو بدکایا جا سکے گا۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کے معاملات میں عوام کے جہلا سے فتنہ ہو سکنے کا لحاظ رکھا ہے۔ چنانچہ بیت اللہ کی عمارت کی اصلاح کا پروگرام حضورؐ نے محض قوم کی جہالت اور جدید العہد بالاسلام ہونے کے باعث ملتوی کر دیا تھا اور پھر اتنی احتیاط برتی کہ کبھی کسی وعظ اور خطبہ میں لوگوں کو اس کی طرف توجہ تک نہیں دلائی، بجز اس کے کہ درونِ خانہ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے آپ نے اس کا تذکرہ ایک دفعہ کیا۔

علاوہ بریں مظاہر تقویٰ کے معاملہ میں بھی دوسرے مسائل کی طرح خود داعی و مصلح اول صلوٰۃ اللہ علیہ کے ذاتی اسوہ کا اتباع ہی راہ ہدایت ہے۔ اس امر کو تسلیم کرنے کے بعد یہ روایت مدنظر رکھیے کہ "کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کث اللحیۃ بملاصدرہ" اس اسوۂ رسول کا اتباع کرتے ہوئے اگر آپ افراط و تفریط کی اصلاح کریں تو پھر ادھر تو معترضین کو عیب چینی کے مواقع کم ملیں گے اور ادھر مغربیت زدہ لوگوں کے لیے طغیان نفس وا بائے اطاعت کے لیے کمتر مواقع حاصل ہوں گے۔ اسی بنا پر میں نے بوقت ملاقات عرض کیا تھا کہ آپ کا ذاتی تعامل باعفاء اللحیہ و دیگر پہلوؤں سے تکمیل ظواہر سنن بالیقین دین کے لیے مفید ہوگا۔ اس کا خیال رہے کہ ادھر مذہبی مخالفین کا گروہ ہے جس کی اصلاح اس انداز سے کرنی ہے کہ مختلف امور دین کو ان کے اصل مقام پر رکھ کر انھیں ان کی صحیح حیثیت اور ان کی صحیح اہمیت سے آگاہ کرنا ہے، لیکن دوسری طرف جدید تعلیم یافتہ طبقہ ہے جس کے نزدیک مظاہر تقویٰ کے معاملہ میں سنتِ انبیا، خصوصاً داڑھی کی سنت کا اتباع کرنا نہ صرف غیر ضروری، بلکہ ذریعۂ نفرت و تمسخر ہے۔ اس گروہ کی اصلاح بھی تو آخر ہمارے ہی ذمہ ہے، تو پھر کیا یہ فرض پورا کرنے کے لیے وہی اتباعی شدت زیادہ کارآمد نہیں ہے جو مظاہر تقویٰ کے تحفظ میں قدیم دیندار طبقہ کی تنقید کی روح تھی؟

مزید یہ کہ ہم اسلام کی اساسی حقیقتوں ہی کو جب پوری وسعت سے نہیں پھیلا چکے ہیں اور ابھی بے شمار بندگانِ خدا کے سینوں میں اترنے کی مہم سر کرنی باقی ہے تو کیا بہتر یہ نہ ہوگا کہ ہم فروعی امور کے کانٹوں سے دامن بچا کر بڑھتے جائیں اور اصل مقصد کی طرف بڑھتے ہوئے اپنا ایک لحظہ بھی ضائع نہ ہونے دیں۔ ورنہ مجھے خطرہ ہے کہ ہم لوگ جن کا دن رات واسطہ متلاشیانِ اعوجاج و متبغیانِ فتنہ و تاویل سے ہے، صرف انھیں زائد از ضرورت مسائل میں الجھ کر رہ جائیں گے اور اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔ پس بہتر یہی ہے کہ "مظاہر تقویٰ" وغیرہ قسم کے مباحث پر تحریروں اور تقریروں میں درشت اور شدید طریقے سے بحث نہ کی جائے۔

جواب: آپ نے جو امور تحریر فرمائے ہیں ان میں سے بیشتر کے جواب میں نے زبانی عرض کر دیے تھے اور اب بھی اپنے ان زبانی جوابات پر کسی اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ تاہم ایک دو امور اس سلسلہ میں ایسے ہیں جن پر مختصراً کچھ اشارہ کرنا کافی سمجھتا ہوں۔ آپ نے بار بار اس بات کا اظہار کیا ہے کہ مظاہر تقویٰ کے متعلق میں نے کوئی شدت برتی ہے جو سنت کے استہزا کی تمہید بن سکتی ہے اور بعض لوگوں کے لیے سنت سے بے اعتنائی کی موجب ہوئی ہے۔ کیا آپ براہ کرم بتا سکتے ہیں کہ وہ کون سے الفاظ تھے جن کو آپ

شدت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اگر الفاظ آپ کو یاد نہ ہوں تو آپ تھوڑا صبر فرمائیں، میں اپنی اس تقریر کو قلمبند کرا کے ان شاء اللہ عنقریب شائع کردوں گا اس وقت آپ اسے پڑھ لیجیے گا اور میرے وہ الفاظ نشان لگا کر میرے پاس بھیج دیجیے گا جن میں شدت پائی جائے[1]۔ اسی طرح جن ارکین سے آپ کا تبادلۂ خیال ہوا اور آپ نے یہ محسوس کیا کہ میری اس تقریر کی بدولت ان میں سنت سے عدم اعتنا پیدا ہوا ہے، اگر آپ کو ان کے نام یاد ہوں یا کم سے کم یہی یاد ہو کہ وہ کس جگہ کی جماعت سے تعلق رکھتے تھے تو مجھے لکھ دیجیے تاکہ میں پوری طرح تشخیص کر سکوں کہ آیا ان کے متعلق آپ کا اندازہ غلط تھا یا میرے متعلق ان کا اندازہ۔

کیا آپ نے کبھی اس بات پر بھی غور کیا ہے کہ اس جماعت میں داخل ہونے کے بعد جن لوگوں کے چہرے پر داڑھی آئی ہے، اتباع سنت کی تبلیغ کا دعویٰ رکھنے والے حضرات میں سے کسی کی تبلیغ سے ان کے چہرے کبھی داڑھی سے مزین نہیں ہو سکتے تھے حالانکہ جماعت میں آنے کے بعد ہم نے کبھی ان سے داڑھی یا دوسرے مظاہر تقویٰ کے متعلق اشارۃً بھی نہیں کہا کہ وہ فلاں چیز پر عمل کریں۔ باوجود اس کے ان لوگوں نے جو کبھی خواب میں بھی یہ دیکھنے کے لیے تیار نہ تھے کہ ان کے چہرے پر داڑھی ہو، خود بخود داڑھیاں رکھ لیں اور اپنے فیشن تبدیل کرنے شروع کر دیے۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ہم نے اسی اصل چیز کی تعلیم و تلقین پر سارا زور صرف کیا جو پوری دیندارانہ زندگی کی جڑ ہے، یعنی خدا اور رسول کی وفاداری و اطاعت۔ اس کے بعد ہمیں کسی چیز کی الگ الگ تلقین کی ضرورت نہ رہی۔ جس جس بات کے متعلق ان کو معلوم ہوتا گیا کہ خدا و رسول کا حکم یہ ہے یا خدا اور رسول کو یہ پسند ہے، اسے اختیار کرنے پر وہ اپنے نفس کو مجبور کرتے چلے گئے اور جس جس کے متعلق یہ معلوم ہوتا گیا کہ یہ خدا اور رسول کو ناپسند ہے، اسے وہ خود بخود چھوڑتے چلے گئے۔ اس سلسلے میں ان کے اندر وہی تبدیلیاں نہیں ہوئیں جو آپ لوگوں کے نزدیک اتباع سنت رہی ہیں، بلکہ وہ تبدیلیاں بھی ہوئیں جن کے تصور سے بہت سے دورِ آخر کے پیشوایان دین تک خالی رہے ہیں۔ یہ سب کچھ دیکھ لینے کے بعد جب آپ مجھ سے کہتے ہیں کہ تیری باتوں سے لوگوں میں سنت سے عدم اعتنا اور استہزا کی کیفیت پیدا ہو گی یا ہوئی تو مجھے حیرت بھی ہوتی ہے اور افسوس بھی ہوتا ہے۔ میں نے تو مجبور ہو کر بلکہ تنگ آ کر صاف صاف بات اس وقت کہی ہے جب کہ ایک گروہ نے اپنے طرز عمل سے مجھ پر یہ ثابت کر دیا کہ ایک طرف وہ ہماری دعوت پر لبیک کہتا ہوا آگے بھی بڑھتا ہے اور دوسری طرف جزئیات کو اصول و کلیات پر مقدم رکھنے اور تقریر، تحریر اور بحث و جدال کا سارا زور انھیں پر صرف کرنے کی پرانی بیماری بھی اس کو لگی ہوئی ہے۔ اس سے مجھے خطرہ ہوا کہ اس بیماری کو لیے ہوئے اگر یہ گروہ جماعت میں آ گیا تو یہاں پھر وہی سب کچھ ہونے لگے گا جو باہر مذہبی میدان میں ہوتا رہا ہے۔ اس لیے مجھے مجبوراً یہ بتا دینا پڑا کہ ایسے لوگ ہمارے کسی کام کے نہیں ہیں اور ہماری دعوت کا مزاج ان کی افتاد مزاج سے بالکل مختلف ہے۔ وہ اگر اپنے دماغ کی اصلاح کر کے اور اپنے فہم دین کو درست کر کے آنا چاہیں تو چشم ما روشن، دل ما شاد! لیکن اگر وہ جماعت میں آ کر یا جماعت میں رہ کر وہی سب کچھ کرنا چاہتے ہیں جو اس سے پہلے کرتے رہے ہیں اور جس کی بدولت دین کا کچھ کام بنانے کے بجائے کچھ بگاڑتے ہی رہے ہیں تو بہتر ہے کہ وہ ہماری اس جماعت کو خراب کرنے کے بجائے اپنے پرانے مشاغل باہر ہی رہ کر جاری رکھیں۔

اس وجہ سے جو کچھ میں نے کیا اور جو کچھ میں نے کہا، خوب سوچ سمجھ کر ہی کیا اور کہا۔ خدا کے فضل سے میں کوئی کام یا کوئی بات جذبات سے مغلوب ہو کر نہیں کیا اور کہا کرتا۔ ایک ایک لفظ جو میں نے اپنی تقریر میں کہا ہے، تول تول کر کہا ہے اور یہ سمجھتے ہوئے کہا ہے

---

[1] وہ تقریر اسی اشاعت میں بسلسلۂ روداد اجتماع درج ہے۔

کہ اس کا حساب مجھے خدا کو دینا ہے، نہ کہ بندوں کو۔ چنانچہ میں اپنی جگہ بالکل مطمئن ہوں کہ میں نے کوئی ایک لفظ بھی خلافِ حق نہیں کہا اور جو کچھ کہا اسی کا کہنا خدمتِ دین کے اس مرحلے پر ناگزیر تھا۔ اس کے کہنے پر نہیں، بلکہ نہ کہنے پر مجھے اندیشہ تھا کہ میں ماخوذ ہوں گا۔ اب بھی جو باتیں آپ نے تحریر فرمائی ہیں ان میں بھی کوئی ایک چیز ایسی نہیں ہے جس سے مجھے اپنی اس رائے میں ترمیم کرنے کی ضرورت پیش آئے۔

میں نے آپ سے زبانی بھی عرض کیا تھا اور اب تحریراً بھی عرض کرتا ہوں کہ میں دین کو جو کچھ سمجھتا ہوں اور شریعت کے متعلق جو کچھ مجھے علم ہے، اس کی بنا پر میرا یہ فرض ہے کہ نہ صرف اپنے قول سے، بلکہ اپنے عمل سے بھی ان غلطیوں کی اصلاح کروں جو شریعت کے بارے میں لوگوں کے اندر پھیلی ہوئی ہیں۔ محض لوگوں کے مذاق کی رعایت کرتے ہوئے اپنے آپ کو اس رنگ میں پیش کرنا جس میں وہ مجھے رنگا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں اور ان کو اس غلط فہمی میں ڈالنا کہ شریعت کے اصل تقاضے وہی ہیں جو انھوں نے سمجھ رکھے ہیں، میرے نزدیک گناہ ہے۔ میں اسوہ اور سنت اور بدعت وغیرہ اصطلاحات کے ان مفہومات کو غلط، بلکہ دین میں تحریف کا موجب سمجھتا ہوں جو بالعموم آپ حضرات کے ہاں رائج ہیں۔ آپ کا یہ خیال کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جتنی بڑی داڑھی رکھتے تھے، اتنی ہی بڑی داڑھی رکھنا سنتِ رسول یا اسوۂ رسول ہے، یہ معنی رکھتا ہے کہ آپ عاداتِ رسول کو بعینہٖ وہ سنت سمجھتے ہیں جس کے جاری اور قائم کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیا علیہم السلام مبعوث کیے جاتے رہے ہیں۔ مگر میرے نزدیک صرف یہی نہیں کہ یہ سنت کی صحیح تعریف نہیں ہے، بلکہ میں یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ اس قسم کی چیزوں کو سنت قرار دینا اور پھر ان کے اتباع پر اصرار کرنا ایک سخت قسم کی بدعت اور ایک خطرناک تحریفِ دین ہے جس سے نہایت برے نتائج پہلے بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ظاہر ہونے کا خطرہ ہے۔

آپ کو اختیار ہے کہ میری اس رائے سے اتفاق نہ کریں، لیکن جب تک میں اپنے مطالعۂ کتاب و سنت کی بنا پر یہ رائے رکھتا ہوں، اس وقت تک آپ لوگوں کا یہ مطالبہ کرنا کہ میں اپنے عقیدہ و علم کے خلاف آپ لوگوں کی مزعومہ سنتوں کو اختیار کروں کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ اور ایسا نہ کرنے کی صورت میں آپ لوگ جب مجھے یہ اندیشہ دلاتے ہیں کہ لوگ مجھ سے بدگمان ہوں گے اور یہ چیز ان کے دعوت کی طرف آنے میں مانع ہو گی تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ لوگ میری دعوت الی اللہ کے جواب میں مجھ کو الٹی دعوت الی الناس دینا چاہتے ہیں۔ جن لوگوں کے اندر حق اور غیرِ حق کی اتنی تمیز بھی باقی نہ رہی ہو کہ وہ یہ بھی نہ سمجھ سکیں کہ میں جس چیز کی طرف انھیں بلا رہا ہوں، وہ دین میں کیا مقام رکھتی ہے اور وہ جن باتوں کی وجہ سے میری دعوت کو قبول کرنے میں تامل یا انکار کر رہے ہیں ان کا دین میں کیا درجہ ہے، ایسے ناحق شناس اور خدا پرستی کے بھیس میں اپنے تخیلات کو پوجنے والے لوگ آخر کس وزن اور قدر کے مستحق ہیں کہ ان کے جذبات اور ان کے خیالات کی کوئی رعایت کی جائے۔

سوال: اسی سلسلہ میں ایک اور اہم چیز کی طرف توجہ دلانے پر مجبور ہوں۔ اگرچہ وہ "بڑی بات" ہی ہے اور یہ جرأت کرتے وقت "خود را بشناس" کا آوازہ سن رہا ہوں، لیکن نصب العین کی محبت کا غلبہ کہنے پر مجبور کرتا ہے۔ میں توقع رکھتا ہوں کہ اگر اس جسارت پر ملال ہو تو معاف کیا جاؤں وذالک ھو المرجو من کرمکم ۔۔۔ اور وہ یہ ہے کہ اسوۂ داعی الی اللہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیمات اپنے رفقا سے یوں تھا کہ "کان ھو کاحد ھم" یا "عزیز علیہ ما عنتم" نیز "حریص علیکم" اور "بالمومنین رؤف الرحیم"۔ اس حیثیت میں موجودہ بے عنوانی کی

تمنا کی جا رہی ہے۔ اللھم ارزقنا حبك وحب من یحبك

جواب:۔ آپ نے جو امور خط کے اس دوسرے حصہ میں تحریر فرمائے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ آپ ان کی ذرا کچھ تفصیل ارشاد فرمائیں۔ میں نے اپنی حد تک اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ جماعت کے لوگوں میں میں اس طرح رہوں اور ایسا رویہ رکھوں جس میں امتیاز کی بو تک نہ ہو اور میرے اور ان کے درمیان وہی مساوات پائی جائے جو اسلام کا تقاضا ہے، لیکن مجھے یہ معلوم ہے کہ ایک گروہ میں ایسی مساوات کی خواہش رہی ہے جو نہ دین کا تقاضا ہے اور نہ عملاً وہ ممکن ہے۔ اور ویسی مساوات نہ ہونے پر ان کے اندر بددلی و بے اطمینانی پیدا ہوتی رہی ہے۔ مجھے شبہ ہوتا ہے کہ اس بددلی اور بے اطمینانی کی بنا پر جو پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے اور جس کا مرکز...... بھی رہا ہے، شاید اس کے اثرات آپ تک بھی پہنچے ہیں۔ اگر ایسی کوئی چیز مد نظر ہو تو اس کے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن اگر آپ نے کوئی ایسی چیز پائی ہے جو تقاضائے دین و شریعت تھی اور اس کے لحاظ سے میرے طرز عمل میں کوئی کوتاہی آپ کو نظر آئی ہے تو اس سے مجھے ضرور مطلع فرمائیے تاکہ میں اس کی اصلاح کر سکوں۔ جہاں تک دین و شریعت کے مطالبات ہیں ان کو پورا کرنا میرا فرض ہے اور ان کے لحاظ سے کسی قصور و کوتاہی میں مبتلا ہونا میں گناہ سمجھتا ہوں، لیکن میرے لیے یہ بات سخت تکلیف کی موجب ہے کہ بہت سے لوگ مجھ سے اپنی خواہشات کا اتباع کرانا چاہتے ہیں اور اسے رسول اللہ کے نام سے کرتے ہیں۔

داڑھی کی مقدار کا مسئلہ

سوال:۔ داڑھی کی مقدار کے عدم تعین پر "ترجمان" میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس سے مجھے تشویش ہے، کیونکہ بہت بڑے علماء کا متفقہ فتویٰ اس پر موجود ہے کہ داڑھی ایک مشت بھر لمبی ہونی چاہیے اور اس سے کم داڑھی رکھنے والا فاسق ہے۔ آپ آخر کن دلائل کی بنا پر اس "اجماعی فتویٰ" کو رد کرتے ہیں؟

جواب:۔ یہ تو انھیں علماء سے پوچھنا چاہیے کہ ان کے پاس مقدار کے تعین کے لیے کیا دلیل ہے؟ اور خصوصاً "فسق" کی وہ آخر کیا تعریف کرتے ہیں جس کی بنا پر ان کی تعین کردہ مقدار سے کم داڑھی رکھنے والے پر فاسق کا اطلاق ہو سکتا ہے؟ مجھے سخت افسوس ہے کہ بڑے بڑے "علماء" خود حدود شرعیہ کو نہیں سمجھتے اور ایسے فتوے دیتے ہیں جو صریحاً حدود شرعیہ سے متجاوز ہیں۔

داڑھی کے متعلق شارع نے کوئی حد مقرر نہیں کی ہے۔ علماء نے جو حد مقرر کرنے کی کوشش کی ہے، وہ بہرحال ایک استنباطی چیز ہے اور کوئی استنباط کیا ہوا حکم وہ حیثیت حاصل نہیں کر سکتا جو نص کی ہوتی ہے۔ کسی شخص کو اگر فاسق کہا جا سکتا ہے تو صرف حکم منصوص کی خلاف ورزی پر کہا جا سکتا ہے۔ حکم مستنبط کی خلاف ورزی (چاہے استنباط کیسے ہی بڑے علماء کا ہو) فسق کی تعریف میں نہیں آتی، ورنہ اسے فسق قرار دینے کے دوسرے معنی یہ ہوں گے کہ استنباط کرنے والوں کی بھی شریعت میں وہی حیثیت ہے جو خود شارع کی ہے۔

سوال:۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ کسی صحابی کی داڑھی ایک مشت سے کم تھی؟

جواب:۔ اسماء الرجال اور سیر کی کتابوں میں تلاش کرنے سے مجھے بجز دو تین صحابیوں کے کسی کی داڑھی کی مقدار نہیں معلوم ہو سکی ہے۔ صحابہ کے حالات پر صفحے کے صفحے لکھے گئے ہیں مگر ان کے متعلق یہ نہیں لکھا گیا کہ ان کی داڑھی کتنی تھی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سلف میں یہ مقدار کا مسئلہ کتنا غیر اہم اور ناقابل توجہ تھا۔ حالانکہ متاخرین میں جس شدت سے اس پر زور دیا جاتا ہے اتنے

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید مومن کی سیرت و کردار میں پہلی چیز جس کی جستجو ہونی چاہیے وہ یہی ہے کہ اس کی داڑھی کا طول کتنا ہے۔

سوال:۔ داڑھی کی مقدار کے عدم تعین کا جو مسئلہ ہماری جماعت میں پھیل نکلا ہے، اس کے ماتحت بعض رفقاء نے اپنی داڑھیاں پہلے سے چھوٹی کرائی ہیں اور اب ان خشخشی داڑھیوں کے متعلق یہ خطرہ ہے کہ کہیں "احمدی داڑھی" کی طرح ان کا بھی کوئی فرقی نام نہ پڑ جائے اور عوام کے لیے یہ چیز فتنہ ثابت ہو۔ چونکہ علماء کا متواتر تعامل مشت بھر داڑھی رکھنے کا ہے، اس وجہ سے میرا خیال یہ ہے کہ ہمیں بھی اسی کا التزام کرنا چاہیے۔

جواب:۔ آپ کا قلب جس چیز کے اوپر گواہی دے، آپ کو خود اس پر عمل کرنا چاہیے، لیکن اسی چیز کو دوسروں کے لیے ضابطہ بنانے کی خواہش نہ ہونی چاہیے۔ میرے نزدیک کسی کی داڑھی کے چھوٹا یا بڑا ہونے سے کوئی خاص فرق واقع نہیں ہوتا۔ اصل چیز جو آدمی کے ایمان کی کمی اور بیشی پر دلالت کرتی ہے وہ تو اور ہی ہے۔ البتہ مجھے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ جس طرح ایمان کی کمی کو بعض ظاہری چیزوں کی بیشی سے پورا کرنے کی اب تک کوششیں کی جاتی رہی ہیں، کہیں ہماری جماعت کے بھی کچھ لوگ اسی مرض میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ اگر کسی کی حقیقی جاں نثاری و وفاداری اللہ کی راہ میں "طویل" ہو تو کوئی بڑا نقصان نہ ہو جائے گا، اگر اس کی داڑھی "قصیر" ہو۔ لیکن اگر جاں نثاری و وفاداری "قصیر" ہے تو یقین رکھیے کہ داڑھی کا طول کچھ بھی فائدہ نہ دے گا۔ بلکہ بعید نہیں کہ خدا کے ہاں اس پر فریب کاری اور مکاری کا مقدمہ چل جائے۔

آپ اس کی فکر نہ کیجیے کہ ہماری جماعت کے ارکان کے متعلق لوگ کیا رائے قائم کریں گے اور ان کے ظاہر سے کیا اثر لیں گے۔ آپ کو اور ہمارے تمام رفقاء کو اپنے باطن کی فکر اپنے ظاہر سے بڑھ کر ہونی چاہیے اور اسی طرح اپنے ان اعمال کی زیادہ فکر کرنی چاہیے جن پر خدا کی میزان میں آدمی کے ہلکے یا بھاری ہونے کا مدار ہے، کیونکہ اگر ایسے اعمال ہلکے رہ گئے تو بال برابر وزن رکھنے والی چیزوں کی کمی و بیشی سے میزان الٰہی میں کوئی خاص فرق واقع ہونے کی توقع نہیں ہے۔

مسلک تشیع اور ترجمان القرآن

سوال:۔ ترجمان القرآن یوں تو اعلیٰ درجہ کا دینی پرچہ ہے، مگر شیعوں کے اعتراضات اور غلط خیالات کی تردید اس میں نہیں ہوتی۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب:۔ ترجمان القرآن کوئی فرقہ وارانہ پرچہ نہیں ہے کہ وہ مناظروں کا میدان بنا رہے۔ اس کا مقصد اشاعت تحریک اسلامی کو اس کی اصلی شکل میں زندہ کرنا ہے اور وہ ایک اثباتی دعوت کا علمبردار ہے۔ اس اثباتی دعوت کے خلاف نیک نیتی سے جو شکوک و شبہات اور اعتراضات پیش کیے جاتے ہیں، چاہے وہ شیعوں کی طرف سے ہوں یا سنیوں کی طرف سے، اہل حدیث انھیں پیش کریں یا حنفی، اسی طرح مسلمان اس کی دعوت کو سمجھنے کے لیے کوئی استفسار کریں یا ہندو اور سکھ، سبھی کا جواب دیا جاتا ہے۔ مگر فرقہ وارانہ عصبیت رکھنے والے پرچوں کی طرح یہ صورت یہاں نہیں ہے کہ اصل دین چاہے کتنا ہی ساقط الاعتبار ہوتا چلا جائے، اس کے معاملے سے قطع نظر کر کے فقہی اور کلامی جزئیات پر محض نظری بحثا بحثی کا سلسلہ جاری رہے۔

ہماری اثباتی دعوت خود ہی مختلف فرقِ باطلہ کے غلط نظریات پر شدید ضرب لگاتی ہے۔ ابطال باطل کے اس ایجابی طریقہ کو چھوڑ کر اگر سلبی انداز اختیار کیا جائے تو آخر کس کس گروہ کے عقیدۂ فاسد اور عمل باطل کے خلاف ہم لڑتے رہیں گے۔ اس طرح تو غالباً دس صدی

بھی حصول مقصد کے لیے ناکافی ہوں گی۔ سیدھی بات ہے کہ جب ہم تعین سے یہ کہتے ہیں کہ حق صرف یہ ہے تو اس سے از خود یہ بات اخذ ہوتی ہے کہ اس "یہ" کے خلاف جو کچھ ہے باطل ہے

سوال:- حکومت الٰہیہ میں شیعوں کی حیثیت کے متعلق ایک سوال کا جو جواب ترجمان القرآن میں شائع ہوا ہے، اس کا مقصد میں نہیں پا سکا ہوں۔ کیونکہ ایک طرف آپ نے خود ہی یہ تسلیم کیا ہے کہ دورِ رسالت سے خلافتِ راشدہ تک مسلمان ایک ہی گروہ تھے اور کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے فرقوں کا وجود ہی ثابت نہیں، لیکن دوسری طرف مذکورہ بالا جواب سے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا آپ اہل تشیع اور دوسرے گمراہ فرقوں کو دائرۂ اسلام ہی میں رکھتے ہیں۔

براہ کرم اپنے نظریہ کی وضاحت فرمائیے، اور یہ بھی لکھیے کہ اصولی اختلافات سے آپ کی کیا مراد ہے۔

جواب:- میں نے اپنے اس جواب میں یہ تو صاف صاف واضح کر دیا ہے کہ قرونِ اولیٰ میں اصولی اختلاف رکھنے والے فرقوں کا وجود نہ تھا اور نہ اسلام یعنی کتاب اللہ اور سنت نبوی نے انھیں گوارا کیا ہے۔ اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اصولی اختلاف کی بنا پر جو فرقہ بھی بنے گا، وہ امت مسلمہ کا جز شمار نہیں ہوگا۔ رہا یہ سوال کہ ایسے فرقوں کو عملاً حکومت الٰہیہ کے زیر سایہ کیا حیثیت دی جائے گی (یعنی انھیں اہل کتاب میں شمار کیا جائے گا یا ذمیوں میں) تو یہ سوال دراصل اس وقت کا ہے ہی نہیں۔ یہ سوال جب عملاً پیش آئے گا تو اس کا حل بھی ان شاء اللہ ہو ہی جائے گا۔ قبل از وقت آخر کیوں ایک فرقہ سے اس کی حیثیت کے متعلق بحث کے دروازے کھول کر وقت ضائع کیا جائے۔

اصولی اختلاف سے ہماری مراد یہ ہے کہ عقیدۂ توحید، حیثیت رسالت اور نظریۂ معاد کو جس طرح قرآن نے پیش کیا ہے، اس کے خلاف کوئی اور خیال آدائی دین کی اساس میں شامل کی جائے اور پھر اس بنیادی تغیر کے بعد ان عقائد ولیہ کے تقاضوں اور فرائض و واجباتِ دین میں کوئی کمی یا بیشی کی جائے۔ ان اساسی معتقدات اور ان کے صریح مقتضیات کو ہم نے دستور جماعت اسلامی میں پیش کر دیا ہے۔ جو گروہ قرآن کی نصوص قطعیہ سے مرتب کیے ہوئے اس دستور جماعت اسلامی کی حدود کے اندر ہیں، انھیں ہم امت مسلمہ کے اندر شمار کرتے ہیں اور جن لوگوں نے ان حدود کو پھاندا ہے، انھیں دائرۂ امت سے باہر سمجھنے پر مجبور ہیں۔ ہاں ان حدود کے اندر رہتے ہوئے استنباطی اور اجتہادی امور میں جائز حد تک اگر کوئی گروہ کسی دوسرے گروہ سے جزئی اختلافات رکھتا ہے تو ایسے اختلافات آنحضور کی ہدایات اور اسوۂ صحابہ کی روشنی میں جائز قرار دیے جائیں گے، بشرطیکہ ان اختلافات کو جداگانہ جماعت بندی اور امت سازی کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔

سوال:- ایک شیعہ دوست جو آپ کے مداح اور جماعت اسلامی کے لٹریچر سے قدرے متعارف ہیں، نماز باجماعت کے متعلق عجیب مسلک رکھتے ہیں، یعنی میں ان کے پیچھے نماز پڑھنے کے لیے تیار ہوں، مگر وہ یہ عمل اختیار کرنے سے اس اصول کی بنا پر بھاگتے ہیں کہ امام نماز کو معصوم ہونا چاہیے۔ میں نے اس سلسلہ میں ترجمان القرآن کے بعض رسائل و مسائل میں سے کچھ اجزاء انھیں نماز باجماعت کی اہمیت اور غیر معصوم امام کے پیچھے نماز پڑھنے کی گنجائش تسلیم کرانے کے لیے سنائے۔ مگر وہ کسی طرح نہیں مانتے۔ فرمائیے انھیں کس طرح سمجھاؤں۔

جواب:- امام معصوم کا عقیدہ جس نے شیعوں میں رواج پایا اور جس پر درحقیقت مسلک تشیع کی بنیاد قائم ہے اپنی اصل کے اعتبار سے نہ صرف یہ کہ بے اصل ہے، بلکہ شیطان کا ایک بہت بڑا دھوکا ہے، جس سے اس نے مسلمانوں کے ایک بڑے گروہ کو

دین اور اس کے مطالبات اور اس کے مہمات کو عملاً معطل کر دیا ہے۔ اس نے امامت کے لیے معصومیت کی ایسی شرط لگائی جس کا متحقق ہونا اور دائماً و مستقلاً متحقق ہوتے رہنے غیر ممکن تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرون ماضیہ میں بھی جبکہ شیعوں کے عقیدہ کے مطابق ائمۂ معصومین ظاہر ہوتے رہے، ہر امام کی وفات کے بعد اختلاف واقع ہوا کہ اس کی جگہ کونسا امام معصوم ہے اور اسی مسئلہ پر ہر امام کے بعد کئی کئی فرقے بنتے رہے اور بعد میں جب "آخری امام معصوم" غائب ہوئے تو کئی صدیوں سے عملاً دین کے تمام مہمات بلکہ وہ سارے کام جو دین کی اصلی روح ہیں، آجتک معطل چلے آ رہے ہیں، کیونکہ یہ سب کام امام معصوم پر منحصر ہیں اور امام معصوم غائب ہے۔ اگر اس پر شیعہ حضرات متنبہ نہیں ہوتے اور شیطانی دھوکہ میں مبتلا رہنا چاہتے ہیں تو ہمارے لیے اس کے سوا کیا چارہ ہے کہ صبر کریں اور ان کے حق میں دعائے خیر کرتے رہیں۔

سوال:۔ اگر کوئی شیعہ دستور جماعت اسلامی کے پورے مطالبات کو قولاً و عملاً تسلیم کرلے تو کیا وہ شیعہ رہتے ہوئے جماعت اسلامی کا رکن بن سکتا ہے۔؟

جواب:۔ دستور جماعت اسلامی کے پورے مطالبات کو تسلیم کر لینے اور ان پر عمل پیرا ہو جانے کے بعد کوئی شخص شیعہ رہ ہی کہاں سکتا ہے۔ وہ تو پھر ویسا ہی خالص مسلمان ہوگا جیسے اس دستور کو تسلیم کرنے والے دوسرے ارکین ہیں۔ اور یہ کچھ شیعوں کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے۔ جو شخص بھی اس عقیدے کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر قبول کرے جس کی تشریح ہمارے دستور میں کی گئی ہے اس کے اوپر سے تمام فرقی لیبل آپ سے آپ اتر جاتے ہیں اور وہ نرا مسلمان رہ جاتا ہے۔

ہندو دوست کا خط اور جواب

ہماری تحریک سے دلچسپی لینے والے ایک ہندو کرمفرما کے ایک دو گرامی نامے مع جواب ترجمان القرآن کی گذشتہ اشاعتوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل وہ بعض اہم مسائل پر امیر جماعت سے گفتگو کرنے کے لیے مرکز میں تشریف لائے تھے۔ یہاں سے واپس ہونے کے بعد موصوف نے جماعتی لٹریچر کا مزید مطالعہ کیا ہے اور اسی مطالعہ کے تاثرات کے ماتحت ایک مفصل اور دلچسپ خط مرکز کو بھیجا ہے۔ جسے ذیل میں مع جواب درج کیا جا رہا ہے:۔

دیر کے بعد خط لکھ رہا ہوں۔ اس طویل غیر حاضری کی وجہ صرف یہ خیال تھا کہ آپ کی جملہ تصنیفات کو مطالعہ کرنے کے بعد اپنے خیالات کو آپ کی خدمت میں وضاحت سے پیش کر سکوں گا۔ سو اب آپ کی کلیات کا ایک مرتبہ سرسری مطالعہ کر چکا ہوں۔ فی الحقیقت اپنے مشن کے لیے جہاں تک اخلاص کا تعلق ہے، میں نے آپ کو شری ...... کے بعد دوسرا پہلا اور آخری رہنما پایا ہے۔ "آخری" کا لفظ میں جان بوجھ کر استعمال کیا ہے۔ شری .... جی جنہیں میں موجودہ دور میں ہندوؤں کی عظیم ترین شخصیت سمجھتا ہوں، کی ذات بابرکات کے لیے اپنے دل میں انتہائی عقیدت رکھنے کے باوجود میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ ان کے مشن کی تکمیل ہندو قوم پر جا کر ختم ہوتی ہے۔ ہندو قومیت میں کونسے عناصر شامل ہیں یا ہندو پن کیا ہے؟ — اس کی تسلی بخش تفسیر آج تک نہیں ہو سکی۔ گوشت خور بھی ہندو اور گوشت کا تارک بھی ہندو، وید مقدس کو ماننے والا بھی ہندو اور ویدوں کا منکر بھی ہندو، گئے کا پجاری بھی ہندو اور گائے کے چمڑے کے جوتے

بنانے والا اور گانے کے پڑے کے ساز و سامان سے گھر کو زینت دینے والا بھی ہندو، بتوں کا پجاری بھی ہندو اور بتوں کا کھنڈن کرنے والا بھی ہندو، آستک بھی ہندو اور ناستک بھی ہندو، کروڑوں دیوی دیوتاؤں کا ماننے والا بھی ہندو اور توحید کا قائل بھی ہندو ـــــ جو قطعی ایک دوسرے کی ضد ہیں! بھائی پرمانند جی نے اسی لیے ہندو کی ایک دو حرفی تعریف کی ہے کہ "جو اپنے آپ کو ہندو سمجھتا ہے وہ ہندو ہے"۔ ویر ساورکر نے پریٹیکل طور پر یہ تشریح کی ہے کہ "جو اس دیش کو ماتری بھومی اور پنیہ بھومی سمجھتا ہے وہ ہندو ہے"۔ کچھ قوم پرست مسلمان اس ملک کو ماتری بھومی تو ماننے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں مگر پنیہ بھومی نہیں۔ تو اس طرح مسلمانوں کا سوال جوں کا توں رہا، اور ہندوستان میں یہی ایک مسئلہ ہے جس کے حل کرنے پر ملک کے بہترین دماغ لگے ہوئے ہیں۔ آپ نے جو حل اس کا تجویز کیا ہے وہ فی الواقع نہ صرف مسلمان، نہ صرف ہندو، نہ صرف ہندوستان، بلکہ تمام بنی نوع انسان کے لیے یکسانیت رکھتا ہے۔ چند ایک بنیادی اصول ہیں جن کے ماننے والے ایک طرف، نہ ماننے والے دوسری طرف۔ ایک دو ٹوک (Clear cut) واضح پالیسی ہے۔ (اسی لیے میں نے آپ کے لیے "آخری" کا لفظ اوپر استعمال کیا ہے)

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ آپ کی کلیات کا ایک نظر سے مطالعہ کر لیا ہے۔ آپ نے جو خطبات تعلیمی درسگاہوں میں پڑھے ہیں اور موجودہ یونیورسٹیوں کو قتل گاہوں (Slaughter Houses) سے مناسبت دے کر حقیقت کا اظہار فرمایا ہے، اس تلخ صداقت کو بے نقاب کر کے آپ نے جس اخلاقی جرأت اور دلیری کا ثبوت دیا ہے، اس کی جس قدر تعریف کی جائے، کم ہے۔ میں آپ کے ان خطبات کا جب ان کانووکیشن ایڈریسز سے موازنہ کرتا ہوں جو ملک کے چیدہ چیدہ نامور ہستیوں نے، جن کے نام کے ساتھ بڑے بڑے سائن بورڈ چسپاں دئے ہیں، تو یقین فرمایئے، میری طبیعت متلانے لگتی ہے۔

ایک طرف آپ کا قرآن کریم سے روشنی لے کر انسان کی فلاح کی خاطر اسلام کو روشناس کرانے کے لیے دعوت عام دینا اور چھوٹے چھوٹے ٹریکٹوں سلامتی کا راستہ، دین حق، اسلام کا سیاسی نظریہ، اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر وغیرہ لٹریچر کی اشاعت سے ذہنی انقلاب پیدا کرنا میرے سامنے ہے اور دوسری طرف میں دیکھتا ہوں کہ میری قوم کے لیڈر راستی سے بھٹک کر ادنیٰ مقاصد (Minor Ends) پر اپنی اور ساری قوم کی قوت ضائع کر رہے ہیں۔ ایک طرف آپ کا خطبات جمعہ تحریر کر کے ایک ایک مسجد میں اپنے نصب العین کو عوام تک پہنچانے کی سبیل پیدا کرنا ہے اور دوسری طرف ہندوؤں کے گوسوامی گنیش دت اور پنڈت مدن موہن مالوی بنارس ہندو یونیورسٹی میں مندر کی تعمیر کے لیے لاکھوں روپیہ اکٹھا کرنے کی فکروں میں گھلے جا رہے ہیں۔ آریہ سماج کے بارے میں تو میرا یہ عقیدہ ہے کہ اگر آج رشی دیانند کا ظہور ہو تو وہ سب سے پہلے آریہ سماج کا سدھار کریں۔ کانگریس کے ہندو رہنماؤں کے بارے میں ایک مرتبہ لاہور کے عام جلسہ میں چوہدری خلیق الزماں سابق صدر یو۔ پی مسلم لیگ نے فرمایا تھا کہ ہندوؤں کے بڑے سے بڑے سیاسی لیڈر پنڈت جواہر لال نہرو سے زیادہ سیاست میرا کوچوان جانتا ہے۔ ٹھیک یہی بات بھائی پرمانند جی فرماتے ہیں کہ ہندوؤں کی بدقسمتی سے شروع سے ہی کانگریس کی ایسے ہندو لیڈروں کے ہاتھوں میں سیاست کی باگ ڈور رہی ہے جو ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے سیاست کے میدان میں طفل مکتب ہیں۔ جب میں ان حالات پر غور کرتا ہوں تو شاعر کے یہ الفاظ ایک آہ سرد بن کر بے ساختہ زبان سے نکل جاتے ہیں:

"یاسیت کی گردن میں لپٹا ہوا
راستہ تاریک، ویراں اور اداس
زندگی بے کیف و رنگ و نور ہے!   کارواں منزل سے کوسوں دور ہے!"

جہاں تک میری ذاتی رائے کا تعلق ہے، میں بلا مبالغہ عرض کروں گا کہ آپ کے پروگرام نے ملک کی دیگر تمام تحریکوں پر سایہ (Shade) ڈال لیا ہے۔ آپ کا سارا لٹریچر دیکھ جانے کے بعد مجھے بجز ایک کے اور کوئی بھی مسئلہ ایسا نظر نہیں آیا جس میں دیانت داری کے ساتھ آپ سے اختلاف کر سکوں۔ مانتا ہوں کہ آپ کا پروگرام ہر پہلو سے مکمل (ComPlete) اور خود کفایت (Self Sufficient) ہے۔ صرف دو باتیں جو مجھے کھٹکتی ہیں، جناب کی خدمت میں عریاں پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔

آپ کی تصنیف الجہاد فی الاسلام کے مطالعہ کے بعد میرا یقین تھا کہ سنسکرت زبان پر آپ کا عبور ایک لازمی چیز ہے۔ مگر اس شام سیر کے وقت دوران گفتگو میں آپ کا یہ فرمانا کہ آپ نے سب کچھ ویدوں کے بارے میں انگریزی کتابوں سے لیا ہے، سچ سچ مجھے یہ جملہ سن کر ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی شخص برقی رو کے چھو جانے سے جھٹکا سا محسوس کرتا ہے جیسے آپ نے فرمایا تھا کہ ایچ۔ جی۔ ویلز کا اسلام کے بارے میں براہ راست کیا علم ہے جو انھوں نے اسلام اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پاکیزہ زندگی پر بے معنی نکتہ چینی کر کے رکھ دی، بعینہٖ آپ کا سنسکرت زبان سے براہ راست تعلق نہ ہونے کی وجہ سے وید بھگوان کے بارہ میں آپ کے احساسات مستند نہیں کہے جا سکتے۔ آپ تسلیم کریں گے کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں آزادانہ ترجمہ کرنے پر بھی اصل منشا پورا نہیں ہوتا، چہ جائے کہ اسے پھر تیسری زبان میں پیش کیا جائے۔ رشی دیانند نے تو مہی دھر اور ساین آچاریہ کے وید بھاشیہ کو ہی لغو ٹھیرا دیا ہے، پھر کہاں آپ "میکس مُلر" اور دیگر یورپین اصحاب کے ترجمے سے رائے قائم کرتے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی ان نیک اور بلند خواہشات کا جو آپ ہندوؤں کے دل و دماغ سے تعصب دور کر کے انھیں اسلام سے صحیح طور پر روشناس کرانے کے لیے اپنے دل میں رکھتے ہیں، احترام کرتے ہوئے میں مودبانہ یہ گذارش کروں گا کہ آپ آئندہ اپنی ان کتابوں پر نظر ثانی فرماتے وقت، جن میں خاص طور پر ہندو لٹریچر کے حوالے (Referencts) پائے جاتے ہیں، کسی ایسے شخص کی امداد حاصل کریں جو ہندو ابھیاس اور ہندو لٹریچر پر براہ راست عبور رکھتا ہو۔ (مجھے ذاتی طور پر ایسے ایک دو اصحاب سے قربت کا فخر حاصل ہے) امید ہے آپ کی ذات مبارک پر میرا منشا واضح ہو گیا ہوگا۔

آپ نے رسالہ "اسلام اور جاہلیت" کے آخر میں یہ فرمایا ہے کہ "تاریخ شاہد ہے کہ جیسے افراد اس نظریے پر تیار کیے گئے تھے، ان سے بہتر افراد کبھی روئے زمین پر پائے گئے، نہ اس اسٹیٹ سے بڑھ کر کوئی اسٹیٹ انسان کے لیے رحمت ثابت ہوا۔" اگر صاف گوئی پر معاف فرمایا جائے تو میں نہایت ادب و انکسار سے گذارش کروں گا کہ آپ نے یہاں طرف داری سے کام لیا ہے، یہاں تعصب کی جھلک نظر آتی ہے۔ میں صرف ایک بھگوان کرشن کی شخصیت پیش کروں گا جن کی دو حرفی تقریر نے کہ

"فعل سے وابستگی واجب نہیں تیرے لیے   فرض کی تکمیل کر، خواہش صلہ کی چھوڑ دے"

ویرارجن جیسے مجاہد پر ایک ہیبت کا عالم طاری کر دیا۔ اور اس کے بازو میں برقی طاقت پیدا کر دی۔ اور اس تاریخی واقعہ کی یادگار میں گیتا جیسی ممتاز کتاب ظہور میں آئی۔ بڑے بڑے مخالف بھی کرشن بھگوان کی زندگی میں کوئی اخلاقی رخنہ نہ پیش کر سکے۔ "بھگوان" کا لفظ میں نے صفتی معنوں میں لیا ہے، اوتار کے معنوں میں نہیں۔ آپ نے ایسی شخصیتوں کو نظر انداز کر کے اسلام سے پہلے کی تاریخ کے معاملہ میں تعصب کا ثبوت دیا ہے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ میری آنکھیں ترستی رہیں کہ آپ کسی جگہ کسی ہندو کیرکٹر کا نمونہ پیش کریں، مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

آپ نے ترجمان القرآن میں میرے خطوط اور اپنے جوابات شائع فرما کر اسلامی پریس کے لیے دلچسپی کا سامان مہیا کر دیا۔ دہلی کا ایک روزنامہ "حکومت الٰہیہ اور پاکستان" کے عنوان سے ان خطوط کا حوالہ دے کر آپ پر خوب برس رہا ہے۔ عجیب منطق ہے کہ دیدہ دانستہ عین اسلامی تعلیم کو جھٹلایا جا رہا ہے!!

مرحوم مولانا محمد علی صاحب نے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ "جہاں تک مسلمانوں کے ایمان کا تعلق ہے، میں ایک فاسق و فاجر مسلمان کو گاندھی جی سے بہتر سمجھتا ہوں"۔ لیکن آپ نے اصل اسلام پیش کر کے اور مسلمانوں کی ایمانی قوت کو عالم نشرح کر کے نہ صرف مسلمانوں کی، بلکہ تمام انسانیت کی زبردست خدمت انجام دی ہے۔ آپ کے اسلامی لٹریچر کے طفیل وہ محسوس کر رہے ہیں کہ انھیں کیا ہونا چاہیے تھا اور کیا ہو گئے ہیں۔ مگر میری گذارش یہ ہے کہ جب آپ کی حکومت الٰہیہ ہر فرد و بشر کے لیے انسانیت کے ناطے سے یکساں جاذبیت رکھتی ہے اور آپ کا منشا بھی یہی ہے کہ بہ لحاظ مذہب و ملت اسے عوام تک پہنچایا جائے پھر آپ اپنی مساعی (Struggle) کو صرف مسلمانوں تک کیوں محدود رکھتے ہیں"۔

جواب:- آپ کا یہ اعتراض صحیح ہے کہ میں نے سنسکرت زبان اور ہندوؤں کی مذہبی کتابوں سے براہ راست واقفیت کے بغیر محض یورپین ترجموں کے اعتماد پر اپنی کتاب میں ویدوں سے کیوں بحث کی، لیکن آپ نے اس بات کا خیال نہیں کیا کہ الجہاد فی الاسلام بالکل میرے ابتدائی عہد کی تصنیف ہے جب مذاہب کے معاملہ میں میرا ذوق پوری طرح پختہ نہیں ہوا تھا اور نہ وہ احتیاط طبیعت میں پیدا ہوئی تھی جو تحقیق کے لیے ضروری ہے۔ اب اگر میں اس کتاب کو دوبارہ لکھوں گا تو ہر اس چیز کی جس کی براہ راست واقفیت کا موقع مجھے نہیں ملا ہے، از سر نو تحقیق کروں گا۔ آپ اگر اس تحقیق میں میری کچھ مدد کر سکتے ہیں تو میں آپ کا بہت شکر گذار ہوں گا۔ کوئی ہندو عالم جو خود بھی محض حامی دین (Defender of the faith) نہ ہو، بلکہ خود محقق بھی ہو اور محققانہ انصاف بھی اپنے اندر رکھتا ہو، اگر میری کتاب کے اس حصے پر جو ہندوؤں سے متعلق ہے، تنقید کر کے مجھے بتائے کہ میں نے کہاں کہاں غلطی کی ہے تو اس سے مجھے بہت مدد ملے گی۔ اس کے علاوہ اگر آپ مجھے کوئی ایسی کتاب بتائیں جس میں ہندو مذہب کے مقصد جنگ اور قوانین جنگ کو بناوٹ کے بغیر، جیسے کہ بجائے خود وہ ہیں، پیش کیا گیا ہو تو مزید باعث شکر گذاری ہوگا۔ "بناوٹ کے بغیر" کی شرط میں اس لیے لگا رہا ہوں کہ آج کل عام طور پر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ ایک مذہب پر جیسا کہ وہ بجائے خود ہے، ایمان نہیں رکھتے، مگر قومی عصبیت کی خاطر اس مذہب کو اپنے مذہبی طرز عمل (   ) کو "معقول" (   ) بنانے کے لیے وہ اکثر خود نظریات کے مطابق ایک نیا مذہب گھڑتے ہیں اور پرانے مذہب کے نام سے اسے پیش کرتے ہیں۔ مجھے اس طریقہ سے سخت نفرت ہے خواہ اسے مسلمان برتیں یا ہندو یا کوئی اور۔ میرا خود بھی یہ طریقہ ہے اور میں پسند بھی صرف ایسے ہی لوگوں کو کرتا ہوں جو اصل مذہب کو۔

جیسا کہ فی الواقع وہ ہے، ویسا ہی رہنے دیں اور ویسا ہی اسے پیش کریں، پھر اگر وہ ماننے کے لائق ہو تو اسے مانیں اور ماننے کے لائق نہ ہو تو اسے رد کر دیں۔

دوسری چیز جس کی آپ نے شکایت کی ہے، اس پر آپ کو بجائے مجھ سے شکایت کرنے کے خود ہندوؤں سے شکایت کرنی چاہیے تھی اور مجھے بھی اس معاملہ میں ان سے شکایت ہے۔ انھوں نے خود اپنے بزرگوں کی سیرتوں کو محفوظ نہ رکھا بلکہ ان کی حقیقی زندگیوں کو افسانوں سے خلط ملط کر دیا ... اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ یہودیوں کی طرح انھوں نے بھی اپنی اخلاقی کمزوریوں کو درست ثابت کرنے (......) کے لیے بدترین اخلاقی کمزوریاں اپنے بزرگوں کی طرف منسوب کر دیں۔ اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان کے جن بڑے بڑے اشخاص کی طرف نگاہیں اس توقع سے اٹھتی ہیں کہ انھیں اخلاقی پاکیزگی اور عظمتِ انسانیت کے نمونے کی حیثیت سے لیا جا سکے گا، ان کے واقعاتِ زندگی تاریخی حیثیت سے مشتبہ بھی ہیں اور افسانویت سے آلودہ بھی، اور جن ماخذ (......) کی سند سے ان کے روشن پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں انھیں کی سند سے ایسے تاریک ترین پہلو بھی آتے ہیں جنھیں کسی بڑے انسان کی طرف منسوب کرنا تو درکنار کسی گھٹیا انسان کی طرف منسوب کرتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے، نہ کہ کسی قومی یا مذہبی تعصب کی وجہ سے میں مجبور ہوں کہ عربی تاریخ کے صرف ایک ہی دور کو کمالِ انسانیت کے نمونے کی حیثیت سے پیش کرتا ہوں، کیونکہ وہ تاریخی حیثیت سے نہایت معتبر بھی ہے۔ افسانویت کا اضافہ کرنے کی اگر اس میں کوشش کی بھی گئی ہے تو تاریخی تنقید کے ایسے ذرائع موجود ہیں جن سے اس آلودگی کو پورے منصفانہ طریقے سے چھانٹ کر الگ کیا جا سکتا ہے، اور پھر وہاں کسی اخلاقی گندگی کا تو سرے سے نام و نشان ہی نہیں ملتا۔ یہ تو خدا کی دین ہے جس کے نصیب میں آ جائے۔ اگر عرب نسل کے ایک مختصر گروہ کو یہ فضل نصیب ہو گیا تو اس پر کسی افسوس کی ضرورت نہیں اور نہ افسوس کرنے سے کچھ حاصل ہے۔ بلکہ اگر آپ ہندوستانی یا ہندو کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کے بجائے انسانی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو انسانیت کے لیے جو چیز قابلِ فخر ہے، اس پر آپ کو بھی اسی طرح فخر کرنا چاہیے جس طرح ایک عرب فخر کر سکتا ہے۔ کیونکہ انسانیت کے نقطۂ نظر سے جو تاج کسی انسان یا کسی انسانی گروہ کو پہنایا گیا، وہ ہم سب انسانوں کے لیے تاجِ فخر ہی ہے، خواہ وہ کسی عرب انسان کے سر پر نظر آئے یا ہندوستانی انسان کے سر پر!!

مطبوعات

تدوین فقہ۔ از مولانا سید مناظر احسن گیلانی، صدر شعبۂ دینیات، جامعہ عثمانیہ، مطبوعہ مجموعۂ تحقیقات علمیۂ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن، قیمت معلوم نہیں۔

تدوین فقہ کے عنوان سے مولانا سید مناظر احسن صاحب کا ایک سلسلۂ مضامین بعض رسائل میں نکل چکا ہے۔ وہی مضامین اس رسالہ میں یکجا شائع کر دیے گئے ہیں۔ اگرچہ یہ سلسلہ ابھی نامکمل ہے تاہم تقریباً سوا سو صفحے کا ٹائپ میں چھپا ہوا اچھا خاصہ رسالہ ہے۔ مولانا کی تصنیفات میں سائنٹفک ترتیب نہیں ہوتی، اس وجہ سے ان لوگوں کو ان کی کتابوں سے اخذ مطلب میں زحمت ہوتی ہے جو تھوڑی فرصت میں کسی کتاب کے مالہٗ و ماعلیہ کو سمجھنا چاہتے ہیں تاہم ان کے بیان میں ایک وسعت ہوتی ہے جو ان کے طرزِ تحریر کی غرابت کے باوجود ان کی وسعت مطالعہ کی وجہ سے دلچسپ اور مفید بن جاتی ہے۔

اس رسالہ کی تمہید اچھی ہے۔ مولانا نے جس نہج سے اس کو اٹھایا تھا اگر اسی نہج سے اس کو نبھانے کی کوشش کرتے اور اصل موضوع دوسری بحثوں میں گم نہ ہو جاتا تو یہ نہایت مفید رسالہ بنجاتا اور وقت کے بعض اہم شبہات کو دور کرنے میں مدد دیتا لیکن مولانا اپنے قلم کی روانی میں اکثر اصل بحث کے سررشتہ کو بھول کر دوسری بحثوں میں نکل جاتے ہیں اور اس طرح کی ژولیدہ بیانی اور بے ربطی کے ساتھ اپنے کلام کی افادیت کو ابن تیمیہ کے سوا کوئی اور باقی نہیں رکھ سکا۔

اس رسالہ میں بعض باتیں خاص طور پر قابل توجہ نظر آئیں مثلاً ایک یہ بحث کہ خبر احاد کو شہرت سے بچانا اور ان کو صرف افراد ہی کے اندر ہی محدود رکھنا خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر تھا اور خلفائے راشدین نے باقاعدہ ایک اسکیم بنا کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس منشا کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی جمع کردہ روایات کا مجموعہ جو جلا دیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کثرت روایات سے جو لوگوں کو حکماً روکا اور بسا اوقات سزائیں تک دیں تو اس کی وجہ یہی تھی کہ جن باتوں کو پیغمبر نے شہرت عام کا درجہ نہیں دینا چاہا تھا ان کی روک تھام کے بغیر اندیشہ تھا کہ وہ افسانۂ بزم و انجمن بنجائیں۔ مولانا کے خود اپنے الفاظ یہ ہیں:-

> "ان الفاظ سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ جن روایتوں کو خبر الخاصہ عن الخاصہ سے مسلمانوں میں پیغمبر پہنچانا چاہتے تھے وہ خبر العامہ عن العامہ کی شکل اختیار کریں گی یعنی اگر صحابہ ہی میں بکثرت روایت کرنے والے ان حدیثوں کے پیدا ہو جائیں گے تو نبوت جن مطالبات میں خفت پیدا کرنا چاہتی ہے ان میں اسی قسم کی شدت آئندہ چل کر پیدا ہو جائے گی جیسے صرف قرآنی مطالبات اور ان کی تفصیلات و عملی تشکیلات تک قصداً محدود رکھنے کی کوشش کی گئی ہے جن کی تعمیل عام حالات میں ہر مسلمان کے لیے ناگزیر اور ضروری ہے۔"

مولانا کا مطلب یہ ہے کہ یہ بات کچھ مشکل نہ تھی کہ آنحضرت صلعم کے تمام ارشادات اور اعمال بھی اس طرح شہرت اور تواتر قولی و عملی کا درجہ حاصل کر لیتیں جس طرح قرآن، نماز، نجوقتہ اوقات، ارکان حج وغیرہ نے اختیار کر لیا لیکن آنحضرت صلعم نے یہی چاہا کہ آپ کی یہ تعلیمات عام نہ ہوں تاکہ لوگوں کے لیے ان میں ڈھیل باقی رہے اور لوگ ان کے ضعف، عدم شہرت، راوی کی غلط فہمی، سوء حفظ وغیرہ کے

اندیشوں کی بنا پر ان پر گفتگو نہیں کریں اور بعض حالات میں ان کو چھوڑ کر مختلف راہیں اختیار کر سکیں اور ہر طرح کے لوگوں کے لیے دین کے دائرہ میں گنجائش پیدا ہو جائے۔ چنانچہ مولانا فرماتے ہیں:۔

"سچ تو یہ ہے کہ اسلام سے جو لوگ قصداً و اختیاراً ہی نکلنے پر آمادہ ہوں ان کوتاہ نصیبوں کا تو کوئی علاج نہیں ورنہ یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ جو اسلام کے دائرہ میں جینا اور مرنا چاہتا ہے وہ پائے گا کہ گنجائشوں کے پیدا کرنے میں اسلام نے کوئی کمی نہیں کی ہے۔"

ان گنجائشوں کی نوعیت کو خود مولانا کے الفاظ میں مثالوں سے سمجھ لیجئے۔

"حنفی مذہب کی عام کتابوں میں مذکورہ بالا امور، اور ان کے سوا بھی اس کے دیگر متعلقات کے باب میں جو متفرق چیزیں نشہ آور عرقیات و مشروبات کے متعلق ملتی ہیں، اور مالکی مذہب کا جو توسیعی نقطۂ نظر ماکولات کے متعلق ہے اگر ان کو سامنے رکھ لیا جائے جو ظاہر ہے کہ انسانی زندگی کا ایک جزئی و اجزئی مسئلہ ہے۔ لیکن ایسے ممالک جیسے شمالی و جنوبی قطب کا حال ہے سنا جاتا ہے کہ وہاں کے باشندوں کی گذر اوقات صرف مچھلیوں پر ہے یا اگر مچھلی نہ ملی تو دوسرے بحری جانوروں کے کھانے پر مجبور ہیں۔ اگر یہ قوم مسلمان ہونا چاہے تو کیا غذائی حیثیت سے وہ مالکی مذہب کی ماکولاتی وسعتوں سے نفع اٹھا کر اسلام کے دائرہ میں اپنے آپ کو باقی نہیں رکھ سکتی یا نشہ آور عرقیات کے سلسلہ میں آج مغربی تمدن کے تسلط کی بدولت دواؤں میں، رنگوں میں، وارنش میں اور بھی مختلف چیزوں میں الکحل کے استعمال کا عمومی ابتلا جو پایا جاتا ہے جن میں غیروں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے عوام کی بھی ایک بڑی تعداد دنیا کے اکثر حصوں میں شریک ہے جیسا کہ سنا جاتا ہے کہ الکحل کا یہ جوہر عموماً غیر خمری عرقوں سے نکالا جاتا ہے اور کلیتہً یہ نہ بھی صحیح ہو جب بھی ہر قسم کے الکحل کا خالص خمری عرقیات ہی سے تیار ہونا یقیناً غیر ضروری ہے ایسی صورت میں یہ جانتے ہوئے کہ ہمارے مذہب میں الکحل قطعاً حرام و نجس ہے مسلمانوں میں جو لوگ اس کے استعمال میں لاپروائیوں بلکہ بسا اوقات مخالفانہ اصرار و تمرد سے کام لے کر جس عصیان بلکہ بغاوت کے مرتکب ہو رہے ہیں کیا الخمر کے متعلق جو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا نقطۂ نظر ہے اور حنفی مذہب میں اس کے متعلق جو تفصیلات پائی جاتی ہیں ان کو پیش نظر رکھ کر ان مسلمانوں کے جرم کو کیا ہلکا نہیں بنایا جا سکتا۔"

اس اقتباس کے بعد مولانا کا منشا بالکل واضح ہو گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء اگر روک تھام نہ کرتے اور تمام حدیثیں شہرت و استفاضہ کے درجہ تک پہنچ جاتیں تو اس سے سب سے بڑی قیامت تو اس امت پر ٹوٹ پڑتی کہ مذہبی اختلافات اور فقہی مسالک و مذاہب کا دروازہ ہی بند ہو جاتا جو عین رحمت کا دروازہ ہے جس سے ہر قوم اور ہر ملک کے لوگ اسلام کے دائرہ کے اندر داخل ہو سکتے ہیں نیز دوسری مصیبت یہ پیش آتی کہ اس زمانہ کے لوگ جو اپنے نفس کی خواہشوں کی پیروی میں بسا اوقات دین سے بے پروائی بلکہ عصیان و تمرد کی صورت اختیار کر لیتے ہیں ان کا دین سے رشتہ ہی کٹ جاتا۔ یہ محض خبر احاد کی عدم شہرت ہی کی برکت ہے کہ جزئیات دین میں کوئی شدت نہ پیدا ہوئی۔ نیز اس کی وجہ سے دین میں اختلافات پیدا ہوئے اور ہر باب میں اتنے مذاہب و اقوال پیدا ہو گئے کہ آج ہم چاہیں تو خدا کے کسی بڑے سے بڑے باغی کی نافرمانیوں کے لیے فقہ کے جزئیات سے کوئی نہ کوئی سند جواز ڈھونڈھ کر اس کی بغاوت کو عبادت بنا دے سکتے ہیں ورنہ کم از کم اس کے جرم کو ہلکا تو کر ہی دے سکتے ہیں۔ مولانا نے اس سلسلہ میں ایک لمبی بحث

اختلاف امتی رحمۃ کے اسرار و نکات پر بھی فرمائی ہے اور اس ذیل میں قرآن مجید سے بھی اس امر کا ثبوت بہم پہنچانے کی کوشش کی ہے کہ لوگوں کا دین کے معاملہ میں اختلاف اور لڑنا جھگڑنا خود اللہ تعالیٰ کو بھی مطلوب ہے اور قاضی بیضاوی اس بات پر شاہد ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ آپس میں اختلاف کریں (ص ۱۱۲) ان اسرار کے بیان کرنے میں جہاں کہیں مولانا نے کوئی خلا محسوس کیا ہے وہاں شیخ اکبر اور امام شعرانی کے افادات سے اس خلا کو بھرنے کی کوشش کی ہے جو بجائے خود قابل ملاحظہ ہیں۔

اس رسالہ کا کمعن یہی بحث تھی جو ہم نے قارئین کے سامنے رکھدی ہے۔ اس پر تنقید کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ اس بات کا افسوس ضرور ہے کہ مولانا نے منکرین حدیث کا رخنہ بند کرنے کے لیے جو کوشش فرمائی اس سے اور سیکڑوں رخنے پیدا ہوگئے۔ اور ان کے ان اطلاع سے دین سے زیادہ اعدائے دین کو فائدہ پہنچے گا۔ ابھی یہ رسالہ ناتمام ہے ہمیں امید ہے کہ اس کو مکمل حالت میں شائع کرنے سے پہلے مولانا اس کے مطالب پر نظر ثانی فرمائیں گے۔ (ا۔ ل)

اشتراکیت اور اسلام : از مولانا مسعود عالم صاحب ندوی۔ شائع کردہ :۔ دار المصنفین اعظم گڈھ۔ قیمت بلا جلد عہ۔

"سرمایہ داری" کے شیطانی پنجوں میں جکڑی ہوئی دنیا نجات کی کوئی صورت ڈھونڈھ نکالنے کے لیے انتہائی اضطراب دکھا رہی ہے۔ اس حال میں اس کے سامنے کارل مارکس اور لینن کی امت زندگی کا ایک نیا خاکہ اشتراکیت کے عنوان سے پیش کرتی ہے مگر خود یہ خاکہ جن اساسی نکات پر کھینچا گیا ہے وہ بالکل وہی ہیں جو سرمایہ داری نے اختیار کیے ہیں۔ یعنی دونوں کا نقطۂ نظر کائنات، حیات اور ذہن انسانی کے متعلق بالکل متحد ہے اور اس اساسی اتحاد کے ہوتے ہوئے اوپری اختلافات کتنے ہی عظیم الشان کیوں نہ ہوں، فساد اور ظلم اور انتہا پسندانہ بے اعتدالی دونوں کا سرمایہ مشترک رہے گا۔ ان دونوں خمیدہ راستوں کے درمیان اعتدال کا "صراط مستقیم" دعوتِ تحقیق و تفتیش دے رہا ہے اور جناب مولانا مسعود عالم صاحب ندوی نے اسی صراط مستقیم کی طرف دنیا کو متوجہ کرانے کی کوشش کی ہے۔

مولانا ندوی ہمیشہ تحقیقی انداز میں لکھتے ہیں، چنانچہ ان کی پیش نظر کتاب بھی اسی رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ آپ نے لکھنے سے پہلے پڑھا ہے اور سمجھانے سے پہلے سمجھا ہے۔ معتبر کتابوں کے حوالوں کے ساتھ پہلے تو یہ واضح کیا گیا ہے کہ سوشلزم نظری طور پر تھا کیا اور پیش کرنے والوں نے اسے کس طرح پیش کیا اور اس کے ساتھ روسی انقلاب کی تاریخ کا خلاصہ بھی دے دیا گیا ہے جس سے عملی اشتراکیت کی دھندلی سی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اس طرح اشتراکیت کے نظریے اور عملیے میں جو بڑے بڑے تضاد پائے جاتے ہیں ان سے خود بخود اشتراکیت کے مجوزین کی فکری لغزشوں کی طرف توجہ منعطف ہوجاتی ہے۔

معیاری اشتراکیت کے حقیقی مطالبات دو تھے۔ ایک انفرادی ملکیت کا قطعی خاتمہ، دوسرا کامل معاشی مساوات! تاریخ اس کی شاہد ہے کہ خوفناک خون خرابوں کے باوجود یہ دو مطالبات انسانی فطرت سے نہ منوائے جاسکے۔ یوں ایک فلسفہ کا میدانِ عمل میں اپنی جگہ چھوڑ دینا صاف بتاتا ہے کہ اس کی تعمیر حقائق کی مضبوط چٹانوں پر نہیں ہوئی تھی، بلکہ وہ خواہش پرستانہ فکر (Wishful thinking) کی ریت پر کھڑا کردیا گیا تھا۔

عملاً اشتراکی انقلاب کا ماحصل "محدود حق ملکیت" اور "محدود معاشی مساوات" سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ اور ادھر اسلام کا نظام معاشی بھی تدریجاً یہی دو نتائج پیدا کرتا ہے۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ اشتراکیت انسانیت کے اونچے ملکوتی مطالبات سے آنکھیں بند کرکے معدہ کو فکر کا مرکز بناتی ہے، پھر وہ فرد کو ریاست کے شکنجے میں کس کر اس کے بہت سے فطری حقوق کو سلب کرتی ہے، پھر وہ مجبور ہے کہ انسان کو حیوان قرار دے، پھر اس کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ تصور خدا کی نفی کرے لیکن اسلام تصور خدا ہی سے دوسرے مسائل کے ساتھ معاش کی گرہ کشائی کرتا ہے۔ وہ معدہ کے ساتھ دل و دماغ کے مطالبات کو بھی پورا کرتا ہے، وہ فرد کو پوری فراخ دلی سے فطری حقوق دیتا ہے اور انسان کو اشرف المخلوقات ہونے کی حیثیت سے دیکھتا ہے جو صرف روٹی کا بھوکا نہیں ہے اور روٹی ہی کے بل پر زندہ نہیں رہتا بلکہ وہ اللہ کی بندہ نوازی کا، اور ایمان و عمل صالح کا بھوکا بھی ہے اور اس کی روح انھیں غذاؤں سے زندہ رہتی ہے۔

مولانا ندوی نے ان دونوں اجتماعی فلسفوں کا تقابل خوبی سے کیا ہے۔ البتہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا فلاسفی سے نکل کر جہاں خالص معاشیاتی نقطۂ نظر سے تقابل کیا گیا ہے، وہاں بحث بالکل تشنہ ہے۔ حالانکہ اشتراکی نظام میں جب معاشیات ہی کو زندگی کا اہم ترین پہلو قرار دیا گیا ہے تو سب سے زیادہ شدید ضرب کا مستحق یہی پہلو ہے، مگر عموماً اس پہلو سے مسلم اہل قلم زکوٰۃ اور میراث اور فے اور غنیمت کے اسلامی ضوابط پر چند جملے کہہ کر بحث ختم کر دیتے ہیں۔ چاہیے یہ کہ مخالفین کے "عمل ترکزِ زر" کو اعداد و شمار کی روشنی میں تفصیلاً پیش کرکے اسلام کے قوانین معاشی کے "عمل نشر زر" کو بھی سائنٹفک طریقہ سے واضح کیا جائے اور ان دونوں عملوں کے مشترک نتیجہ کو بالکل متعین طریقہ سے سامنے لایا جائے۔ دوسرے لفظوں میں "نظریۂ قدر زائد" کی رو سے جو ظلم نظام سرمایہ داری میں وسیع پیمانہ پر رونما ہوتا ہے اس کے ازالہ کے لیے اسلام کے ضوابط کو کافی و وافی ثابت کیا جائے۔ نیز محنت پیشہ طبقہ کے حقوق کے تحفظ کے لیے شرح و بسط سے اسلامی نقطۂ نظر پر بحث ہونی چاہیے۔ ان سارے مباحث کی ترتیب میں جہاں جہاں بالکل جدید احوال اور جدید مسائل کا سامنا ہو وہاں کتاب و سنت کی اٹل حدود کے اندر رہتے ہوئے مجتہدانہ بصیرت سے کام لیا جائے۔

تاہم یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ "اشتراکیت اور اسلام" اپنی ہم موضوع کتابوں میں ایک ممتاز درجہ رکھتی ہے۔ (ن۔ ص)

بچوں کی نفسیات: از جناب محمد اختر صاحب۔ شائع کردہ:۔ ادارۂ اشاعت اردو، حیدرآباد، دکن۔ قیمت مجلد عہ

علم النفس کو تعلیم و تربیت سے بہت گہرا تعلق ہے۔ مائیں اور باپ گھروں میں اور استاد مدرسوں میں اگر مستقبل کے انسان کو تعمیر کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لیتے ہیں تو پھر انھیں یہ جاننا چاہیے کہ بچہ کیا ہے؟ اس کے ذہن میں کیا کیا تحریکیں نشو و نما پاتی ہیں؟ وہ خارج سے کس کس طرح اثر پذیر ہوتا ہے؟ اس میں عمر کے ارتقا کے ساتھ کیا کیا دماغی تغیرات ہوتے چلے جاتے ہیں؟ متعلقین کے مختلف سلوک اور رویے اس میں کون کون سی اچھی یا بری صفات کو ابھارتے ہیں؟ وغیرہ! مگر افسوس ہے کہ اردو زبان میں علم النفس پر بہت کم سرمایۂ کتب پایا جاتا ہے، اور نفسیات طفلی کے معاملہ میں تو ہنوز "عالم طفلی" ہے۔ جناب شیر محمد اختر صاحب کی پیش نظر کتاب اسی کمی کو ایک حد تک۔۔۔ پورا کرتی ہے۔ اگرچہ انگریزی زبان میں اس موضوع پر جو کتابیں پائی جاتی ہیں، یہ کتاب ان کی برابری نہیں کر سکتی، مگر اردو کی حد تک یہ بسا غنیمت ہے

اور خصوصاً اس لحاظ سے تو بہت زیادہ قابل قدر ہے کہ سادگی بیان کی وجہ سے عام تعلیم یافتہ والدین اور اساتذہ دونوں کے لیے قابل فہم ہے۔ لیکن دوسری طرف اس میں بنیادی فساد یہ ہے کہ احوال نفس کو یورپ کے تصور انسان اور نظریہ اخلاق کی روشنی میں دیکھا گیا ہے، حالانکہ اس تصور اور اس نظریے کی آنکھ بھینگی ہے اور اپنے بھینگے پن کی وجہ سے نفس انسانی میں بہت سے ٹیڑھ اسے نظر آتے ہیں۔

بہرحال اس کتاب کا مرکزی پیغام یہ ہے بچے کو سانحوردہ سمجھ کر جو مطالبات اس کے سامنے رکھے جاتے ہیں اور جنھیں قبل از وقت پورا کرانے کے لیے جھاڑ جھڑک کے ساتھ لاٹھی استعمال کرنے تک نوبت پہنچتی ہے، ان مطالبات کو ملتوی کیا جائے۔ اس وقت تک جب کہ بچہ انھیں پورا کرنے کے قابل ہو جائے۔ غالباً اس مطالبہ سے بہت سے ذی فہم حضرات بچے کو اپنا ہم سمجھنے سے تائب ہو کر بچہ سمجھنے پر آمادہ ہو جائیں گے اور بھول کی اس ننھی سی نازک پتی پر ان چٹانوں کو لادنے کی مہم سر کرنے سے باز آجائیں گے جنھیں صرف ایک ہوشمند، جوان آدمی ہی اٹھا سکتا ہے۔

جناب مولف نے جابجا واقعاتی مثالوں سے مدد لے کر توضیح بیان کی اچھی کوشش کی ہے مگر پھر بھی مباحث میں ایک طرح کی تشنگی پائی جاتی ہے۔ کہیں کہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے، گویا جلدی میں مختصر نوٹ لکھے گئے ہیں اور ان نوٹوں کے درمیان جو خلا تھے انھیں ایک آدھ فقرے کی مدد سے چھپا تو دیا گیا ہے مگر باضابطہ طریقہ سے پُر نہیں کیا گیا۔ تاہم کتاب قابل مطالعہ ہے۔

سراپائے رسول: مولفہ جناب مولوی اعجاز الحق صاحب قدوسی۔ ناشر:۔ مکتبۂ قدوسی، نام پلی، لال ٹیکری، ۱۱/۷ حیدرآباد دکن۔ قیمت مجلد عہ۔

قدوسی صاحب پہلے ایک کتاب "رسول پاک کی صاحب زادیاں" کے نام سے پیش کر چکے ہیں۔ اب موصوف کا دوسرا نتیجہ محنت ہمارے سامنے ہے۔ اس مختصر سی کتاب میں آنحضور صلعم کے معاشرتی و مجلسی اخلاق اور پاکیزہ عادات و اطوار کو بڑی عمدگی سے پیش کیا گیا ہے کہ دنیا کا سب سے بڑا انسان اپنی پوری شانِ خدا پرستی اور اپنے کمال انسانیت نورانی کے ساتھ آنکھوں کے سامنے جلوہ گر نظر آتا ہے۔ اس سعی کا مقصد یہ ہے کہ زندگی کا بہترین نمونہ نونہالان ملت کے سامنے آجائے اور وہ عملاً اس سے اکتساب فیض کر سکیں۔ اسی مناسبت سے زبان سادہ رکھی گئی ہے۔

کتاب کا پیش لفظ جناب مدیر ترجمان القرآن کا لکھا ہوا ہے۔ (ن۔ ص)

چاند بی بی سلطان: از جناب وزیر حسن صاحب (عثمانیہ)۔ ناشر:۔ دکن اردو اکاڈمی، ادارۂ شرقیہ، حیدرآباد دکن۔ کاغذ کتابت، طباعت اعلیٰ، گردپوش اور تصویر سے مزین۔ قیمت مجلد قسم اول للعہ قسم دوم عہ۔

کتاب ہے تو تاریخ ہند کی مشہور شخصیت چاند بی بی کے کردار پر مگر بقول مؤلف "نہ ناول ہے، نہ ڈرامہ ہے، نہ سوانح ہے، پھر بھی کچھ نہ کچھ ہے"۔ اس "کچھ" میں تاریخی اعتبار سے تو بہت ہی مختصر سا ایک واقعہ بیان ہوا ہے کہ کس طرح چاند بی بی کی شادی علی عادل شاہ کے ساتھ سیاسی طور پر ہوتی ہے۔ مگر ادبی اعتبار سے مؤلف نے واقعہ کی اس کھی کو گھس گھس کر جس خوبی سے بھینس بنایا ہے اس پر داد دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

تاریخی افسانہ کی زبان کو پہلے پہل آزاد مرحوم نے استعمال کیا تھا اور اس بدعت کا اثر یہ ہوا کہ الفاظ کے وزن اور ان کی ترتیب اور محاورات کو کھپانے کے لیے واقعات کا مُثلہ "سا ہو کے رہ گیا۔ اب جناب وزیر حسن صاحب نے اس سلسلہ میں قدم

کچھ اور آگے بڑھا کے رکھا ہے اور زبان اور رنگینی بیان، تراکیب اور استعارات اور روزمرہ وغیرہ کا اتنا ہجوم کر دیا ہے کہ کتاب تاریخی ہونے سے زیادہ افسانوی بن گئی ہے۔

کتاب کا مدعا یہ ہے کہ چاند بی بی کی سیرت و سوانح سے ملک کی بہو بیٹیاں استفادہ کریں۔ مگر ہم کیا کہیں کہ ایک مسلمان کے نقطۂ نظر سے کوئی بیٹی محض اس خوبی کی وجہ سے عورتوں کے لیے اسوہ نہیں بن سکتی کہ وہ سپاہیانہ بہادری سے بہرۂ وافر رکھتی ہے یا اپنی خاندانی ریاست کی محبت کا عمیق جذبہ دل میں رکھتی ہے۔ نہیں، اسوہ بننے کیلیے اور بہت کچھ چاہیے۔ چاند بی بی مغلئی تہذیب کا کیسا ہی باکمال نمونہ ہو مگر وہ "اسلامی تہذیب" کے سمندر کا درِ شہوار نہیں ہے مولف کے الفاظ میں خود تاریخی ہیروئن اپنا تعارف یوں کراتی ہے:-

"بڑوں کا ادب کرتی ہوں، چھوٹوں کا لحاظ رکھتی ہوں، دوسروں کے سکھ سے مجھے سکھ ملتا ہے اور دوسروں کے دکھ میں دکھ۔ ہاں مگر گانا سنتی ہوں، تصویریں اتارتی ہوں، دن دیئے کھلی ہوا چمکتی دھوپ میں سیر و شکار کر جاتی ہوں۔ (یہ اضافہ بھی کر لیا جائے کہ شطرنج اور چوسر کھیلتی ہوں)۔ یوں راگ رنگ اور روشنی سے لگاؤ ہے اور یہ برائی ہے تو اسے اللہ بخش دے۔"

"ہاں مگر" کہنے سے پہلے چاند بی بی اسلامی تہذیب کی بیٹی نظر آتی ہے مگر اس "مگر" کے بعد وہ اپنی زندگی کے غیر اسلامی عناصر کی طرف فخریہ انداز میں توجہ دلاتی ہے۔

پس چاند بی بی کی شخصیت کو جو تاریخی اہمیت حاصل ہے اسے بہ حیثیت مورخ سامنے لانا اور اس سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ تحقیق کرنا تو یقیناً علمی خدمت ہوگی مگر اسے مسلم معاشرہ کی اصلاح کے لیے نمونہ کے طور پر پیش کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

ایک ضروری تصحیح

جناب مولانا مسعود عالم صاحب ندوی نے مولانا عبدالماجد صاحب کے ترجمۂ قرآن پر جو تبصرہ ترجمان القرآن کے پچھلے نمبر میں لکھا تھا اس میں ان سے ایک اہم فروگذاشت ہوگئی ہے۔ اب انھوں نے اپنے گرامی نامہ کے ذریعہ اس پر خود ہی گرفت کی چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:-

"صحیح صورت یہ ہے کہ عربی الفاظ کو انگریزی رسم الخط میں املا کرتے ہوئے "ض" کی جگہ "Ḍ" (نقطہ کے ساتھ) اور اسی طرح "غ" کی جگہ "ǵ" کو استعمال کرنا چاہیے۔ نیز "ش" کے لیے "Ṣ" کی شکل کا اختیار کرنا صحیح ہے۔ جس طرح "خ" کے لیے "Ḫ" کی شکل تجویز کی گئی ہے۔

سرورق رہبر پریس لاہور میں چھپا